قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2026 قیمت 25₹

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

بین الاقوامی

یوم یوگ

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اُردو دُنیا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ:6، جون 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : نہاں

معاون مدیر : ڈاکٹر فیضان الحق

معاونین : ڈاکٹر وسیم اقبال، محمد اکرام، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع : سالاسار امیجنگ سسٹمس

B-19، سیکٹر 88، نوئیڈا۔ 201305 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: اختر حسین

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے، سالانہ -/240 روپے

صفحات: Total Pages:100

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون: 011-35151992 | شعبۂ ادارت: 011-35152009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

ای۔میل

editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746،

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات — مدیر — 4

خطوط

- آپ کی بات — قارئین — 5

زبان و تعلیم

- اس سمندر میں بہت لعل و گہر — غضنفر — 7
- این ای پی 2020: تعلیم اور خواتین کی بااختیاری — سید مبین زہرا — 12

- ڈیجیٹل عہد میں اردو زبان و ادب کی تشکیل — ندیم احمد — 15

علم بلاغت

- استعارہ: طرفین اور وجہ جامع — حکیم نجم الغنی خاں نجمی — 19

ادب: زاویے اور جہات

- معاصر شاعرات کی تخلیقات میں نسائی حسیت — شبنم حمید — 26

- غالب بحیثیت رباعی گو — ساجد ذکی فہمی — 29

بین الاقوامی یوم یوگ

- یوگا: تاریخی، تہذیبی اور فکری منظرنامہ — محمد معین الدین — 33

- شیخ محمد غوث گوالیاری کا تصور یوگ — محمد منہاج الدین — 37
- ہندستان اور مغرب کا تصور یوگ — راکیش کمار — 40
- جسمانی صحت اور فلسفۂ یوگ — اسعد اللہ — 43
- یوگا: موجودہ عہد کی ایک ضرورت — محمد طلحہ — 46
- یوگا کی عصری معنویت — عبدالحافظ فاروقی علیگ — 49

تہذیب و ثقافت

- ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور اردو ادب — محمد علی جوہر — 51
- 'ہُو' قبیلے کا لسانی اور تہذیبی جائزہ — محمد طیب — 54

اقتصادیات

- اکنامکس: تعارف برائے عوام — سید اطہر رضا بلگرامی — 57

طبیات

- ہمدردانہ حیوانی تحقیق — حکیم فخر عالم — 60

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ — 66

جہان آگہی

- خبرنامہ — ادارہ — 74

ہماری بات

انسانی زندگی کی بنیاد جسمانی صحت، ذہنی سکون اور روحانی توازن پر قائم ہے۔ جب یہ تینوں عناصر ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رہتے ہیں تو انسان کی زندگی پرسکون، متوازن اور بامقصد بن جاتی ہے۔ موجودہ عہد میں مادی ترقی اور تیز رفتار طرز زندگی نے انسان کو بظاہر آسائشیں تو عطا کی ہیں لیکن اس کے باطن سے سکون چھین لیا ہے۔ آج کا انسان ذہنی دباؤ، بے خوابی، اضطراب، مایوسی اور مختلف جسمانی بیماریوں میں گھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی پس منظر میں یوگا کی اہمیت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے۔ یوگا محض جسمانی ورزش کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل فلسفۂ حیات اور باطنی تربیت کا نظام ہے جس کا مقصد انسان کے جسم، ذہن اور روح کے درمیان توازن قائم کرنا ہے۔ یوگا کی تاریخ ہزاروں برس پرانی ہے اور اس کے آثار قدیم ہندوستان کی ویدک تہذیب میں ملتے ہیں۔ رگ وید، اپنشد اور بھگوت گیتا جیسی قدیم کتابوں میں مراقبے، ضبط نفس اور روحانی ریاضت کے جو تصورات ملتے ہیں، وہ بعد میں یوگا کی باقاعدہ شکل اختیار کر گئے۔ ہندوستان کے قدیم رشی منیوں نے فطرت کے قریب رہ کر انسانی باطن کو سمجھنے کی کوشش کی اور اسی جستجو نے یوگا کو جنم دیا۔ مہارشی پتنجلی کو یوگا کے منظم فلسفے کا بانی سمجھا جاتا ہے جنھوں نے اپنی مشہور تصنیف 'یوگ سوتر' میں یوگا کے اصول وضوابط کو مرتب کیا۔ انھوں نے آٹھ بنیادی اصولوں یم، نیم، آسن، پرانایام، پرتیہار، دھرنا، دھیان اور سمادھی کے ذریعے انسان کو روحانی ارتقا اور ذہنی سکون کی راہ دکھائی۔ یوگا کو آج پوری دنیا میں صحت مند زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

بین الاقوامی یوم یوگا ہر سال 21 جون کو منایا جاتا ہے۔ اس دن کے انعقاد کا بنیادی مقصد پوری دنیا میں صحت مند اور متوازن زندگی کے شعور کو فروغ دینا ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 2014 میں 21 جون کو عالمی یوم یوگا کے طور پر تسلیم کیا، جس کے بعد یہ دن عالمی سطح پر ایک اہم ثقافتی اور صحت بخش تحریک بن کر ابھرا۔ 21 جون کا انتخاب بھی علامتی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ سال کا طویل ترین دن ہوتا ہے اور قدیم روایتوں میں اسے روحانی توانائی اور توازن سے جوڑا جاتا رہا ہے۔ آج دنیا کے تقریباً ہر خطے میں یوگا کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ پارکوں، میدانوں، تعلیمی اداروں اور عوامی مقامات پر اجتماعی یوگا کی مشقیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ روایت اب کسی خاص خطے یا قوم تک محدود نہیں رہی۔ جدید طبی تحقیق نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ یوگا دل کی بیماریوں، شوگر، موٹاپے، ہائی بلڈ پریشر، بے خوابی اور ذہنی دباؤ جیسے مسائل کے علاج اور روک تھام میں مفید ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق یوگا انسان کے اعصابی نظام کو پرسکون بناتا ہے اور اس کے اندر مثبت سوچ پیدا کرتا ہے۔

یوگا ایک ایسی مثبت قوت ہے جو انسان کو اس کے وجود سے جوڑتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ انسان کی صرف جسمانی تربیت نہیں کرتا بلکہ اس کے ذہن اور روح کو بھی مضبوط بناتا ہے۔ روزمرہ زندگی کی مصروفیات میں انسان مسلسل تھکن اور ذہنی دباؤ کا شکار رہتا ہے، ایسے میں چند لمحوں کی یوگا مشق اسے اندرونی سکون اور تازگی فراہم کر سکتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بھی اب یوگا کے حوالے سے شعور میں اضافہ ہو رہا ہے، تاہم اب بھی اس کی افادیت کو عام کرنے کی ضرورت ہے، خصوصاً نوجوان نسل کو اس جانب متوجہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ وہ غیر متوازن طرز زندگی، ذہنی دباؤ اور غیر صحت مند عادات سے بچ سکیں۔ تعلیمی اداروں، سماجی تنظیموں اور طبی مراکز کو چاہیے کہ وہ یوگا کے بارے میں بیداری پیدا کریں اور اسے صحت مند معاشرتی سرگرمی کے طور پر فروغ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یوگا کسی خاص مذہب، طبقے یا عمر کے افراد تک محدود نہیں بلکہ یہ پوری انسانیت کے لیے مفید ہے۔ اگر انسان روزانہ اپنی زندگی کا کچھ وقت یوگا، مراقبے اور ذہنی سکون کے لیے مختص کرے تو اس کے مثبت اثرات نہ صرف اس کی جسمانی صحت بلکہ اس کی فکری، ذہنی اور روحانی زندگی میں بھی نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہی پیغام بین الاقوامی یوم یوگا کا اصل مقصد بھی ہے کہ انسان صحت مند جسم، پرسکون ذہن اور متوازن روح کے ساتھ ایک بہتر اور پرامن دنیا کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرے۔

شمس اقبال

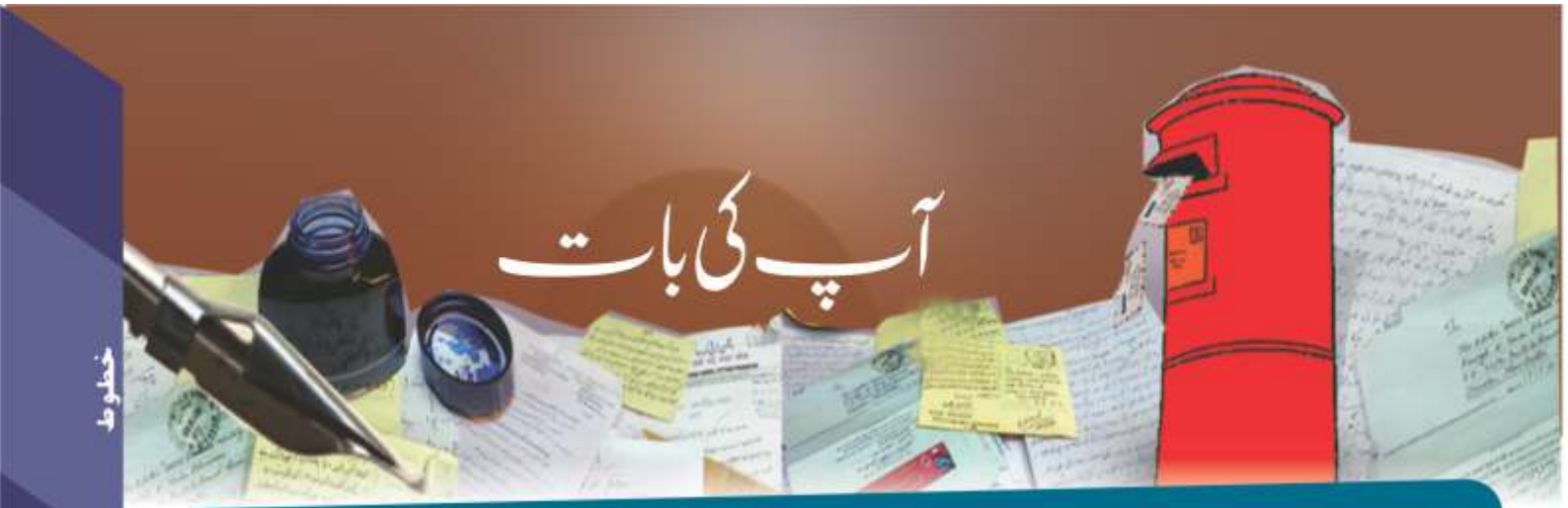

آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلم کاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی و علمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ 'اردو دنیا' مئی 2026 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح عام لیک سے ہٹ کر ہے، اس کے ذریعے مدیر محترم نے حکومت ہند کی قومی تعلیمی پالیسی 2020 کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ NEP کے نفاذ کا اصل مقصد نئی صدی کے نئے تقاضوں کے تحت نظام تعلیم میں ہمہ جہت بہتری لانا ہے۔ مدیر محترم کے مطابق یہ پالیسی ایک جامع، دور اندیش اور انقلابی اقدام کے طور پر متعارف ہوئی ہے اور یہ متعلمین کی نفسیاتی، ذہنی اور علمی نشوونما میں حد درجہ معاون ثابت ہوگی۔ اس ادارتی تحریر کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے ذریعے ڈیجیٹل تعلیم کے فروغ کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ وہ اس لیے کہ آج کے سائبر ایج میں آن لائن تعلیم، ڈیجیٹل وسائل اور جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کے بغیر کسی بھی شعبے میں آگے بڑھنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نئی قومی تعلیمی پالیسی نے نئے عہد کے تقاضوں کے تحت ڈیجیٹل درس و تدریس کو لازمی قرار دیا ہے۔ اس لیے اداریے میں NEP کے اہم نکات کو مفید، بامعنی اور کارآمد بتایا گیا ہے۔

اس شمارے میں وزیر تعلیم، حکومت ہند کا ایک مضمون 'اسکول کا پہلا دن: ایک مشترکہ ذمہ داری کا آغاز' بھی شامل ہے، جس میں وزیر موصوف نے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی رو سے اسکولی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہ تحریر نہ صرف یہ کہ موجودہ عہد میں روشنی کی ایک کرن ہے بلکہ نئی نسل کے مستقبل کو تابناک اور محفوظ بنانے کی ایک اپیل بھی ہے، تاکہ ہماری تعلیم گاہوں سے جڑے تمام ذمہ داران اس سمت میں عمل پیرا ہوں اور ہمارے بچوں کو اس نئے تعلیمی وژن اور مشن سے جوڑنے کا فریضہ انجام دیں۔

کالم 'ڈیجیٹل انڈیا اور اردو' کے تحت مکرم نیاز اور ذاکر احمد ذاکر کے مضامین جدید اطلاعاتی اور معلوماتی ٹیکنالوجی کی اہمیت اور ترقی و ترویج پر مبنی ہیں۔ ایسے مضامین کی شمولیت ہر شمارے میں ہو تو بہت اچھا ہے۔ انڈین نالج سسٹم پر آجکل بہت سے پلیٹ فارم پر سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض کیا جا رہا ہے تاکہ ہم اپنے قدیم معلوماتی ذخائر کی بازیافت کر کے نئے عہد میں ان سے استفادہ کر سکیں۔ اس ضمن میں پروفیسر عتیق اللہ اور شری بلوندر صاحبان کی تحریریں شامل ہیں۔

ادب زاویے اور جہات اور تنقید و تجزیہ کے تحت بھی مختلف اصناف سخن کے متعلق نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مشاہیر ادبا و شعرا کی شعری و نثری خدمات سے بھی واقف کرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یاس یگانہ چنگیزی، مولانا خیر رحمانی، شفیع الدین نیر، اسد رضا، راج کپور اور کرناٹک میں معاصر اردو ادب کے عناوین سے بھی عمدہ اور معیاری مضامین شامل اشاعت ہیں۔ ساتھ میں کتابوں پر تبصرے اور اردو دنیا کی خبریں بھی بہت ہی اہم اور معلوماتی ہیں۔ مختصر یہ گذشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی اپنی علاحدہ اور منفرد شناخت برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔ میں اس کے لیے پوری ادارتی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نسیم احمد نسیم، کالی باغ بتیا، مغربی چمپارن، بہار

ماہنامہ 'اردو دنیا' مئی 2026 کا شمارہ موصول ہوا۔ مشمولات کے تنوع کے ساتھ سرورق نے کافی متاثر کیا، جس میں مہینے کی فضا کو تصویر کے کینوس پر بہتر انداز میں منعکس کیا گیا ہے۔ اداریہ نئی تعلیمی پالیسی اور اس کی خصوصیات سے متعلق ہے جس میں اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، ساتھ ہی مثبت اثرات اور دوررس نتائج کو بھی ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔

رسالے کا پہلا مضمون 'اسکول کا پہلا دن ایک مشترکہ ذمہ داری کا آغاز' وزیر تعلیم حکومت ہند کا مضمون ہے جو انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے، اس میں بچوں کی تعلیم تربیت اور اخلاق پر زور دینے کے ساتھ اساتذہ کے کردار پر بھی موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'اردو انفارمیٹکس میں اطلاعاتی و معلوماتی ٹیکنالوجی کی اصطلاح' عمدہ مضمون ہے جس میں جدید ٹیکنالوجی کے پیش نظر اردو کے امکانات اور چیلنجز کو بہت ہی متوازن انداز میں واضح کیا گیا ہے اور ان اصطلاحات پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے جن کے متبادلات میں ہنوز خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی ہے، جس کی طرف مضمون میں خصوصی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

'سنسکرت شعریات' نہایت ہی معلوماتی مضمون ہے اس میں ان عناصر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، جو سنسکرت شعریات کی اساس ہیں اور ان لوازم کو احاطہ تحریر میں لیا گیا ہے جن سے سنسکرت شعریات کی تشکیل ہوتی ہے۔ سنسکرت شعریات میں 'رس' کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں اس کے ابعاد پر خصوصی توجہ صرف کی گئی ہے 'رامائن کی معنویت عصر حاضر میں' میں اس اعتبار سے بھی اچھا مضمون ہے کہ اس میں رامائن کے متن پر توجہ مرکوز کرنے کے ساتھ اس کے مثبت پیغام کو بہت ہی موثر انداز میں نمایاں کیا گیا ہے جس سے موجودہ دور کے تناظر میں انسانی زندگی کو بہترین رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔ 'نند لعل گویا کی فارسی شاعری' عمدہ مضمون ہے جس میں نند لعل گویا کی شخصیت اور شاعری کے اختصاصی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون کا خاص وصف کلاسیکیت اور اس کی جہات ہے۔ 'نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی تنقیدی بصیرت' شیفتہ کی تنقیدی جہات کو واضح کرنے کے ساتھ جدید دور میں اس کی کیا معنویت ہے۔ اس کو بھی واضح کرتا ہے مضمون میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید تنقیدی ٹولز اور رویوں میں بھی کہیں نہ کہیں شیفتہ کے انداز اور اس کے اثرات کو محسوس کیا جا سکتا ہے مجموعی طور پر عمدہ اور معلوماتی مضمون ہے۔

ان کے علاوہ 'جگر کی کلاسیکیت'، 'یاس یگانہ چنگیزی کی ادبی معرکہ آرائیاں'، 'راج کپور: بالی ووڈ کا ستارہ'، 'کرناٹک میں معاصر اردو ادب ایک جائزہ' اور 'سلطان اختر: کلاسیکی روایت کا جدت پسند شاعر' وغیرہ بھی اچھے مضامین ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اردو دنیا کا شمارہ مئی 2026 اپنے سابقہ شماروں کی طرح جاذب نظر ہونے کے ساتھ مشتملات کے اعتبار سے متنوع بھی ہے، جن سے بلاشبہ اردو کی علمی اور ادبی دنیا مستفید ہوگی۔ اس اہم شمارے کے لیے مدیر مکرم اور ان کی ادارتی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ اس معیار کو آئندہ بھی برقرار رکھا جائے گا تاکہ ہم تشنگان زبان و ادب اس سے محظوظ اور مستفید ہوتے رہیں۔

ڈاکٹر ایے ذاکر، گولہ گنج لکھنؤ

ماہنامہ 'اردو دنیا' اپریل 2026 کا شمارہ نظر سے گزرا۔ اس شمارے میں شامل نظام احمد کا مضمون 'میر تقی میر کی غزل گوئی' بہت معلوماتی مضمون ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ غزل کی کائنات میں میر کی حیثیت آفتاب کی سی ہے، ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی ہے۔ میر اردو غزل کی تہذیبی روایت کا نام

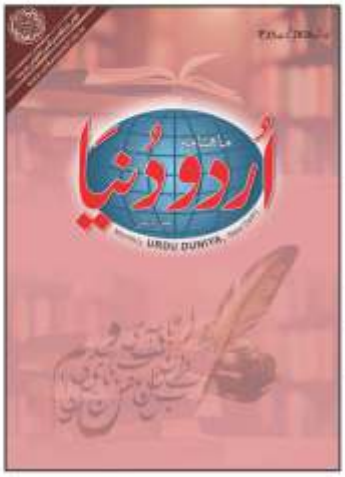

ہے۔ اپنے عہد کے اجڑتے ہوئے سماج اور بکھرتی ہوئی اقدار کی داستان میر نے لکھی۔ ان کی شاعری کا ایک پہلو ان کی زبان کی وہ لچک ہے جو اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ نعیمہ جعفری پاشا کا مضمون 'نظیر اکبرآبادی کی شاعری...' بھی عمدہ مضمون ہے۔ اس میں نظیر کی متصوفانہ شاعری میں قلندرانہ شان و شوکت کا بہت ہی پرشکوہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی کا مضمون 'رضا نقوی: اب جا رہا ہوں...' عمدہ مضمون ہے، اس میں مضمون نگار نے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی گراوٹ کو باریکی سے دکھایا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پرلطف سنجیدگی سے ادبی موضوعات کو بھی سخن کا حصہ بنایا۔ ان کے طنزیہ اشعار میں زبان کی سادگی قابل توجہ ہے۔ اسی طرح سے 'ساحر لدھیانوی کی غزل گوئی' (قسیم اختر)، 'کبیر اجمل کا شعری اظہار (فہمینہ علی)'، بھی عمدہ مضامین ہیں۔ مشتاق احمد کا مضمون 'جمال اویسی پاسدار شعر و سخن' میں مضمون نگار نے جمال اویسی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے اہم گفتگو کی ہے۔

فیضان الحق کا مضمون 'جیلانی بانو: بحیثیت افسانہ نگار' اپنے موضوع پر بہت اہم اور انفرادی نوعیت کا مضمون ہے، انھوں نے اپنے مضمون میں جیلانی بانو کی شخصیت اور فکشن کے تعلق سے پرمغز گفتگو کی ہے۔ واقعی جیلانی بانو فکشن کا ایک معتبر اور اہم نام تھیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا وہ متوسط طبقے کی گھریلو زندگی، خواتین کے مسائل اور اقتصادی معاشرتی تبدیلیوں میں پیدا شدہ حالات سے متعلق تھے۔ انھوں نے حیدرآبادی تہذیب کو اپنی تخلیقات میں خاص طور پر برتا ہے۔ جیلانی بانو نے نئے مسائل کے اظہار کے لیے افسانوں میں علامت کو بھی جگہ دی ہے، ان کی تخلیقی زبان افسانے کو دلچسپ بناتی ہے۔ عارف این کا مضمون 'گوپی چند نارنگ...' ان کی شخصیت، ادبی خدمات کے حوالے سے معلوماتی مضمون ہے۔ نارنگ صاحب نے اردو زبان و ادب کی خدمات میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس سے انکار ممکن نہیں۔ انھوں نے اردو تنقید کو ایسی علمی اور فلسفیانہ بنیادیں فراہم کیں جو عالمی پس منظر میں بھی اہم ہے۔ فکشن کی تنقید میں بھی نارنگ کا کام بنیادی اور اہم ہے۔ انھوں نے مغرب کے نظریات کو اردو کی مشرقی اور کلاسیکی شعریات کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ ان کے علاوہ 'توفیق احمد چشتی کی علم دوستی' (سید مسعود حسن)، 'قاسم خورشید حیات اور ادبی کارنامے' (توقیر عالم)، 'شریف احمد قریشی کی فرہنگ نویسی' (شہپر شریف) بھی اپنے اپنے موضوعات پر اہم مضامین ہیں۔ ان کے مطالعے سے قارئین کے علم و آگہی میں ضرور اضافہ ہوگا۔

ایم راگھو راؤ، ساؤتھ سیول لائن، چھندوارا، مدھیہ پردیش

غضنفر

اس سمندر میں بہت لعل و گہر

جو لوگ زبانوں کو قریب سے دیکھتے ہیں اور ان کی ساخت اور ماہیت کو سمجھتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ زبانیں وسیع القلب اور کشادہ ذہن ہوتی ہیں۔ ان میں اتنی فراخ دلی ہوتی ہے کہ وہ اجنبی زبانوں کو بھی اپنے پہلو میں بٹھا لیتی ہیں۔ انھیں اپنا بنا لیتی ہیں۔ انھیں کسی اور زبان کے پاس جانے یا اسے اپنے پاس بلانے میں ذرا بھی ہچک نہیں ہوتی۔ وہ بے جھجک دوسری زبانوں کے لفظوں کو سینے سے لگا لیتی ہیں۔

زبانیں دوسری زبانوں سے صرف لفظ ہی نہیں لیتیں، لمس بھی حاصل کرتی ہیں۔ رس اور جس بھی کشید کرتی ہیں، نفس اور لَس بھی پاتی ہیں اور اس لمس، رس، جس، نفس اور لَس میں صوتیاتی آہنگ، صرفیاتی نیرنگ، معنیاتی ترنگ، نحویاتی ڈھنگ، اسلوبیاتی رنگ، ادبیاتی امنگ اور عمرانیاتی منظر شوخ و شنگ بھی ہوتا ہے۔ یعنی زبانیں جب ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو وہ آپس میں مصافحہ اور معانقہ تو کرتی ہی ہیں، رگِ گلو کا بوسہ بھی لیتی ہیں اور اس اتصالی عمل سے ان میں ایک دوسرے کی لسانی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی قدریں در آتی ہیں۔ ایک دوسرے کے حرف و صوت میں لفظ و معنی کی تصویریں ابھر آتی ہیں۔ اردو زبان میں دوسری زبانوں کے لسانی فیوض، ادبی عکوس، تہذیبی نقوش، معاشرتی خطوط اور اقداری اسرار و رموز کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اردو کی تحریر و تقریر میں یہ لسانی رنگا رنگی مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے۔ نام سے لے کر اس کے کام تک میں یہ بوقلمونی جھلکتی ہے

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ساری دنیا میں دھوم مچانے والی ہماری زبان کو شناخت زبانِ ترکی سے ملی۔ ترکی اگر اس کا نام اردو نہیں رکھتی تو یہ اب بھی ہندی، ہندوی، ہندوستانی، دکنی، ریختہ وغیرہ کے چکر میں پڑی رہتی۔

ترکی نے صرف ہماری زبان کا نام ہی نہیں رکھا بلکہ ہمارے بعض رشتوں کے نام بھی رکھے اور ان رشتوں کو وقار اور بلند مقام بھی بخشا۔ ترکی اگر یہ لسانی شجر کاری نہیں کرتی تو ہمارے گرو: اتالق، رسوئیے، باورچی، دوت، ایلچی، قبیلوں خاندانوں اور گھرانوں کے چودھری، خانِ خاناں اور بیگ نہیں کہلاتے۔ استری: خاتون اور دائی: انا میں تبدیل نہیں ہوتی۔ ہماری بہنیں "آپا" اور "باجی" نہیں بنتیں۔ ہماری بیویاں: "بیگم" کا درجہ نہیں پاتیں اور کوئی شاعر اپنی بیوی کو اس انداز سے مخاطب نہیں کرتا۔

چڑھ گیا آپ کا کس بات پہ پارہ بیگم
اماں، کچھ جُرم بتاؤ نا ہمارا بیگم

اتنا ہی نہیں بلکہ ہمارے دسترخوانوں پر ہاتھ دھونے کے برتن بھانڈے اور تسلے کی جگہ چلمچی نہیں ہوتی۔ چھری، چاقو کا روپ نہیں لیتی، پلنگوں پر گدڑی کی جگہ توشک نہیں بچھتی۔ دروازوں پر ٹاٹ کی جگہ چق نہیں ٹنگتی۔ اسلحہ خانوں سے توپ نہیں چھوٹتی۔ ہماری تاریک سرنگوں میں چقماق نہیں جلتی۔ لباسوں میں اچکن چوغہ نہیں بنتی۔ ہماری محفلوں اور بحثوں میں ٹنٹا کی جگہ چپقلش نہیں لیتی۔

ہمارے رشتوں کو خوش گوار، پر وقار، بااعتبار، محترم، معزز، مؤدب اور مقرب بنانے میں عربی اور فارسی نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ عربی نے باپ کو والد، ماں کو والدہ، جورو کو زوجہ بنا دیا اور فارسی نے سسر کو خسر، ساس کو خوش دامن، میاں کو خاوند، بہن کو ہمشیرہ، ساڑھو کو ہم زلف، بیٹی کو دختر، بیٹے کو پسر، فرزند، لختِ جگر اور نورِ نظر جیسے خوش آہنگ ناموں سے سجا کر مسندِ قدر و منزلت پر بٹھا دیا۔

ترکی، عربی اور فارسی ان تینوں زبانوں نے ہمارے طرز معاشرت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ چٹائی پر تھالیوں میں بھات، ڈلیوں میں روٹی، ہانڈیوں میں ماس مچھی، ڈونگوں میں بھرتا، بھاجی، کٹوروں میں کھیر اور کھیس، کھانے والوں کو چٹائی سے اٹھا کر دسترخوان پر بٹھا دیا اور ان کے سامنے قابوں میں قورمہ، قیمہ، قلیہ

کوفتہ، طباقوں میں کباب، مرغ مسلم، قلیجن، مزعفر، زردہ، پیالوں میں یخنی، حلیم، شیر، کشتیوں میں بریانی، طشتریوں میں پلاو، خشکہ، قبولی اور رکابیوں میں فرنی، شیرینی، چنگیریوں میں نان، شیر مال، باقر خوانی طرح طرح کا طعام سجادیا۔

ایک طرف انواع واقسام کی مرغن اور مکلّف غذاؤں اور نعمتوں سے دسترخوان کو مزین کردیا تو دوسری جانب ہماری طرزِ رہائش کی راہوں کو رنگا رنگ پھولوں سے مہکادیا۔

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سُنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد اسے سولی پر چڑھانا
چمن سے بھرا باغ، گل سے چمن
کہیں نرگس و گل، کہیں یاسمین
کہیں جعفری اور گیندا کہیں
سماں شب کا داؤدیوں کا کہیں
کھڑے شاخِ شبّو کے ہر جا نشان
مدن بان کی اور ہی آن بان
بگھیاں نور کی تیار کرے بوئے سمن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن
نسترن بھی نئی صورت کا دکھاوے گا رنگ
کوچ پر ناز کے جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن
اہلِ نظارہ کی آنکھوں میں نظر آئے گا
باغ میں نرگس و شہلا کی ہوائی چتون

''بے نظیر چمن زار پر بہار میں بوقلموں اشجار، سرسبز برگ و بار شاخِ ثمر دار اور گلہائے زرنگار کو دیکھتا، صد رنگ گلاب، گلِ آفتاب، گلِ اشرفی، گلِ عباسی، گلِ جعفری، گلِ داؤدی، گلِ رعنا، گلِ لالہ، گلِ ہزارہ، گلِ سوسن، گلِ نسریں، گلِ نسترن، گلِ یاسمیں، گلِ مشکی، گلِ خطمی، گلِ شبّو، گلِ شب افروز، گلِ صد برگ اور گلِ اورنگ سے گل رنگ ہوتا خوشبوؤں میں بستا، گلبانگِ طیورِ خوش گلو، خوش نوائی عندلیب وقمری کی کو کو اور نغمہ سنجی طوطی سے مدہوش ہوتا ہوا نواحِ کوثر و تسنیم میں پہنچ گیا۔''

ان ادبی پیکروں میں جو یہ گلہائے رنگا رنگ نظر آتے ہیں، جن کے رنگ ونور سے ہمارے دیدوں میں بوقلموں قمقمے جلتے ہیں، جن کے لمس سے ہمارے چہرے کے خدو خال کھلتے ہیں، اور جن کی خوشبوؤں سے انفاس میں عطر وعنبر گھلتے ہیں، گلستان ادب ایران سے لائے گئے ہیں۔

گلشن اردو میں چمنستانِ ادبِ ایران سے گلہائے رنگا رنگ ہی نہیں آئے ہیں بلکہ ان شعری اشجار کی شاخوں پر جو طیورِ خوش رنگ۔

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں
کبک وقمری میں جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے
کس لیے ہر شب یہ ہوتا ہے گرفتارِ فراق
ہجر میں کیا اپنا مرغِ نامہ بر سرخاب تھا
زندگی مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اڑ گیا

بیٹھے جو مرغِ خوش نوا، طائرِ رنگِ دل کشا اور پرندۂ بے بہا چہچہا رہے ہیں اور نغمہ سنجی کے ساتھ ساتھ بلند پروازی کے قصّے بھی سنا رہے ہیں اور ان قصوں میں انسانی

> ہمارے رشتوں کو خوش گوار، پروقار، بااعتبار، محترم، معزز، مؤدب اور مقرب بنانے میں عربی اور فارسی نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ عربی نے باپ کو والد، ماں کو والدہ، جورو کو زوجہ بنا دیا اور فارسی نے سسر کو خسر، ساس کو خوش دامن، میاں کو خاوند، بہن کو ہمشیرہ، ساڑھو کو ہم زلف، بیٹی کو دختر، بیٹے کو پسر، فرزند، لختِ جگر اور نورِ نظر جیسے خوش آہنگ ناموں سے سجا کر مسندِ قدر و منزلت پر بٹھا دیا۔

مشابہتوں کی علامتیں دکھا رہے ہیں، دراصل یہ بھی انھیں چمن زاروں سے اڑ کر وادیِ اردو میں اترے ہیں جو عرب وفارس کی گل رنگ فضاؤں میں نغمہ سرائی کرتے رہے ہیں۔

اور شاخوں پر بیٹھے ہوئے ان پرندوں کے اوپر خلاؤں میں جو یہ طیورِ شاہی ہما، عنقا اور قفقس پرواز بھر رہے ہیں اور ان کی اڑانوں کے یہ مختلف انداز۔

جستجو رہتی ہے دولت کا پتا ملتا نہیں
سر پھرا کرتا ہے پر ظلِ ہما ملتا نہیں
دردِ دل پوچھے والا کوئی میرا نہ رہا
ہوگئی صورتِ عنقا میرے غم خوار کی شکل
گر تو کرے نہ صید تو قفقس کی طرح سے
جل کر ہوا اپنی آگ میں خود ہی شکار خاک
نہ ہو قفقس کا اس خطر سے آب
شب نہ ہووے ہر اس سے سرخاب

ہمیں بھی مائل بہ پرواز کر رہے ہیں، خلائے عرب وفارس سے اتر کر ارضِ اردو پر تشریف لائے ہیں، آپ انھیں غور سے دیکھیے اور توجہ سے سماعت فرمائیے تو یہ مافوق الفطری اور ماورائی پرندے صرف اپنی پرواز کی کرامات ہی نہیں دکھا رہے ہیں بلکہ اپنی ذات سے جڑے تصورات کی محاکات بھی پیش کر رہے ہیں۔

'ہما' کا فرمانا ہے کہ دنیا مجھے پرندوں کا بادشاہ مانتی ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ میں جس کے سر کے اوپر سے گزر جاتا ہوں، وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

'عنقا' اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھ میں تیس پرندوں کا رنگ پایا جاتا ہے۔ میری گردن کے پر سنہرے ہیں اور جسم کا رنگ ارغوانی ہے۔ میری دم سفید اور سرخ ہے اور آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک ہے۔ جب میں بوڑھا ہو جاتا ہوں تو لکڑیوں اور خوشبودار چیزوں سے اپنا مرقد بناتا ہوں اور اس میں گھس کر مر جاتا ہوں۔ میری ہڈیوں اور چربی سے ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے اور یہی کیڑا آگے چل کر میرا ہم ذات بن جاتا ہے یعنی میں مر کر پھر جی اٹھتا ہوں۔

'قفقس' اپنا قصہ یوں سناتا ہے کہ میں ایک نہایت خوش رنگ اور خوش آواز پرندہ ہوں۔ میری منقار میں تین سو ساٹھ سوراخ ہیں اور ہر ایک سوراخ میں سے ایک ایک راگ نکلتا ہے۔ جب مجھے بھوک لگتی ہے تو کسی بلند پہاڑ پر ہوا کے رخ ہو بیٹھتا ہوں۔ میرے خوش کن سروں کی آواز پر بہت سے پرندے میرے

پاس اکٹھا ہوجاتے ہیں اور میں ان میں سے دو چار کو پکڑ کر چٹ کر جاتا ہوں۔ میری عمر ہزار سال کی ہوتی ہے۔ جب پورے ہزار برس گزر جاتے ہیں اور میری عمر طبعی اخیر کو پہنچ جاتی ہے تو میں بہت سی سوکھی لکڑیاں جمع کرتا ہوں اور ان پر بیٹھ کر مستی کے عالم میں گانا اور اپنے پروں کو پھڑ پھڑانا شروع کرتا ہوں۔ جس وقت دیپک راگ میری چونچ سے نکلتا ہے تو ان لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور میں جل کر راکھ ہوجاتا ہوں۔ خدا کی قدرت سے اس راکھ پر مینہ برستا ہے اور اس راکھ سے میں پھر پیدا ہوجاتا ہوں۔

یہ پرندے یعنی ہما، عنقا اور ققنس جب فضائے ادب میں اپنے پر پھیلاتے ہیں تو کہانیاں سمٹ آتی ہیں۔ ان کے ارد گرد داستانوں کی پریاں اُڑنے لگتی ہیں، محیر العقول کردار رقص کرنے لگتے ہیں، بیش بہا افکار و خیالات اڑان بھرنے لگتے ہیں، ان کے سوراخوں سے نکلے ہوئے سُر حیات و کائنات کے سُر بن جاتے ہیں۔ یہ طائر کبھی تشبیہیں بن جاتے ہیں، کبھی استعارے ہوجاتے ہیں، کبھی مجاز مرسل تو کبھی علامتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اپنی تبدیل شدہ صورتوں سے ایسے ایسے پیکر، ایسے ایسے منظر اور ایسے ایسے مرقعے بنا دیتے ہیں کہ جن سے باصرہ میں رنگ، سامعہ میں آہنگ اور لامسہ میں جوشِ ترنگ بھر جاتا ہے، شامہ مہک اٹھتا ہے اور ذائقہ چٹخارے لینے لگتا ہے۔

شاخوں پر صرف پھول اور طیور ہی نہیں بلکہ شعری کیاریوں کے کنارے ترکیبوں کی جو باڑ دکھائی دے رہی ہے اور شعری و نثری شاخوں پر مرکبات کے جو شگفتہ گل بوٹے نظر آرہے ہیں، ان کی چمن بندی بھی زبان فارسی سے ہی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ چمن بندی اور چمن آرائی کے طور طریقوں پر روشنی ڈالی جائے آپ ترکیبوں کے کمال اور مرکبات کے جمال و جلال سے پوری طرح لطف اندوز ہو لیجیے۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رخِ بے حجاب نے

دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے
مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

شاخوں پر صرف پھول اور طیور ہی نہیں بلکہ شعری کیاریوں کے کنارے ترکیبوں کی جو باڑ دکھائی دے رہی ہے اور شعری و نثری شاخوں پر مرکبات کے جو شگفتہ گل بوٹے نظر آرہے ہیں، ان کی چمن بندی بھی زبان فارسی سے ہی ہوئی ہے۔

''ان یارانِ صادق و دوستانِ موافق بارانِ بادہ نوش و بذلہ سنجانِ عشرت کوش میں دن بھر تو وہ چہل پہل، قہقہے اور چہچہے رہے۔ سرِ شام سے ناچ رنگ کی دھما چوکڑی مچی، خانہ و باغ میں جس کے در و دیوار سے صحرائیت برستی تھی، شامیانۂ عیش کا شانہ بہ صد حشمتِ شاہانہ نصیب ہوا۔ ایک بتِ پندار، شوخ و ستم گار نے یہ غزل عجب لطف و اندازِ برنائی اور شانِ خود آرائی سے ادا کی'': فسانۂ آزاد

مرزا غالب، علامہ اقبال، دیا شنکر نسیم، میر انیس اور رتن ناتھ سرشار نے زبان و بیان میں جو ترکیبیں استعمال کی ہیں ان سے صرف صوتی آہنگ ہی نہیں پھوٹتا ہے بلکہ زبان کا طلسم بھی جاگتا ہے۔ وہ طلسم جو گنجینۂ معانی کا در کھولتا ہے۔ مضامینِ نو پیدا کرتا ہے، خیال و افکار کے جوہر مرمت کرتا ہے، معنی آفرینی کا نیرنگ دکھاتا ہے۔ ایک ایک مرکب میں مرکباتِ عجائباتِ زمانہ سمیٹ دیتا ہے۔

اردو کے ان شعری اور نثری مرقعوں میں جو یہ مختلف طرح کی ترکیبیں مثلاً:

بے اختیارِ شوق، خونِ دل، سازِ چمن، حسرتِ دیدار، دودِ چراغ، دامنِ دشت، شامِ گردوں، اخترِ سیماب، مسافتِ شب، ریگِ رواں، بارانِ صادق، دوستانِ موافق، بتِ پندار، کشتیِ مسکین، جانِ پاک، دیوارِ یتیم۔

جذبہ بے اختیار، سینۂ شمشیر، خامۂ مژگاں، خوں شدۂ کشمکش، نالۂ دل، سلسلۂ روز و شب، فریضۂ سحری، شامیانۂ عیش۔

اور بوئے گل، صحرائے عدم، سوئے فلک، ثنائے خدا دکھائی دے رہی ہیں اور اضافتِ زیر، اضافتِ ہمزہ اور اضافت یائے مہموز کے جن قاعدوں سے یہ مرکبات بنائے گئے ہیں وہ خالص فارسی قاعدے ہیں۔ ان قواعدی گُروں کو اُردو نے اگر فارسی سے نہیں سیکھا ہوتا تو ہماری زبان میں جو بلند آہنگی اور نغمگی سنائی دیتی ہے، شاید نہیں سنائی دیتی، ایجاز و اختصار کی جو خوبصورتی دکھائی دیتی ہے، نہیں دکھائی دیتی، سمندر کو کوزے میں سمیٹنے والی جو جادوگری نظر آتی ہے، نہیں نظر آتی۔ یہ وہ لسانی ترکیبیں ہیں جن میں اضافی، توصیفی، عطفی، تقلیبی، سبھی طرح کی قواعدی ہنرمندیوں کا رنگ، ڈھنگ اور نیرنگ دیکھا جاسکتا ہے اور اب جو مرقعے ابھرنے والے ہیں ان سے نہ صرف یہ کہ عرب و فارس کے تاریخی واقعات، سیاسی معاملات، معاشرتی حالات، مذہبی بیانات منعکس ہوں گے بلکہ اجتماعی زندگی کے تجربات کا نچوڑ، تصورات کا عطر، مذہبی معجزات و کرامات کا ایجاز، انسانی افکار و خیالات کا ست اور حیات و کائنات کا سار بھی منعکس ہوگا۔ مثلاً

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

ایک جلوہ تھا کلیمِ طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے
سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں
حسین ابن علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں
معجزہ شق القمر کا ہے مدینے سے عیاں
مہہ نے شق ہوکر لیا ہے دین کو آغوش میں

واقعات کا اختصار، حیات وکائنات کا ست اور سار بتانے والے اور تجربات ومشاہدات کا جوہر دکھانے والے الفاظ تلمیح کہلاتے ہیں۔ عام طور شعر میں کسی مشہور قصے یا واقعے کے باندھنے کو تلمیح کہا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تلمیح تمام تر مروجہ تصورات پر محیط ہے۔ شعر میں ان تصورات کو محض بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ ان کے تناظر میں دوسرے معنی مقصود ہوتے ہیں۔ گویا تلمیح اپنے اندر ایک آفاقی مفہوم رکھتی ہے۔ اردو زبان وادب میں زیادہ تر تلمیحیں عربی وفارسی سے آئی ہیں جن سے اردو کی تہذیب وتمدن میں بھی چار چاند لگے ہیں۔

تلمیح ہی کی طرح ایک اور لسانی عنصر بھی اردو معاشرے پر اثر انداز ہوا ہے اور وہ عنصر یہ ہے:

نادان دوست سے دانا دشمن اچھا ہے۔ آبِ حیات تاریکی میں ہے۔ مالِ مفت دل بے رحم۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ روپے کو روپیہ کھینچتا ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ عقل مند کو اشارہ کافی۔ بلی کو پہلے ہی مارنا چاہیے۔ زلیخا تو ساری پڑھ گئے پر یہ نہ جانا کہ وہ عورت تھی یا مرد۔ عالم بالا کی سخن فہمی معلوم ہوگئی۔ ابھی دلی دور ہے۔

مذکورہ بالا سارے فقرے/جملے ضرب الامثال ہیں جو فارسی کہاوتوں کا اردو ترجمہ ہیں۔ آپ ان کی فارسی شکلیں بھی دیکھ لیجیے:

دشمن دانا بہ از دوست ناداں۔ آبِ حیواں درونِ تاریکی است۔ مالِ مفت دل بے رحم۔ رقص کردند خود نداند صحن را گویا کج است۔ زر را زر می کشد۔ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔ عاقل را اشارہ کافی است۔ گر بہ گشتن روز اوّل۔ زلیخا زنِ بود یا مرد۔ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔ ہنوز دلی دور است۔

اس طرح کے سینکڑوں امثال ہیں جو براہِ راست اردو میں فارسی سے داخل ہوئے ہیں۔ وہ مختصر جملے یا فقرے جو طویل تجربات کے بطن سے پیدا ہوئے ہوں

فارسی سے اردو میں آئی ہوئی کہاوتیں یا ان کے طرز پر بنائی گئی کہاوتیں، وہ کہاوتیں ہیں جو طائرِ قلب ونظر کو پر لگاتی ہیں۔ بصیرتوں کو پرواز عطا کرتی ہیں۔ ذہنِ انسانی کو بلندیوں تک پہنچاتی ہیں، چاند سورج اور ستاروں کی سیر کراتی ہیں، زندگی کا جوہر سامنے رکھتی ہیں، تاریک راہوں میں مشعل کا کام کرتی ہیں، زندگی کے فیصلوں میں رہنمائی کرتی ہیں اور معاملاتِ دنیا کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔

اور جن میں قدما نے قوانین کی طرح زندگی کو سمو دیا ہو اور جو دانش مندی کے مظاہر اور دانش مندوں کے اقوال کی تفسیر ہوں، ضرب الامثال ہیں۔ مثل کو اردو میں کہاوت بھی کہتے ہیں، مثل یا کہاوت کے لیے چھ خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔

1۔ اختصار 2۔ جامعیت 3۔ کثرتِ استعمال 4۔ تجربات یا مشاہدات کا نچوڑ 5۔ قبول عام 6۔ معنوی زور اور حقائق کی عکاسی

ایک جملے میں اگر مثل کی تعریف کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے عملی اصول جو بہت سے لوگوں کے تجربے میں آکر زبان زد خلائق ہوجاتے ہوں، ضرب المثل ہیں۔

فارسی سے اردو میں آئی ہوئی کہاوتیں یا ان کے طرز پر بنائی گئی کہاوتیں، وہ کہاوتیں ہیں جو طائرِ قلب و نظر کو پر لگاتی ہیں۔ بصیرتوں کو پرواز عطا کرتی ہیں۔ ذہنِ انسانی کو بلندیوں تک پہنچاتی ہیں، چاند سورج اور ستاروں کی سیر کراتی ہیں، زندگی کا جوہر سامنے رکھتی ہیں، تاریک راہوں میں مشعل کا کام کرتی ہیں، زندگی کے فیصلوں میں رہنمائی کرتی ہیں اور معاملاتِ دنیا کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔

صرف یہی نہیں جن کا اوپر ذکر ہوا بلکہ کچھ اور بھی لسانی اور ادبی عناصر ایسے ہیں جو ہمارے یہاں عربی اور فارسی سے آئے ہیں اور جن سے ہماری معاشرت اور ہماری تہذیب میں بے پناہ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ہماری زبان سے بھی فارسی اور عربی زبان اور ان کی تہذیب وتمدن میں بہت کچھ داخل ہوا مگر ان کا ذکر ابھی نہیں، کہ یہ مقام ان کا نہیں، اردو کا ہے۔

اردو نے ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں اور بولیوں سے بھی بہت سارے لسانی عناصر مثلاً الفاظ تشبیہات، استعارات، مرکبات، محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات، تہذیبی رسومات، ہیئت واصناف وغیرہ حاصل کیے ہیں اور ان کے رنگ وآہنگ سے خود کو مزید معنی خیز، رنگ آمیز اور لطف انگیز کیا۔ سنسکرت اور ہندی اور علاقائی زبانوں کے الفاظ سے تو اردو کا دامن بھرا پڑا ہے۔ بس یہاں چند نمونے پیش کیے جارہے ہیں:

چلمن، درپن، ساجن، سجن، نین موہن ہون
پریم پریت ریت، سنگیت، گیت جل، جل تھل، کھلبل، شیتل، نرمل، تل، بل، چھل کل بل، چنچل
دھنک، سنک گمک، کڑک، کھنک، جھنک، چھنک، بھنک، ٹھنک دھنک، ٹھار دھار، بھار نکھار، سنسار، اندھکار کچھار، سنسار، بگھار، بھاڑ، چھاڑ، پچھاڑ، پھاڑ، اکھاڑ، دہاڑ، اجاڑ کباڑ، پاڑ، آڑ، تاڑ باڑ وغیرہ

ایسے کچھ اشعار بھی سن لیجیے جن میں ہندوستانی زبانوں کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

چوشمع سوزاں، چو ذرہ حیراں، ہمیشہ گریاں: بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آئیں نہ بھیجے پتیاں
نین سے نین جب ملائے گیا
دل کے اندر مرے سمائے گیا
تجھ چال کی قیمت سوں دل نئیں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل تک بھاؤ بتاتی جا
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کی باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

کچھ تلمیحات کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس
بن باس کی طرح ہے کئی عمر انتظار میں
دل کو نہ مل سکا کبھی ایودھیا کا چین
آتشِ عشق نے راون کو جلا کر مارا
گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں
مرلی کی دھن پہ ناچ رہی ہے یہ کائنات
لگتا ہے آج پھر کوئی کشن آ گیا کہیں

اور کچھ مذہبی معاملات پر نظر ڈالیے:

نہیں کوئی دھرم دھاری جو کہے پتیم سوں سمجھا کر
کہ دکھیا کوں بھجوہی سوں اتا بیزار کرنا کیا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا
تجھ نیہہ میں دل جل جل جوگی کی لیا صورت
ایک بار اسے موہن چھاتی سوں لگاتی جا
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلہ ہے
اس کے فروغ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمعِ حرم ہو یا کہ دیا سومناتھ کا

ان شعروں میں ہندی، پنجابی برج بھاشا، دکنی وغیرہ کے صرف الفاظ ہی استعمال نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہندو تلمیحات اور مذہبی رسومات و معاملات بھی پیش ہوئے ہیں۔ بلا شبہ اردو زبان ایک ایسی لسانی دھنک ہے جس سے طرح طرح کے رنگ پھوٹتے ہیں، ایک یہ رنگ بھی دیکھیے:

1. نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی
2. گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے
3. نام بڑے اور درشن چھوٹے
4. بندر کیا جانے ادرک کا سواد
5. کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی

یہ پانچوں ضرب الامثال ہیں جو اردو میں دھڑلے سے استعمال ہوتے ہیں مگر اردو میں یہ ہندی سے آئے ہیں اور ہندی سے آنے کا ثبوت ان میں موجود یہ لفظ رادھا، لنکا، درشن، سواد اور راجا بھوج ہیں۔

اب ذرا ان شعری صورتوں پر نگاہ مرکوز کیجیے:

الف:

اردو والے، ہندی والے دونوں ہنسی اڑائیں
ہم دل والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں

اردو پر پردیسی زبانوں کے اثرات بھی کم نہیں ہیں۔ اگر آپ سیرِ گلستانِ اردو ادب کو نکلیں تو ترکی، عربی اور فارسی کی طرح دیسی زبانوں کے بھی ایسے ایسے پراسرار، پر بہار، ضیا بار اور مشکبار مناظر نظر نواز ہوں گے کہ جن کو دیکھ کر دل و دماغ دنگ رہ جائیں گے اور جن کے رنگ و آہنگ سے حواس لطف و نشاط اور کیف و نشاط سے بھر جائیں گے۔

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے
عادت سے لاچار ہے عادت نئی عجیب
جس دن کھایا پیٹ بھر سویا نہیں غریب
ہوگی اک دن گھر میرے پھولوں کی برسات
میں پگلا اس آس میں ہنستا ہوں دن رات
ندیا نے مجھ سے کہا مت آ میرے پاس
پانی سے بجھتی نہیں انتر من کی پیاس

ب:

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار ہے مجھ کو
ہنستا گاتا جیون اس کا دھوم مچائے موسم
گنگا جمنا کی لہروں میں سات سروں کے سنگم
تاج ایلورا جیسے سندر تصویروں کے ایلبم
یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار ہے مجھ کو

ج:

رام بنا دکھ کوؤ نا ہرے
ناحق مورکھ چنتا کرے
کرپا کر سنسار کے داتا
تورے دوارے آن پڑے
سانچی بات کہت میں کوثر
آسا جیو نراسا مرے
ملّے کے باسی مدینے براجے
سگرے مندروا گجروا باجے
لکھ لکھ پتیاں بھیجے سندیسے
سارے جگت میں راج دھراجے
نور کو وا کے کر کے اجاگر
پربھو نے بھیجا ہمارے کاجے
دھرتی سے آکاس مالک کے سرنے
پہنچے گن لینے بے سنگ وساجے
ابراہیم یہ ہی ارج کرت ہے
دونوں جگت میں رکھو موری لاجے

پہلے حصے میں دوہے کا رنگ ہے۔ دوسرے میں گیت کا اور تیسرے میں بھجن کا۔ یہ تینوں رنگ اردو میں ہندی ادب سے آئے ہیں۔ جاتک اور پنچ تنتر کے طرز پر اردو میں لوک کہانیاں بھی لکھی گئیں اور نانک کے انداز پر ڈرامے بھی تحریر کیے گئے اور انھیں اسٹیج پر پیش بھی کیا گیا۔ اسی طرح بھجن کی مانند اردو میں بھجن بھی پیش کیے گئے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اردو پر پردیسی زبانوں کے اثرات بھی کم نہیں ہیں۔ اگر آپ سیرِ گلستانِ اردو ادب کو نکلیں تو ترکی، عربی اور فارسی کی طرح دیسی زبانوں کے بھی ایسے ایسے پراسرار، پر بہار، ضیا بار اور مشکبار مناظر نظر نواز ہوں گے کہ جن کو دیکھ کر دل و دماغ دنگ رہ جائیں گے اور جن کے رنگ و آہنگ سے حواس لطف و نشاط اور کیف و نشاط سے بھر جائیں گے۔

درج بالا تفصیلات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اردو نے اپنی فراخ دلی اور کشادہ ذہنی کی بدولت اپنے دامن میں دنیائے زبان و ادب سے کس کس طرح کی دولتِ لازوال سمیٹ رکھی ہے۔

■

Prof. Ghazanfar
Bushra, Lane A-12 Hamza Colony,
New Sir Syed Nagar Ext.
Aligarh - 202002 (up)
Mob.: 7678436704
E-mail: ghazanfarjmi@gmail.com

سید مبین زہرا

این ای پی 2020
تعلیم اور خواتین کی بااختیاری

کسی بھی معاشرہ کی ترقی میں تعلیم اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس میں خواتین کی تعلیم کی اہمیت خاص طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہم کسی ایک شخص کو تعلیم یافتہ کرتے ہیں تو صرف ایک فرد تعلیم یافتہ ہوتا ہے لیکن اگر ہم کسی خاتون کو علم کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں تو پھر ایک پوری نسل تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔ کسی بھی بچے کا پہلا مدرسہ اس کی ماں کی گود ہی ہوتی ہے۔ اگر ماں تعلیم یافتہ ہوگی تو یہ بات یقینی ہے کہ اس گود میں آنے والی نسل بھی علم کی دولت سے مالا مال ہو جائے گی۔

ہمارے ملک کی تاریخ قدیم زمانے سے ہی علم سے روشن رہی ہے۔ علم کا مطلب 'تمسو ما جیوتر گمے' ہے یعنی اندھیرے سے اجالے کی طرف کا سفر ہی علم ہے۔ بھارت میں ویدک وقت سے تعلیم کی اہمیت قائم رہی ہے۔ ہر دور میں تعلیم کی الگ الگ روایتیں اس دور کی ضرورتوں کے لحاظ سے موجود رہی ہیں۔ علم کو لے کر سنسکرت کا ایک بہت ہی مشہور شلوک ہے جو ہیتو پدیش سے ہے۔

विद्या ददाति विनयं, विनयाद् याति पात्रताम।
पात्रत्वाद्धनमाप्नोति, धनाद्धर्मं ततः सुखम्

(विद्या विनम्रता देती है। विनम्रता से योग्यता आती है। योग्यता से धन प्राप्त होता है। धन से धर्म और अंत में सुख प्राप्त होता है।

جس کا اردو ترجمہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ علم (تعلیم) عاجزی، انکساری دیتا ہے، عاجزی سے قابلیت آتی ہے، قابلیت سے دولت حاصل ہوتی ہے، دولت سے مذہب اور آخر میں سکون و آرام حاصل ہوتا ہے۔

اگر ہم اس پورے شلوک پر غور کریں تو یہاں دولت کا مطلب علم کی دولت ہے اور مذہب کا مطلب سچائی اور نیکیوں کا راستہ کہا جا سکتا ہے۔

اگر ہم ویدک دور کی تعلیم کو دیکھیں تو اس میں انسان کی کردار سازی اور اس کو دھرم سے جوڑنے پر بہت زور ہوتا تھا۔ اصل میں دھرم سے جڑنے میں ہی وہ ایک نیک انسان اور ستیہ یعنی سچائی کے مارگ پر چلنے والا انسان بن سکتا تھا۔ اس دور میں جسمانی تعلیم جیسے یوگ یا یودھ کوشل (جنگی مہارت) وغیرہ پر بھی بہت زور ہوتا تھا۔ ویدک دور کے جو سماجی سانچے تھے اس کے مطابق شخصیت سازی ویدک دور میں تعلیم کی ایک خاص ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ گروکل روایت کے ذریعے گروشیشہ کی تہذیب میں دھرم کرم اور دیگر علموں کو اس طرح پڑھایا جاتا تھا کہ جس سے ایک انسان زندگی کے ہر میدان میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔

آج کے وقت میں جب کہ علم کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے ایسے میں علم کو سماج کے ہر فرد تک اس طرح پہنچانا کہ کسی کا دامن بھی علم سے خالی نہ رہ جائے کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جب ہم نئی قومی تعلیمی پالیسی (این ای پی 2020) کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں تعلیم کو مساوی طور پر سب سے جوڑنے پر حکومت کا اہم زور ہے۔ اس میں نہ صرف مادری زبان میں تعلیم کی بات ہے بلکہ خواتین کا بھی خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کو لے کر وزیر اعظم نریندر مودی کافی سرگرم رہے ہیں۔ جولائی 2022 میں وزیر اعظم نریندر مودی نے وارانسی میں اکھل بھارتیہ سکشا سنگم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''نئی تعلیمی پالیسی کا خاص مقصد تعلیم کو محدود نظریات سے باہر نکال کر اکیسویں صدی کے جدید نظریات سے مربوط کرنا ہے۔ ہمارے ملک میں ذہانت کی کبھی بھی کوئی کمی نہیں رہی، لیکن بدقسمتی سے ہم پر ایسا نظام تھوپ دیا گیا جہاں تعلیم کا مقصد نوکری سمجھا جانے لگا''۔ وزیر اعظم نے زور دے کر کہا تھا کہ ''ہمیں صرف ڈگری ہولڈر نوجوان تیار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمارے تعلیمی نظام کو چاہیے کہ ملک کو آگے لے جانے کے لیے جو بھی انسانی وسائل درکار ہوں، وہ فراہم کرے۔ ہمارے اساتذہ اور تعلیمی اداروں کو اس قرار کی قیادت کرنی چاہیے''۔

اس برس جولائی میں قومی تعلیمی پالیسی کو پورے چھ سال ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ گذشتہ برس این ای پی کے پانچ سال پورے ہونے پر مرکزی وزیر تعلیم جناب دھرمیندر پردھان نے ایک قومی انگریزی روزنامہ میں لکھے ایک خاص مضمون میں پانچ برس کی کامیابیوں کا جو تذکرہ کیا تھا، اسے وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے ایکس پر شیئر کرتے ہوئے این ای پی 2020 کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے مختلف حصولیابیوں کے ساتھ ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اور ریاضی (ایس ٹی ای ایم) میں خواتین کی بڑھتی شمولیت کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ وزیر تعلیم جناب دھرمیندر پردھان نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ این ای پی کا تصور ایس ٹی ای ایم میں خواتین کی بڑھتی شراکت میں بھی جھلکتا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں بتایا تھا کہ پانچ سال پورے ہونے پر اعلیٰ تعلیم میں مجموعی طلبا کی تعداد میں لڑکیوں کی تعداد

48 فیصد کے قریب پہنچ چکی تھی۔ یہی نہیں پی ایچ ڈی میں اندراج کرانے والی لڑکیوں کی تعداد بھی پہلے کے مقابلے دوگنی ہوچکی تھی۔ اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ صرف چند برسوں میں ہی این ای پی نے خواتین کی تعلیم کو لے کر کتنا بڑا انقلاب پیدا کردیا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی کا فائدہ پورے سماج کو ہی ہورہا ہے لیکن اس میں صنفی مساوات کی اہمیت کی وجہ سے خواتین کے لیے یہ تعلیمی پالیسی ایک طرح سے ان کے لیے تعلیمی ترقی کی نئی راہیں کھول رہی ہے۔

وزارت تعلیم، بھارت سرکار نے لوک سبھا میں ایک سوال کے تحریری جواب میں بتایا تھا کہ قومی تعلیمی پالیسی (این ای پی 2020) 'مساوات اور جامع تعلیم' پر توجہ مرکوز کرتی ہے جو اس خیال کا اعادہ کرتی ہے کہ کوئی بھی بچہ اپنے پس منظر اور سماجی و ثقافتی شناخت کی وجہ سے تعلیمی مواقع کے معاملے میں پیچھے نہیں رہے۔ قومی تعلیمی پالیسی نے سماجی و اقتصادی طور پر پسماندہ گروپوں (ایس ای ڈی جی) کے خدشات کو مدنظر رکھا ہے جس میں خواتین اور ٹرانسجینڈر افراد شامل ہیں۔ اس کے علاوہ قومی تعلیمی پالیسی ریاستوں اور مقامی کمیونٹی تنظیموں کی شراکت کے ساتھ تعلیم میں صنفی مساوات کو حاصل کرنے کو ایک اولین ترجیح کے طور پر ملحوظ رکھتی ہے۔ (پی آئی بی)

اسی بیان میں خاص طور پر خواتین کو لے کر این ای پی 2020 کے اہم نکات کو بھی ظاہر کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق ''قومی تعلیمی پالیسی 2020 خاص طور پر لڑکیوں اور ٹرانسجینڈر طالب علموں کے لیے صنفی شمولیتی فنڈ (جی آئی ایف) کے قیام کے لیے تجویز فراہم کرتی ہے تاکہ تمام لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ٹرانسجینڈر طالب علموں کے لیے مساوی اور معیاری تعلیم فراہم کرنے کی ملک کی صلاحیت کو بڑھایا جاسکے۔ لڑکیوں کے لیے مساوی اور معیاری تعلیم کے لیے این ای پی کے مقاصد سمگر شکشا 0.2 کے تحت سماجی اقتصادی پسماندہ گروپوں (ایس ای ڈی جی) کے لیے وقف وسائل مختص کر کے مخصوص وسائل کے ذریعے پورے کیے جارہے ہیں۔ سمگر شکشا کے تحت لڑکیوں کو معیاری تعلیم فراہم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے ہیں جس میں لڑکیوں کی تعلیم تک رسائی کو آسان بنانے کے لیے محلے میں اسکول کھولنا، آٹھویں جماعت تک کی لڑکیوں کو مفت یونیفارم اور نصابی کتابیں، اضافی اساتذہ اور رہائشی

> **ہمیں صرف ڈگری ہولڈر نوجوان تیار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمارے تعلیمی نظام کو چاہیے کہ ملک کو آگے لے جانے کے لیے جو بھی انسانی وسائل درکار ہوں، وہ فراہم کرے۔ ہمارے اساتذہ اور تعلیمی اداروں کو اس قرار کی قیادت کرنی چاہیے۔**

کوارٹرز کی فراہمی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں اساتذہ، خواتین اساتذہ سمیت اضافی اساتذہ کی تقرری، پہلی سے بارہویں جماعت کی سی ڈبلیو ایس این لڑکیوں کو وظیفہ، لڑکیوں کے لیے علیحدہ بیت الخلا، لڑکیوں کی شرکت کو فروغ دینے کے لیے اساتذہ کے حساس پروگرام، صنفی طور پر حساس تدریسی مواد بشمول نصابی کتب وغیرہ شامل ہیں''۔ (پی آئی بی)

اگر ہم این ای پی کا باریکی سے جائزہ لیں تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ کیسے قومی تعلیمی پالیسی مساوات کی بات کرتی ہے۔ اگر تعلیمی پالیسی میں ٹرانسجینڈر تک کے تعلیمی حقوق کا خیال رکھا گیا ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کی منشا سماج کے ہر فرد تک تعلیم کی روشنی پہنچانا ہے۔ جیسا کہ وزیراعظم نے بھی کہا ہے کہ ہمیں تعلیم کو محدود نظریات سے باہر نکال کر اکیسویں صدی کے جدید نظریات سے مربوط کرنا ہوگا۔ اکیسویں صدی انسان کو انسان سے جوڑنے کا نام ہے۔ آپ دنیا میں کہیں بھی بیٹھ کر ہزاروں کلومیٹر دور بیٹھے شخص کی زندگی سے جڑ سکتے ہیں۔ ایسے میں کوئی بھی انسان علم پانے میں اگر پیچھے چھوٹ جاتا ہے تو پھر وہ زندگی کی دوڑ میں بھی پیچھے رہ جائے گا۔ ہمارے سماج کی خواتین کو تعلیم سے جوڑنے میں این ای پی اس لحاظ سے اہم رول ادا کررہی ہے۔

این ای پی کے اندر اسکولی تعلیم کی تمام سطح پر صنفی تفاوت کو کم کرنے کے لیے کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ (کے جی بی وی)، جو کہ ایس سی، ایس ٹی، او بی سی، اقلیتوں اور خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے (بی پی ایل) پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے لیے چھٹی کلاس سے بارہویں کلاس تک کے رہائشی اسکول ہیں اور یہ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ بلاکس میں منظور شدہ ہیں۔ ان رہائشی اسکولوں میں سات لاکھ سے زیادہ لڑکیوں کے لیے چھ ہزار کے قریب رہائشی اسکول یعنی کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ کو منظوری دی گئی ہے۔ (پی آئی بی)

آج ہماری صدر جمہوریہ محترمہ دروپدی مرمو جی ایک خاتون ہیں جو قبائلی علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا ملک کے عظیم عہدے پر فائز ہونا دور دراز کے قبائلی علاقے کی بچیوں کو زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے امید اور حوصلہ دیتا ہے۔ حکومت نے خواتین کی طاقت کو وکست بھارت کے لیے استعمال کرنے کا جو تہیہ کیا ہوا ہے اس کا عکس ہمیں قومی تعلیمی پالیسی میں بھی ملتا ہے۔ 8 مارچ 2026 کو خواتین کا بین الاقوامی دن منایا گیا تھا۔ اس سال کے خواتین کے بین الاقوامی دن کا موضوع ''حقوق اور انصاف کے ساتھ ہر عورت اور ہر لڑکی کو بااختیار بنانے کے لیے ٹھوس اقدامات'' رکھا گیا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ بغیر علم کے اختیار حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف خواتین کو تعلیم یافتہ کرنا ہے بلکہ انھیں مالی طور پر خودمختار بھی بنانا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کے اہم فیصلے اپنے اختیار میں رکھ سکیں۔ یہ خواتین کو مضبوط کرنے کی سمت اہم قدم ہے جسے ناری شکتی یعنی خواتین کی قوت کا عنوان دیا گیا ہے۔ جیسا کہ مرکزی وزیر تعلیم جناب دھرمیندر پردھان نے بھی لکھا ہے کہ اب خواتین، سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اور ریاضی (ایس ٹی ای ایم) کی طرف زیادہ دیکھ رہی ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اب ہماری بیٹیوں کا رجحان گھریلو سائنس یا آرٹ کے روایتی کورس کی جانب نہ ہوکر مستقبل کے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے کورس کی طرف زیادہ ہے۔ ایسا اس لیے بھی ممکن ہو سکا ہے کیونکہ قومی تعلیمی پالیسی (این ای پی 2020) میں ایس ٹی ای ایم میں خواتین کی شرکت بڑھانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ وگیان جیوتی کو 2020 میں شروع کیا گیا تھا تاکہ 9 ویں سے 12 ویں کلاس تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے مختلف زمروں میں لڑکیوں کی کمی کو بڑھایا جاسکے۔ اس کے علاوہ اوورسیز فیلوشپ اسکیم کے تحت بھی ہندوستانی خواتین سائنسدانوں

اور تکنیکی ماہرین کو ایس ٹی ای ایم میں بین الاقوامی تعاون پر مبنی تحقیق کرنے کے مواقع فراہم کیے جاتے رہے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے فخر کی ہونی چاہئے کہ ہماری خواتین سائنسدانوں نے ہندوستان کے پہلے منگلیان مارس آربیٹر مشن (ایم او ایم) میں نمایاں شراکت کی تھی جس میں اسپیس ایپلیکیشن سینٹر میں سائنسی آلات کی تعمیر اور جانچ بھی شامل ہے۔ (پی آئی بی)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بچیاں قومی تعلیمی پالیسی این ای پی 2020 کے آنے کے بعد سے تعلیم کو لے کر بہت بیدار ہو رہی ہیں اور وہ اب مستقبل کے اہم نصاب کی جانب دیکھ رہی ہیں۔ اس سے ان کا زندگی کے ہر شعبے میں شامل ہونا یقینی ہو پا رہا ہے جس سے خواتین کو بااختیار بنانے کی سمت ہم لگاتار آگے بڑھنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ خواتین کو بااختیار بنانے کا پہلا قدم ہی علم حاصل کرنا ہے۔ یہ زمانہ علم کا ہے جو تعلیم میں پچھڑ گیا وہ زندگی میں پیچھے رہ جائے گا۔ اسی کو دھیان میں رکھتے ہوئے حکومت کا پورا زور صنفی مساوات کو زندگی کے ہر شعبے میں لاگو کرنا ہے۔ وہ چاہے پارلیمنٹ ہو چاہے پنچایت یا پھر تعلیم کا میدان ہی کیوں نہ ہو۔ حکومت اس وقت بچیوں کی تعلیم کو لے کر جس قدر سنجیدہ ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت سمگر شکشا ابھیان (ایس ایس اے) کے تحت مفت یونیفارم، نصابی کتب، بہتر تعلیمی ڈھانچہ اور خواتین اساتذہ کی بھرتی کے ذریعے صنفی حساس تعلیم کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ (کے جی بی وی) پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے لیے رہائشی تعلیم فراہم کر رہے ہیں، جب کہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (آئی آئی ٹی) اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (این آئی ٹی) جیسے اداروں میں اضافی نشستوں کی فراہمی جیسے اقدامات سے خواتین کی اعلیٰ تعلیم تک رسائی کو یقینی بنانے کی کوششیں عروج پر ہیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں اعلیٰ تعلیم میں خواتین کا داخلہ 15-2014 میں 15.7 ملین سے بڑھ کر 23-2022 میں تقریباً 21.8 ملین تک پہنچ گیا۔ (پی آئی بی)

پی آئی بی کے مطابق اس کے علاوہ مالی سال 25-2024 میں سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اور ریاضی (ایس ٹی ای ایم) کے شعبوں میں یو جی سی نیٹ/جے آر ایف اسکالرز میں خواتین کا حصہ 53 فیصد سے زیادہ رہا، جو جدید تحقیق اور اختراع کے میدان میں خواتین کی بڑھتی ہوئی شمولیت کو ظاہر کرتا ہے۔ (پی آئی بی)

حکومت نے خواتین کو تعلیمی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی طور پر بااختیار بنانے کے لیے کثیر جہتی نقطہ نظر اپنایا ہوا ہے تاکہ وہ ہندوستان کی ترقی کے عمل کی قیادت کر سکیں۔ اس میں تعلیم پر حکومت کا سب سے زیادہ زور ہے اور اس سمت قومی تعلیمی پالیسی این ای پی 2020 کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پی آئی بی کی ایک ریلیز کے مطابق سکنیا سمردھی یوجنا بھی تعلیم میں بیٹیوں کی مددگار بن کر ابھری ہے۔ اس کے ذریعے بیٹیوں کے روشن مستقبل کی بنیاد یعنی تعلیم کے لیے خاندانوں کو ترغیب ملتی ہے۔ سکنیا سمردھی یوجنا (ایس ایس وائی) خاندانوں کو اپنی بیٹیوں کے طویل مدتی مستقبل میں سرمایہ کاری کے لیے راغب کرتی ہے۔ پی آئی بی کے مطابق بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ مہم کے ایک حصے کے طور پر 22 جنوری 2015 کو شروع کی گئی یہ چھوٹی بچت اسکیم لڑکیوں کی تعلیم اور ان کے مستقبل کی امنگوں کے لیے ایک محفوظ مالی راستہ فراہم کرتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت جمع شدہ رقوم پر حکومت کی جانب سے مقرر کردہ شرح کے مطابق سود ملتا ہے، جو اس وقت 2.8 فیصد ہے۔ اس اسکیم کو عوامی سطح پر بھرپور پذیرائی ملی ہے: دسمبر 2025 تک اس کے تحت 53.4 کروڑ سے زیادہ اکاؤنٹس کھولے جا چکے ہیں اور 33.3 لاکھ کروڑ روپے سے زائد کی رقم جمع ہو چکی ہے۔ لڑکیوں کے نام پر بچت کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایس ایس وائی نہ صرف مالی تحفظ کو یقینی بناتی ہے بلکہ بیٹیوں کے مستقبل میں سرمایہ کاری کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ (پی آئی بی)

ہم اگر اپنے ملک کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ یہاں تعلیم کو لے کر مالی دشواریوں کی وجہ سے بہت سے ہونہار اور قابل بچے اپنے علم کی طلب کو بیچ میں ہی چھوڑ کر کسی چھوٹے موٹے کام سے جڑ جاتے ہیں لیکن اب قومی تعلیمی پالیسی اس سلسلے میں بہت مددگار ثابت ہو رہی ہے جہاں طلبہ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے بنا کسی دشواری کے آسان طور پر قرضے حاصل کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں بینکنگ شعبے بھی مدد سے پیچھے نہیں ہٹ رہے ہیں۔ سکنیا سمردھی یوجنا کے اعداد و شمار یقینی طور پر یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اس سلسلے میں جو پہل ہوئی ہے وہ کامیاب رہی ہے۔

جہاں تک این ای پی 2020 میں خواتین کی تعلیم کی بات ہے تو اس میں صاف طور پر صنفی مساوات کے ذریعے خواتین کی تعلیم کو بھرپور جگہ دی گئی ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ لڑکیوں کی تعلیم پورے خاندان کی صحت، معاشی ترقی، اور سماجی استحکام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ این ای پی نے اعلیٰ تعلیم میں خواتین کو ترجیح دی ہے کیونکہ ان کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے پورا معاشرہ ترقی کر سکتا ہے اور آنے والی نسلیں تو یقینی طور پر تعلیم یافتہ ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ہم آخر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ این ای پی 2020 خواتین کو بااختیار بنانا چاہتی ہے جس سے کہ ہمارے سماج میں سب برابر سے ترقی کر سکیں۔

این ای پی 2020 ہمیں اپنی بیٹیوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرنے کا بہترین موقع فراہم کر رہی ہے۔ ہمیں اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہماری تاریخ خواتین کے علم سے سجی ہے۔ ہمارے یہاں خواتین ڈاکٹر، جج، سائنسداں، فائٹر پائلٹ، اعلیٰ افسر، ٹیچر، سیاست دان، حکمران، سبھی تو رہی ہیں۔ ایسے میں اگر ہم پیچھے رہ جاتی ہیں تو اس کے لیے ہم کسی اور کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے ہیں۔ ہماری بیٹیوں میں حوصلے، ہمت اور ولولے کی کمی نہیں ہے۔ اگر علم کی تلاش میں کبھی ایسا محسوس ہو تو آپریشن سندور کے دوران پوری دنیا کے سامنے ہندوستانی حوصلوں کا اظہار کرتی کرنل صوفیا قریشی کی بھارتی مسلح افواج کی وردی میں سجی تصویر یاد کر لیجیے گا۔ یہ تصویر گھر بیٹھے نہیں بنتی بلکہ اس کے لیے علم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ بھلے ہی اس کے لیے گھر سے دور ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

کتابیات

1. Multilingual Inclusive Education Being Realised At Scale, Shri Dharmendra Pradhan, Union Minister of Education, 28th July 2025, Times of India
2. Hitopdesh, Narayan Pandit, 2021, Rajpal & Sons
3. PIB Releases, Ministry of Education
4. بھارت میں شکشا کا اتہاس، ڈاکٹر کملیش سندھو، کتاب والا،

Dr. Syed Mubin Zehra
Associate Professor, Dept. of History, ARSD College, University of Delhi-110021
Mob. :9990424992
Email:drsyedmubinzehra@gmail.com

ندیم احمد

ڈیجیٹل عہد میں اردو زبان و ادب کی تشکیل

اردو زبان نے اپنی تاریخ کے ہر دور میں مختلف تہذیبی اور لسانی اثرات کو قبول کیا ہے۔ دکن کے درباروں سے لے کر دہلی اور لکھنؤ کی ادبی فضا تک، اور وہاں سے جدید شہری زندگی تک، اردو نے ہمیشہ اپنے اندر ایک وسعت اور کشادگی رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان کبھی جمود کا شکار نہیں ہوئی بلکہ ہر دور میں اپنے لیے نئی راہیں تلاش کرتی رہی۔ موجودہ ڈیجیٹل عہد میں بھی یہی عمل جاری ہے، مگر اس کی رفتار پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز اور اثرات کہیں زیادہ گہرے ہیں۔

ڈیجیٹل میڈیا نے زبان کو جس طرح متاثر کیا ہے، اس کی ایک اہم جہت یہ ہے کہ اب اظہار کے ذرائع صرف تحریر تک محدود نہیں رہے۔ تصویر، ویڈیو، آواز اور علامتیں ایک مشترکہ ابلاغی نظام کا حصہ بن چکی ہیں۔ اس نئے نظام میں اردو نے خود کو نہ صرف شامل کیا ہے بلکہ اس کے ذریعے اپنے اظہار کو مزید وسعت بھی دی ہے۔ آج ایک عام صارف اپنے موبائل فون کے ذریعے اردو میں نہ صرف لکھ سکتا ہے بلکہ بول سکتا ہے، ویڈیو بنا سکتا ہے، اور اپنی بات کو عالمی سطح پر پہنچا سکتا ہے۔ یہ وہ تبدیلی ہے جس نے زبان کو خواص کے دائرے سے نکال کر عوامی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ اسی تناظر میں دیکھا جائے تو سوشل میڈیا نے اردو کے مزاج کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ پہلے جہاں اردو کا تعلق سنجیدہ ادب، رسمی تحریر اور ادبی نشستوں سے تھا، اب وہ روزمرہ کی گفتگو، مزاح، تبصرہ اور فوری ردِعمل کی زبان بن چکی ہے۔ یہ تبدیلی بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے اثرات نہایت گہرے ہیں۔ اس نے اردو کو ایک زندہ، متحرک اور عوامی زبان بنا دیا ہے، جو ہر لمحہ اپنے صارفین کے ساتھ بدل رہی ہے۔

میمز اس تبدیلی کی ایک نہایت واضح مثال ہیں۔ جو تصویر اور مختصر متن کے امتزاج کا نمونہ ہوتے ہیں اور فوری طور پر ایک مکمل مفہوم ادا کرتے ہیں۔ اردو میں میمز کا استعمال تیزی سے بڑھا ہے اور اس نے طنز و مزاح کی روایت کو ایک نئی جہت دی ہے۔ اب ایک مختصر جملہ، جو کسی خاص سیاق و سباق میں استعمال ہو، پورے معاشرتی رویے پر تبصرہ کر سکتا ہے۔ یہ رجحان اس بات کی علامت ہے کہ اردو نے جدید ذرائع ابلاغ کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ انھیں اپنے اظہار کا حصہ بھی بنا لیا ہے۔

ڈیجیٹل میڈیا نے زبان کو جس طرح متاثر کیا ہے، اس کی ایک اہم جہت یہ ہے کہ اب اظہار کے ذرائع صرف تحریر تک محدود نہیں رہے۔ تصویر، ویڈیو، آواز اور علامتیں ایک مشترکہ ابلاغی نظام کا حصہ بن چکی ہیں۔ اس نئے نظام میں اردو نے خود کو نہ صرف شامل کیا ہے بلکہ اس کے ذریعے اپنے اظہار کو مزید وسعت بھی دی ہے۔ آج ایک عام صارف اپنے موبائل فون کے ذریعے اردو میں نہ صرف لکھ سکتا ہے بلکہ بول سکتا ہے، ویڈیو بنا سکتا ہے، اور اپنی بات کو عالمی سطح پر پہنچا سکتا ہے۔

میمز کے ساتھ ساتھ زبان میں اختصار کا رجحان بھی بڑھا ہے۔ ڈیجیٹل صارف طویل تحریروں کے بجائے مختصر اور جامع اظہار کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اردو کے جملے چھوٹے، براہِ راست اور فوری اثر رکھنے والے ہو گئے ہیں۔ گرچہ اس سے زبان کی خوبصورتی کے بعض روایتی عناصر متاثر ہوئے ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ زبان میں ایک نئی توانائی اور روانی بھی پیدا ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسا توازن ہے جسے سمجھنا اور برقرار رکھنا ضروری ہے۔ ڈیجیٹل میڈیا نے نہ صرف اردو کے تحریری اظہار کو بدلا ہے بلکہ اس کی زبانی روایت کو بھی ایک نئی زندگی دی ہے۔ یوٹیوب اور پوڈ کاسٹ جیسے پلیٹ فارمز نے اردو کو ایک بار پھر سننے اور بولنے کی زبان کے طور پر زندہ کر دیا ہے۔ اب لوگ نہ صرف اردو میں لکھتے ہیں بلکہ اسے بولتے، سنتے اور محسوس بھی کرتے ہیں۔ یہ ایک اہم تبدیلی ہے جو زبان کو صرف کتابی دائرے سے نکال کر ایک مکمل ابلاغی تجربہ بنا دیتی ہے۔

پوڈ کاسٹ کا رجحان خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جہاں اردو میں سنجیدہ موضوعات پر طویل گفتگو کی جا رہی ہے۔ یہ گفتگو نہ صرف معلوماتی ہوتی ہے بلکہ اس میں

ایک فکری گہرائی بھی ہوتی ہے جو اردو کی علمی روایت کو زندہ رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وی لاگز نے اردو کو روزمرہ زندگی کے قریب کر دیا ہے، جہاں ایک عام انسان اپنی زبان میں اپنی کہانی بیان کرتا ہے اور ہزاروں لوگ اسے سنتے ہیں۔ اس عمل نے اردو کو ایک نئی عوامی طاقت عطا کی ہے۔ رسم الخط کے حوالے سے بھی ایک نئی صورت حال سامنے آئی ہے۔ رومن اردو کا استعمال خاص طور پر نوجوان نسل میں بہت بڑھ گیا ہے، کیونکہ یہ آسان اور تیز ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اردو کے روایتی رسم الخط کو بھی ایک چیلنج درپیش ہے۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ ٹیکنالوجی نے اس مسئلے کا حل بھی پیش کیا ہے، اور اب مختلف ڈیجیٹل ٹولز کے ذریعے اردو میں لکھنا پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ اس طرح ایک طرف زبان سادہ ہو رہی ہے، تو دوسری طرف اس کی جمالیاتی روایت بھی برقرار ہے۔

ایموجیز کا استعمال بھی اردو کے اظہار میں ایک نئی جہت کا اضافہ کر رہا ہے۔ یہ دراصل ایک بصری زبان ہے جو الفاظ کے ساتھ مل کر جذبات کو زیادہ مؤثر انداز میں بیان کرتی ہے۔ اب ایک مسکراہٹ یا ایک آنسو کی علامت وہ کام کر سکتی ہے جو پہلے کئی جملوں سے ادا کیا جاتا تھا۔ یہ رجحان زبان کے ارتقا کی ایک نئی شکل ہے، جہاں تحریری اور بصری اظہار ایک دوسرے میں ضم ہو رہے ہیں۔

پاپ کلچر نے بھی اردو کے اس نئے منظرنامے کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاص طور پر موسیقی کے میدان میں اردو نے ایک نئی شناخت حاصل کی ہے۔ اردو ریپ اور جدید پاپ موسیقی نے نوجوان نسل کو اردو سے جوڑنے میں ایک مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ اس میں جو زبان استعمال ہوتی ہے، وہ سادہ، براہِ راست اور زندگی کے قریب ہوتی ہے۔ اس میں سماجی مسائل، معاشی مشکلات اور ذاتی تجربات کو جس شدت اور سچائی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، وہ اردو کے لیے ایک نئی سمت کا تعین کرتا ہے۔ یہ تمام تبدیلیاں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اردو زبان ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے، جہاں اس کے سامنے نئے امکانات بھی ہیں اور نئے چیلنجز بھی۔ اس مرحلے پر ضروری ہے کہ ہم ان تبدیلیوں کو نہ صرف سمجھیں بلکہ ان کا تنقیدی جائزہ بھی لیں تاکہ اردو اپنی اصل روح کو برقرار رکھتے ہوئے نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔

اس بدلتے ہوئے منظرنامے میں ایک اور نہایت اہم پہلو جو توجہ کا متقاضی ہے، وہ اردو زبان کی ساختی اور نحوی تبدیلیاں ہیں جو ڈیجیٹل استعمال کے نتیجے میں سامنے آ رہی ہیں۔ زبان جب کسی نئے میڈیم میں داخل ہوتی ہے تو وہ صرف الفاظ کا تبادلہ نہیں کرتی بلکہ اپنی داخلی ساخت میں بھی تبدیلیاں قبول کرتی ہے۔ سوشل میڈیا پر اردو کے استعمال نے جملوں کی ترتیب، الفاظ کے انتخاب اور بیان کے انداز کو خاصا متاثر کیا ہے۔ اب طویل اور پیچیدہ جملوں کی جگہ مختصر، براہِ راست اور فوری اثر رکھنے والے جملے زیادہ رائج ہو چکے ہیں۔ اس رجحان نے ایک طرف زبان کو عام فہم بنایا ہے تو دوسری طرف اس کی روایتی پیچیدگی اور تہذیبی نزاکت کو بھی کسی حد تک کم کر دیا ہے۔ اسی تناظر میں کوڈ مکسنگ اور کوڈ سوئچنگ کے رجحانات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اردو بولنے والے اب اپنی گفتگو میں بیک وقت اردو، انگریزی اور مقامی زبانوں کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ امتزاج بظاہر زبان کی خالصتاً روایتی صورت کے خلاف محسوس ہوتا ہے، مگر درحقیقت یہ جدید معاشرتی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ شہری زندگی، تعلیمی نظام اور عالمی روابط نے اس لسانی آمیزش کو ناگزیر بنا دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس امتزاج نے اردو کو محدود کرنے کے بجائے اس کے دائرۂ اظہار کو وسیع کیا ہے، کیونکہ اب یہ زبان مختلف سماجی اور ثقافتی سطحوں پر بیک وقت کام کر رہی ہے۔

> پوڈ کاسٹ کا رجحان خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جہاں اردو میں سنجیدہ موضوعات پر طویل گفتگو کی جا رہی ہے۔ یہ گفتگو نہ صرف معلوماتی ہوتی ہے بلکہ اس میں ایک فکری گہرائی بھی ہوتی ہے جو اردو کی علمی روایت کو زندہ رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وی لاگز نے اردو کو روزمرہ زندگی کے قریب کر دیا ہے، جہاں ایک عام انسان اپنی زبان میں اپنی کہانی بیان کرتا ہے اور ہزاروں لوگ اسے سنتے ہیں۔

ڈیجیٹل میڈیا نے اردو میں بیانیے کی نوعیت کو بھی تبدیل کیا ہے۔ پہلے بیانیہ زیادہ تر یک طرفہ ہوتا تھا، جہاں مصنف لکھتا تھا اور قاری خاموشی سے پڑھتا تھا۔ مگر اب سوشل میڈیا نے اس بیانیے کو دو طرفہ بلکہ کثیر الجہتی بنا دیا ہے۔ ایک پوسٹ یا تحریر پر فوری ردِعمل آتا ہے، لوگ تبصرے کرتے ہیں، اپنی رائے دیتے ہیں اور یوں ایک مکالمہ جنم لیتا ہے۔ اس عمل نے اردو کو ایک زندہ مکالماتی زبان میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں اظہار محض انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہو چکا ہے۔ اس اجتماعی اظہار نے زبان کو ایک نئی توانائی دی ہے، مگر اس کے ساتھ یہ خطرہ بھی پیدا ہوا ہے کہ بعض اوقات سنجیدگی اور فکری گہرائی پسِ پشت چلی جاتی ہے۔ ادب کے میدان میں بھی اس تبدیلی کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے تخلیق کے عمل کو جمہوری بنا دیا ہے، جہاں اب ہر شخص اپنی تحریر شائع کر سکتا ہے۔ اس سے ایک طرف نئے لکھنے والوں کو موقع ملا ہے، مگر دوسری طرف معیار کا مسئلہ بھی پیدا ہوا ہے۔ اب ادب صرف منتخب ادیبوں کی تحریروں تک محدود نہیں رہا بلکہ ایک وسیع اور متنوع دائرے میں پھیل گیا ہے۔ اس میں اعلیٰ معیار کی تخلیقات بھی شامل ہیں اور سطحی اظہار بھی۔ یہ تنوع بظاہر ایک مسئلہ محسوس ہوتا ہے، مگر درحقیقت یہ زبان کی زندگی کی علامت ہے۔

اردو شاعری پر بھی ڈیجیٹل میڈیا اور پاپ کلچر کے اثرات نمایاں ہیں۔ کلاسیکی غزل، جو علامتوں، استعارات اور تہذیبی نزاکت سے بھرپور ہوتی تھی، اب ایک نئے انداز میں سامنے آ رہی ہے۔ جدید شاعر اپنی شاعری میں براہِ راست زبان، روزمرہ کے مسائل اور سادہ اظہار کو ترجیح دے رہا ہے۔ یہ تبدیلی خاص طور پر نوجوان شعرا میں زیادہ واضح ہے، جو اپنے تجربات کو پیچیدہ علامتی انداز کے بجائے سادہ اور فوری انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس سے شاعری کا دائرہ وسیع ہوا ہے اور وہ زیادہ لوگوں تک پہنچ رہی ہے۔

اردو نظم میں بھی ایک نئی جہت پیدا ہوئی ہے، جہاں موضوعات کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا ہے۔ اب شاعر صرف محبت یا روایتی موضوعات تک محدود نہیں بلکہ سماجی مسائل، سیاسی حالات، ذاتی تجربات اور شناخت کے سوالات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنا رہا ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے ان موضوعات کو سامعین کی ایک بڑی تعداد تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

نثر کے میدان میں بھی تبدیلیاں نمایاں ہیں۔ افسانہ اور مضمون اب ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر ایک نئی صورت میں سامنے آ رہے ہیں۔ مختصر افسانے، بلاگ تحریریں اور سوشل میڈیا پوسٹس ایک نئی نثری روایت کو جنم دے رہے ہیں۔ یہ تحریریں اگرچہ روایتی ادب کے معیار سے مختلف ہوتی ہیں، مگر ان میں ایک تازگی اور براہِ راست اثر ہوتا ہے جو جدید قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

ڈیجیٹل میڈیا نے اردو تنقید کو بھی متاثر کیا ہے۔ اب تنقید صرف ادبی جرائد تک محدود نہیں رہی بلکہ سوشل میڈیا پر بھی اس کا اظہار ہو رہا ہے۔ لوگ کتابوں، شاعری اور دیگر ادبی تخلیقات پر اپنی رائے دیتے ہیں اور یوں ایک نیا تنقیدی ماحول پیدا ہو رہا ہے۔ یہ ماحول اگرچہ غیر رسمی ہے، مگر اس میں ایک جمہوری روح موجود ہے جو ادب کو ایک وسیع تر دائرے میں لے جاتی ہے۔

پاپ کلچر کے اثرات صرف زبان تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے اردو کے موضوعات اور اظہار کے انداز کو بھی بدل دیا ہے۔ فلم، موسیقی، فیشن اور دیگر ثقافتی عناصر نے اردو کے بیانیے کو ایک نئی جہت دی ہے۔ خاص طور پر موسیقی کے میدان میں اردو نے ایک نئی زندگی حاصل کی ہے۔ جدید گیت، ریپ اور فیوژن موسیقی نے اردو کو ایک نئی نسل کے قریب کر دیا ہے۔ اس موسیقی میں جو زبان استعمال ہوتی ہے، وہ سادہ، براہِ راست اور جذباتی ہوتی ہے، جو نوجوانوں کے تجربات کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ڈیجیٹل میڈیا نے اردو کو جغرافیائی حدود سے آزاد کر دیا ہے۔ اب اردو صرف ایک مخصوص خطے کی زبان نہیں رہی بلکہ ایک عالمی زبان کے طور پر سامنے آ رہی ہے۔

دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگ اردو میں لکھتے، بولتے اور ایک دوسرے سے جڑتے ہیں۔ اس عالمی سطح پر پھیلاؤ نے اردو کو ایک نئی شناخت دی ہے اور اس کے امکانات کو مزید وسیع کر دیا ہے۔ اس تمام تر ترقی کے باوجود کچھ بنیادی مسائل اب بھی موجود ہیں۔ زبان کے معیار کا مسئلہ سب سے اہم ہے، کیونکہ ڈیجیٹل آزادی کے باعث ہر طرح کا مواد بغیر کسی فلٹر کے سامنے آ رہا ہے۔ اس میں درست اور غلط دونوں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ زبان کے صحیح املا اور قواعد کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، جو طویل المدت بنیادوں پر ایک مسئلہ بن سکتا ہے۔

> **اردو شاعری پر بھی ڈیجیٹل میڈیا اور پاپ کلچر کے اثرات نمایاں ہیں۔ کلاسیکی غزل، جو علامتوں، استعارات اور تہذیبی نزاکت سے بھرپور ہوتی تھی، اب ایک نئے انداز میں سامنے آ رہی ہے۔ جدید شاعر اپنی شاعری میں براہِ راست زبان، روزمرہ کے مسائل اور سادہ اظہار کو ترجیح دے رہا ہے۔ یہ تبدیلی خاص طور پر نوجوان شعرا میں زیادہ واضح ہے، جو اپنے تجربات کو پیچیدہ علامتی انداز کے بجائے سادہ اور فوری انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس سے شاعری کا دائرہ وسیع ہوا ہے اور وہ زیادہ لوگوں تک پہنچ رہی ہے۔**

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر نئی تبدیلی کے ساتھ ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں، اور وقت کے ساتھ ان کا حل بھی نکل آتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان تبدیلیوں کو سمجھیں اور ان کے مثبت پہلوؤں کو فروغ دیں۔ اردو زبان کے لیے یہ ایک ایسا موقع ہے جسے اگر صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو یہ زبان ایک نئے عروج تک پہنچ سکتی ہے۔

اس پورے منظرنامے کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ڈیجیٹل میڈیا اور پاپ کلچر نے اردو زبان و ادب کو محض سطحی تبدیلیوں تک نہیں بلکہ اس کی فکری بنیادوں تک متاثر کیا ہے۔ یہ اثرات نہ تو مکمل طور پر مثبت ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر منفی، بلکہ ان میں ایک پیچیدہ توازن موجود ہے جو زبان کے ارتقا کا فطری حصہ ہے۔ اس مرحلے پر یہ سوال نہایت اہم ہو جاتا ہے کہ آیا یہ تبدیلیاں اردو کی اصل روح کو متاثر کر رہی ہیں یا اسے ایک نئی زندگی عطا کر رہی ہیں۔

اگر ہم اس سوال کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی اصل روح اس کی لچک اور اس کی تخلیقی صلاحیت میں مضمر ہوتی ہے۔ اردو نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ مختلف ثقافتوں، زبانوں اور معاشرتی رجحانات کو اپنے اندر سمویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان کبھی جامد نہیں رہی بلکہ ہر دور میں ایک نئی صورت اختیار کرتی رہی ہے۔ موجودہ ڈیجیٹل عہد میں بھی یہی عمل جاری ہے، مگر اس کی رفتار اور وسعت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس تیز رفتار تبدیلی نے اردو کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں اسے اپنے ماضی کی روایت اور حال کے تقاضوں کے درمیان ایک توازن قائم کرنا ہے۔

ڈیجیٹل میڈیا کے اثرات کو اگر ایک وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو یہ محض ایک تکنیکی تبدیلی نہیں بلکہ ایک ثقافتی انقلاب ہے۔ اس انقلاب نے اظہار کے ذرائع کو جمہوری بنا دیا ہے، جہاں اب ہر فرد کو اپنی آواز بلند کرنے کا موقع حاصل ہے۔ اردو کے لیے یہ ایک غیر معمولی موقع ہے، کیونکہ اب یہ زبان کسی خاص جغرافیائی یا سماجی حد تک محدود نہیں رہی بلکہ ایک عالمی سطح پر پھیل چکی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے اردو بولنے والے افراد اب ایک دوسرے سے براہِ راست جڑ سکتے ہیں، اپنے خیالات کا تبادلہ کر سکتے ہیں اور ایک مشترکہ لسانی و ثقافتی شناخت کو فروغ دے سکتے ہیں۔

اس عالمی پھیلاؤ نے اردو کے لیے نئے امکانات پیدا کیے ہیں۔ اب اردو میں نہ صرف روایتی ادب تخلیق ہو رہا ہے بلکہ نئے موضوعات، نئے اسالیب اور نئے

بیانیے بھی سامنے آ رہے ہیں۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے ان تخلیقات کو فوری طور پر ایک وسیع سامعین تک پہنچانے کا ذریعہ فراہم کیا ہے۔ اس عمل نے اردو ادب کو ایک نئی توانائی دی ہے، جہاں تخلیق اور ترسیل کے درمیان فاصلے تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ ایک اہم مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا ہے کہ معیار اور مقدار کے درمیان توازن کیسے قائم رکھا جائے۔ جب ہر شخص کو اظہار کا موقع ملتا ہے تو لازمی طور پر مختلف سطحوں کی تحریریں سامنے آتی ہیں۔ اس صورت حال میں یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اعلیٰ معیار کی تخلیقات عام اور سطحی مواد کے ہجوم میں گم نہ ہو جائیں۔ اس مسئلے کا حل صرف یہی ہے کہ ادبی اور تعلیمی ادارے اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور معیاری ادب کی ترویج کے لیے مؤثر اقدامات کریں۔ تعلیم کا شعبہ اس حوالے سے نہایت اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر اردو کو جدید تقاضوں کے مطابق پڑھایا جائے اور طلبہ کو ڈیجیٹل ذرائع کے مثبت استعمال کی تربیت دی جائے، تو یہ زبان نہ صرف اپنی بقا برقرار رکھ سکتی ہے بلکہ ایک نئی ترقی کی راہ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نصاب میں جدید لسانی رجحانات، ڈیجیٹل ادب اور نئی اصناف کو شامل کیا جائے تاکہ طلبہ زبان کو ایک زندہ اور متحرک حقیقت کے طور پر سمجھ سکیں۔

اسی طرح ادبی تنظیموں اور تحقیقی اداروں کو بھی چاہیے کہ وہ ڈیجیٹل میڈیا کے ذریعے اردو کے فروغ کے لیے کام کریں۔ آن لائن جرائد، ڈیجیٹل لائبریریاں اور ادبی پلیٹ فارمز اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اگر ان وسائل کو مؤثر طریقے سے استعمال کیا جائے تو اردو ادب کو ایک نئی جہت دی جا سکتی ہے۔ پاپ کلچر کے اثرات کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ بعض حلقوں میں اسے سطحی اور غیر سنجیدہ سمجھا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ پاپ کلچر نے اردو کو ایک نئی نسل سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ موسیقی، فلم اور سوشل میڈیا کے ذریعے اردو ایک ایسے دائرے میں داخل ہوئی ہے جہاں اس کے سامع اور قاری کا دائرہ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ اس عمل نے اردو کو ایک نئی عوامی طاقت عطا کی ہے، جسے مثبت انداز میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ڈیجیٹل میڈیا کے منفی اثرات سے آنکھیں نہ چرائیں۔ املا کی خرابی، سطحی اظہار اور غلط انتساب جیسے مسائل زبان کے معیار کو متاثر کر رہے ہیں۔ ان مسائل کا حل صرف تنقید میں نہیں بلکہ تربیت اور شعور میں ہے۔ اگر صارفین کو زبان کے درست استعمال کی اہمیت کا احساس دلایا جائے تو یہ مسائل بڑی حد تک کم ہو سکتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے مستقبل کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ ہم اس تبدیلی کو کس طرح سمجھتے اور استعمال کرتے ہیں۔ اگر ہم اسے محض ایک خطرہ سمجھ کر نظر انداز کر دیں تو ہم ایک بڑے موقع سے محروم ہو جائیں گے۔ لیکن اگر ہم اسے ایک موقع کے طور پر دیکھیں اور اس کے مثبت پہلوؤں کو فروغ دیں تو اردو ایک نئے عروج تک پہنچ سکتی ہے۔

یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ زبان کی بقا صرف اس کے ماضی پر انحصار نہیں کرتی بلکہ اس کے حال اور مستقبل پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ اردو کی تاریخ جتنی شاندار ہے، اس کا مستقبل بھی اتنا ہی روشن ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ہم اسے نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھال سکیں۔ ڈیجیٹل میڈیا نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا ہے کہ ہم اردو کو ایک عالمی زبان کے طور پر متعارف کرائیں اور اسے نئی نسل کے قریب لائیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ڈیجیٹل میڈیا اور پاپ کلچر نے اردو زبان و ادب کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں اسے ایک طرف اپنی روایت کو محفوظ رکھنا ہے اور دوسری طرف جدید تقاضوں کو بھی قبول کرنا ہے۔ یہ توازن ہی اس کی اصل طاقت بن سکتا ہے۔ اگر اردو اس توازن کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو وہ نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ ایک نئی قوت کے ساتھ ابھرے گی۔

آخرکار یہ کہنا بجا ہوگا کہ اردو اب محض ماضی کی ایک یادگار نہیں رہی بلکہ حال کی ایک زندہ حقیقت اور مستقبل کی ایک روشن امید بن چکی ہے۔ ڈیجیٹل اسکرین پر اس کی موجودگی، آوازوں میں اس کی گونج اور تصویروں میں اس کی جھلک اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ زبان وقت کے ساتھ چلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی صلاحیت اس کی بقا کی ضمانت ہے اور یہی اس کی اصل قوت بھی۔

ڈیجیٹل میڈیا کے اثرات کو اگر وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو یہ محض ایک تکنیکی تبدیلی نہیں بلکہ ایک ثقافتی انقلاب ہے۔ اس انقلاب نے اظہار کے ذرائع کو جمہوری بنا دیا ہے، جہاں اب ہر فرد کو اپنی آواز بلند کرنے کا موقع حاصل ہے۔ اردو کے لیے یہ ایک غیر معمولی موقع ہے، کیونکہ اب یہ زبان کسی خاص جغرافیائی یا سماجی حد تک محدود نہیں رہی بلکہ عالمی سطح پر پھیل چکی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے اردو بولنے والے افراد اب ایک دوسرے سے براہِ راست جڑ سکتے ہیں، اپنے خیالات کا تبادلہ کر سکتے ہیں اور ایک مشترکہ لسانی و ثقافتی شناخت کو فروغ دے سکتے ہیں۔

مآخذ و مصادر

1. گوپی چند نارنگ، اردو لسانیات اور اسلوبیات، نئی دہلی۔
2. جمیل احمد، ڈیجیٹل عہد اور اردو کا مستقبل۔
3. رفیع الدین ہاشمی، اردو ادب کی تاریخ اور جدید رجحانات۔
4. بی بی سی اردو، 'سوشل میڈیا اور اردو زبان کے بدلتے رجحانات' (آن لائن رپورٹ)۔
5. ریختہ (Rekhta) ویب سائٹ، اردو ادب اور جدید رجحانات سے متعلق مضامین۔
6. David Crystal. Language and the Internet، کیمبرج یونیورسٹی پریس۔

Dr. Nadeem Ahmad
Assistant Professor
Department of Urdu, Kirori Mal College
University of Delhi, India-110007
Mob: 9136162160
Email: nadeemahmad_126@yahoo.co.in

حکیم نجم الغنی خاں نجمی رامپوری

استعارہ: طرفین اور وجہ جامع

یاد رکھو کہ استعارے میں مشبہ کو بعینہ مشبہ بہ ٹھہرا لیتے ہیں، یعنی بہادر کو بعینہ شیر سمجھ لیتے ہیں۔ مشبہ بہ خواہ مذکور ہو جیسے استعارہ بالتصریح میں مثلاً شیر کہیں اور اس سے بہادر مراد ہو خواہ مشبہ بہ متروک ہو اور مشبہ مذکور ہو اور وہ شے کہ مشبہ بہ سے خصوصیت رکھتی ہو اس کو مشبہ کے واسطے ثابت کریں جیسے استعارہ بالکنایہ میں، جس کا دوسرا نام استعارہ مکنیہ بھی ہے۔

علمائے فن بلاغت کا اختلاف ہے اس میں کہ استعارہ کون سا مجاز ہے، آیا لغوی ہے یا عقلی یہاں عقلی سے مراد یہ ہے کہ ایک امر عقلی میں تصرف کیا گیا ہو۔ جمہور کا یہ مذہب ہے کہ استعارہ مجاز لغوی ہے یعنی وہ ایسا لفظ ہے کہ جس معنی کے واسطے بنایا گیا ہے اس معنی کے غیر میں مستعمل ہوا ہے مشابہت کے علاقے سے۔ اور اس بات پر دلیل یہ ہے کہ ہم نے کسی آدمی کو شجاعت کی وجہ سے شیر کہا تو اس سے یہ مراد نہ ہوگی کہ ہیکل مخصوص کا استعارہ اس کے لیے ہے بلکہ مشبہ یعنی مرد شجاع کو مشبہ بہ یعنی شیر کی جنس میں بہ طریق تاویل کے داخل کر لیا جاتا ہے، اور تاویل کی یہ صورت ہے کہ مشبہ بہ کے افراد کو دو قسم پر مقرر کیا جاتا ہے۔

(1) ایک قسم متعارف و مشہور ہے یعنی جانور، درندہ جو نہایت شجاعت کے ساتھ ہیکل مخصوص میں پایا جاتا ہے۔

(2) دوسری قسم غیر متعارف اور وہ ایسا شیر ہے کہ جس کو درندۂ معروف کی سی شجاعت حاصل ہے لیکن اس خاص ہیکل میں ہو کر حاصل نہیں۔ مرد شجاع اسی قبیل سے ہے مگر لفظ شیر اصل لغت میں قسم دوم کے لیے موضوع نہیں ہے بلکہ قسم اول کے لیے موضوع ہوا ہے پس اس لفظ کا استعمال قسم ثانی میں بہ اعتبار مجاز کے ہے اور یہ اطلاق اس شے پر ہے جو معنی لغوی کی غیر ہے۔ پس مجاز لغوی ہوا اور صحیح یہی مذہب ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ وہ مجاز عقلی ہے۔ پس استعارہ امر عقلی میں تصرف کرنے کا نام ہے اس لیے کہ جب کسی کو شیر کہتے ہیں تو اس کو بعینہ شیر (جانور درندہ) ٹھہرا لیتے ہیں نہ مثل شیر کے۔ اس صورت میں گویا شیر کے لفظ کا وہ شخص موضوع لہ ہو ا۔ پس یہ دعوے کرنا عقل سے تعقل رکھتا ہے، نہ لغت سے۔ حاصل یہ ہے کہ زید واقع میں شیر نہ تھا اور اس کو اپنے نزدیک شیر ٹھہرا لیا ہے، اور جو چیز کہ واقع میں نہ ہو اس کو واقعی ٹھہرا لینے ہی کو مجاز عقلی کہتے ہیں۔ پس استعارہ مجاز لغوی نہ ہوا بلکہ مجاز عقلی ہوا۔ اگر مشبہ کو بعینہ مشبہ بہ نہ ٹھہراتے ہوں تو آتش کے اس شعر میں معشوق کا کذب کیسے ثابت ہو۔

وعدۂ شب نہ کر اے ماہ لقا، جھوٹھ نہ بول
جلوہ گر رات کو خورشید کہاں ہوتا ہے؟

اس مثال سے مقصود یہ ہے کہ اگر قائل معشوق کو بعینہ خورشید نہ سمجھ لیتا تو معشوق کی وعدہ خلافی اور دروغ گوئی اس جگہ صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ جلوہ گر ہونا ایسے آدمی کا کہ جو حسن میں مشابہت خورشید سے رکھتا ہو شب میں ناممکن نہیں ہے بلکہ طلوع خورشید ہی کا ناممکن ہے۔

بدھ سنگھ قلندر

جس جگہ خورشید ہی طالع نہ ہو
روسیہ روزوں کا دن اور رات کیا

یہاں خورشید معشوق سے استعارہ ہے اور قائل نے معشوق کو بعینہ سورج سمجھ لیا ہے۔ اسی طرح ناسخ کی اس رباعی میں خدا اور بت کا مقابلہ درست نہ ہو سکتا۔

رباعی!

ہے جسم مرا اور نہ جاں ہے باقی
تربت میں نہ کوئی استخواں ہے باقی
کرتا ہے خدا تو امتحاں تادم زیست
پر بت کا ہنوز امتحاں ہے باقی

مومن

دشمن مومن ہی رہے بت سدا
مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

ناسخ

وقت بے وقت آ گیا ہے بیشتر وہ آفتاب
ہو گئی ہے بارہا شام شب دیجور صبح

اسی طرح اس شعر میں تعجب ثابت نہ ہو سکتا کہ تلوار کی تعریف میں ہے۔

واں شور تھا پیدا مہ نو سے مَہ نو ہے
یاں غل تھا، جدا شمع سے یہ شمع کی لو ہے

اسی طرح امانت کے اس شعر میں۔

فلک یہ تو ہی بتادے کہ حسن و خوبی میں
زیادہ تر ہے ترا چاند یا ہمارا چاند

اگر قائل معشوق کو بعینہ چاند نہ سمجھ لیتا تو مقابلہ دونوں چاندوں کا درست نہ ہوتا۔

محققین نے اس مذہب کو اس طرح رد کیا ہے کہ مشبہ کو بعینہ مشبہ بہ ٹھہرا لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مشبہ موضوع لہ ہو جائے کیونکہ یہ امر ظاہر ہے کہ لفظ خورشید جرم روشن معروف کے لیے بنایا گیا ہے اور شخص حسین کے معنی میں استعمال کر لیا گیا ہے اور تعجب کرنا اس لیے ہے کہ گویا مشابہت کو قطعاً فراموش کیا ہے تا کہ مبالغہ کما حقہ ادا ہو جائے۔ یہی حال اور امثلہ کا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ استعارہ مجاز لغوی ہے یعنی موضوع لہ کے غیر میں استعمال کیا گیا ہے۔

حسن التوصل الی صناعۃ الرسل کے مؤلف نے کہا ہے کہ استعارہ اسے کہتے ہیں کہ تشبیہ میں مبالغے کی غرض سے حقیقت کے معنی کا کسی چیز میں ادعا کرنا اور مشبہ کے ذکر کو لفظاً یا تقریراً ترک کر دینا۔ دوسری عبارت میں استعارہ اسے کہتے ہیں کہ تشبیہ میں مبالغے کی غرض سے ایک چیز کو دوسری چیز کر دینا یا ایک چیز کو دوسری چیز کے واسطے کر دینا۔ پس اگر کوئی یوں کہے کہ میں نے شیر کو دیکھا اور مراد اس کی شیر سے مرد شجاع ہو تو یہ استعارہ ہے، اور اگر یوں کہے کہ زید شیر ہے تو یہ استعارہ نہ ہوگا اس لیے کہ اس وقت لفظ میں ایک ایسی چیز ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بعینہ شیر نہیں ہے پس مبالغہ حاصل نہ ہوگا۔ یہاں حرف تشبیہ محذوف ہے اور اس قسم کو تشبیہ مضمر الاداۃ کہتے ہیں۔ تشبیہ مضمر الاداۃ میں اور استعارے میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر میں اداۃ تشبیہ کا ظاہر کرنا درست ہے اور آخر الذکر میں درست نہیں، اس لیے کہ استعارے میں مستعار لہ کا ذکر بالکل متروک ہوتا ہے نہ لفظاً مذکور ہوتا ہے نہ تقدیراً کیونکہ اس کے اظہار سے استعارے کی خوبی جاتی رہتی ہے۔ پس صرف مستعار منہ کے ذکر پر کفایت کرتے ہیں، بر خلاف تشبیہ مضمر الاداۃ کے کہ اس میں مشبہ اور مشبہ بہ مذکور ہوتے ہیں۔ مثلاً زید شیر ہے۔ پس استعارے میں حرف تشبیہ کے اظہار سے کلام پایۂ فصاحت و بلاغت سے گر جاتا ہے اور تشبیہ مضمر الاداۃ میں فصاحت و بلاغت میں فرق نہیں آتا، بلکہ ذکر کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں چنانچہ زید شیر ہے اور زید مثل شیر کے ہے ان دونوں ترکیبوں میں کوئی فرق نہیں۔

سوال جو فرق تم نے بیان کیا یہ مسلم نہیں بلکہ فرق کا مدار حرف تشبیہ پر ہے جس میں حرف تشبیہ مذکور نہ ہوگا وہ استعارہ ہے اور جس میں مذکور ہوگا وہ تشبیہ ہے اور اس تقدیر پر زید شیر ہے استعارہ ہے اور زید مثل شیر کے ہے تشبیہ ہے۔

محققین نے اس مذہب کو اس طرح رد کیا ہے کہ مشبہ کو بعینہ مشبہ بہ ٹھہرا لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مشبہ موضوع لہ ہو جائے کیونکہ یہ امر ظاہر ہے کہ لفظ خورشید جرم روشن معروف کے لیے بنایا گیا ہے اور شخص حسین کے معنی میں استعمال کر لیا گیا ہے اور تعجب کرنا اس لیے ہے کہ گویا مشابہت کو قطعاً فراموش کیا ہے تا کہ مبالغہ کما حقہ ادا ہو جائے۔ یہی حال اور امثلہ کا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ استعارہ مجاز لغوی ہے یعنی موضوع لہ کے غیر میں استعمال کیا گیا ہے۔

جواب اگر اس ترکیب کو کہ زید شیر ہے تشبیہ مضمر الاداۃ قرار نہ دیا جائے گا تو معنی مستحیل ہو جائیں گے اس لیے کہ زید بعینہ شیر نہیں بلکہ شجاعت میں شیر کی طرح ہے۔ پس اداۃ تشبیہ کو مقدر ماننا ضرور ہوا تا کہ معنی میں استحالہ نہ پڑے۔ اگر چہ اداۃ تشبیہ کی تقدیر استعارے میں بھی لابد ہے لیکن اس میں اس کا اظہار درست نہیں بہ خلاف تشبیہ کے اس میں اداۃ کا اظہار درست ہے۔

مثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر میں اسی طرح لکھا ہے اور توضیح کے مؤلف نے استحالے کی وجہ علمائے بیان سے جو کچھ سمجھی ہے وہ یہ ہے کہ استعارہ ایسی چیز ہے جو اسم جنس جامد میں جاری نہیں ہوتا مثلاً زید شیر ہے استعارہ نہیں کیونکہ اس صورت میں حقائق اشیا کا انقلاب لازم آتا ہے، اور وہ یہاں یہ ہے کہ زید شیر ہے کہنے سے انسان کی حقیقت شیر کی حقیقت سے بدل جاتی ہے۔ پس مثال مذکور تشبیہ کی قسم سے ہے، جس میں حرف تشبیہ مضمر ہے۔ البتہ مشتقات میں جاری ہوتا ہے جیسے میر حسن تسکین کے اس شعر میں۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

(یعنی نقش پا کی شوخی دلالت کرتی ہے) جرأت کے شعر میں بھی۔

میاں جرأت کسی پر تم نہیں عاشق! نہ مانوں میں
کہے دیتی ہے خاموشی، عبث صاحب مکرتے ہیں

(یعنی خاموشی دلالت کرتی ہے) بالاتفاق استعارہ ہے کیونکہ یہاں استعارہ اسم جنس میں نہیں اور پہلی مثال میں اسم جنس میں تھا۔ پس دوسری اور تیسری مثال میں قلب حقائق لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں حقیقت کے لیے وصف کا ثابت کرنا مقصود ہے جو اس کے لیے ثابت نہ تھا اور اس قول میں نظر ہے اس لیے کہ کہنے کا وصف نقش پا اور خاموشی کے لیے ثابت کرنے میں بھی جو استحالہ ہے وہ انسان کے لیے اسدیت ثابت کرنے سے کم نہیں۔ اس کا نام خواہ قلب حقائق رکھیں یا نہ رکھیں۔ علاوہ اس کے محققین کے نزدیک قلب حقیقت یہ ہے کہ واجب و ممکن و ممتنع میں سے ایک دوسرے کے ساتھ بدل جائے اور اس میں شک نہیں کہ نقش پا اور خاموشی کے لیے گویائی کا ثبوت ممتنع ہے۔ پس ان کو کہنے والا قرار دینا ممتنع کو ممکن بنانا ہے، اور زید شیر ہے اور میں نے شیر کو تیر اندازی کرتے ہوئے دیکھا ان دونوں قولوں میں سے پہلے کو تشبیہ اور دوسرے کو استعارہ ثابت کرنے کے لیے جو علمائے بیان نے یہ توجیہ کی ہے کہ دوسرے قول میں اگرچہ استحالہ ہے لیکن وہ غیر مقصود ہے کیونکہ مقصود یہاں دیکھنا ہے۔ پس امر مستحیل کا دعویٰ قصداً نہ ہوگا، بہ خلاف پہلے قول کے کہ اس میں زید پر شیر کے حمل کرنے سے امر مستحیل کا دعویٰ قصداً ہوتا ہے۔ یہ فرق بالکل وہی ہے کیونکہ جس کلام

میں امر محال ہو، خواہ وہ محال مقصود ہو یا غیر مقصود، وہ کلام ہر طرح باطل ہے۔ پس امر محال کے ایک جگہ مقصود اور دوسری جگہ غیر مقصود ہونے کا فرق نکالنا عقل ودانش سے بعید ہے، اور یہ کہنا بھی خلاف تحقیق ہے کہ چونکہ امر محال وہاں مقصود نہیں ہے اس لیے اس کو استعارہ مانا گیا ہے کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ استعارہ ایسے امر محال کو شامل ہوتا ہے جو مقصود ہوتا ہے مثلاً انیس بہادر کی تعریف میں کہتے ہیں۔

پیاسا وہ کوئی اور ہے اس قتل کے بن میں
اس شیر کی شمشیر کا غل تھا ابھی رن میں

اور ظفر معشوق کی شان میں کہتے ہیں۔

میں نے پوچھا اس پری سے کیا ہو احسن وشباب
ہنس کے بولا وہ صنم شان خدا تھی میں نہ تھا

دیکھو یہاں امر محال مقصود بھی ہے اور پھر استعارہ بھی ہے۔ ورنہ ہر جگہ امر محال کا دعویٰ کرنا ناجائز ہوتا ہے، کیونکہ اکثر اغراض اور اعتبارات لطیفہ کی وجہ سے اس کا دعویٰ جائز ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ اس بات کا کوئی قرینہ موجود ہو کہ واقع میں اس کا ثبوت مقصود نہیں ہے۔

اور علامہ تفتازانی نے تلویح حاشیہ توضیح میں لکھا ہے کہ علمائے بیان کے نزدیک استعارہ یہ ہے کہ مشبہ بہ کو مشبہ میں استعمال کریں اور کلام مشبہ کے ذکر سے خالی ہو اور قرینہ نہ ہونے کے وقت میں مشبہ بہ کے ارادہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہاں تک کہ اگر مشبہ لفظاً مذکور ہو جیسے اس مثال میں کہ زید شیر ہے خواہ تقدیراً مذکور ہو مثلاً کوئی پوچھے کہ زید کون ہے تو جواب دیں کہ شیر ہے، استعارہ نہیں ہے کیونکہ زید پر شیر کا حمل ممتنع ہے اس لیے یہاں حرف تشبیہ کا محذوف ماننا واجب ہے اور مبتدا کی خبر ہونے وغیرہ امورات کا علمائے بیان کے نزدیک کوئی لحاظ نہیں، اور اس مثال میں کہ اس کے نقش پا کی شوخی کہے دیتی ہے یا خاموشی کہے دیتی ہے قطعاً استعارہ ہے اس لیے کہ یہاں مشبہ بالکلیہ متروک ہے اور وہ دلالت کا لفظ ہے جس کی تشبیہ کہنے کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ پس اس مثال کو اس مثال سے یعنی زید شیر ہے سے کوئی تعلق نہیں۔

مجمع الصنائع کے مؤلف نے کہا ہے کہ یہ بھی استعارے کے قبیل سے ہے کہ غیر ذوی العقول سے خطاب کریں اور شعرا جو مناظرات ان میں باندھتے ہیں جیسے مناظرہ تلوار اور قلم کا اور عقل وعشق کا اور گل وبل

استعارہ اور کذب میں یہ فرق ہے کہ استعارے کی بنا تاویل پر ہے یعنی مشبہ کے مشبہ بہ کی جنس سے ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور اس میں اس بات کا قرینہ قائم ہوتا ہے کہ یہاں معنی موضوع لہ مراد نہیں ہیں اور کذب میں تاویل وقرینہ نہیں ہوتا بلکہ جھوٹا آدمی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے ظاہر قول کی صحت سامع کے نزدیک ثابت کرے بہ خلاف استعارے کے کہ اس میں اس بات پر قرینہ قائم کیا جاتا ہے کہ یہاں ظاہر کے خلاف مراد ہے۔

(شراب) کا اور عدل وانصاف کا یہ سب استعارے میں داخل ہے مگر اس میں تامل ہے اس لیے کہ استعارے کا مبنیٰ تشبیہ پر ہے اور وہ یہاں نہیں۔

استعارہ اور کذب میں یہ فرق ہے کہ استعارے کی بنا تاویل پر ہے یعنی مشبہ کے مشبہ بہ کی جنس سے ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور اس میں اس بات کا قرینہ قائم ہوتا ہے کہ یہاں معنی موضوع لہ مراد نہیں ہیں اور کذب میں تاویل وقرینہ نہیں ہوتا بلکہ جھوٹا آدمی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے ظاہر قول کی صحت سامع کے نزدیک ثابت کرے بہ خلاف استعارے کے کہ اس میں اس بات پر قرینہ قائم کیا جاتا ہے کہ یہاں ظاہر کے خلاف مراد ہے۔

استعارے میں مشبہ بہ کے معنی کو مستعار منہ کہتے ہیں اور اس لفظ کو جو مشبہ بہ کے معنی پر دلالت کرے مستعار کہتے ہیں اور مشبہ کے معنی کو مستعار لہ کہتے ہیں اور وجہ شبہ کو استعارہ کی بحث میں وجہ جامع کہتے ہیں جیسے اس مثال میں۔

مذاق

خرام ناز سے اوبت نہ آنا میرے مرقد پر
تری ٹھوکر میں ہے انداز اعجاز مسیحائی

لفظ بت اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ یہاں بت سے معشوق مراد ہے، اور علاقہ تشبیہ کا ہے یعنی سب سنگ دلی کے معشوق کو بت کہا گیا۔ اس مثال میں بت یعنی صنم جس کی کفار2 عبادت کرتے ہیں اور جو اکثر پتھر کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی مستعار منہ ہیں یعنی ان سے مانگا ہوا یعنی وہ لفظ مستعار ان سے مانگ کر لائے ہیں کیونکہ واضع نے لفظ بت کو انہی معنی کے واسطے وضع کیا تھا اور خود لفظ بت مستعار ہے یعنی مانگا ہوا کیونکہ بت اصل میں خاص ہے اس چیز کے واسطے جس کی کفار عبادت کرتے ہیں اور جب معشوق کے معنی میں کہا گیا تو گویا اس لفظ کو اس چیز سے مانگ لیا اور معنی معشوق کے یعنی شخص خاص مستعار لہ ہے۔ یعنی اس کے واسطے مانگا ہوا کیونکہ لفظ بت کا معشوق کے لیے مانگا گیا ہے اور معشوق کے لفظ کا کچھ نام نہیں اور وجہ جامع وہ سبب ہے جس سے علاقہ تشبیہ کا پایا گیا اور وہ سنگ دلی ہے۔ پس اتقان میں جو سیوطی نے کہا ہے کہ لفظ مشبہ کو مستعار منہ کہتے ہیں یہ صحیح نہیں۔ اسی طرح ان کا معنی جامع کو مستعار لہ قرار دینا بھی صحت کے خلاف ہے۔

استعارہ کی بحث کو ہم پانچ چمنوں میں بیان کرتے ہیں پہلے چمن میں طرفین استعارہ یعنی مستعار منہ ومستعار لہ کا مذکور ہے، دوسرے چمن میں وجہ جامع کا ذکر ہے، تیسرے چمن میں ان تینوں کا مجموعی طور پر بیان ہے، چوتھے چمن میں استعارے کی قسموں کی تفصیل ہے، پانچویں چمن میں استعارے کی حسن و خوبی کے شرائط کا حال ہے۔

پہلا چمن طرفین: استعارہ کے بیان میں

طرفین استعارہ دو چیزیں ہیں۔ ایک مستعار منہ دوسرے مستعار لہ۔ پس اگر مستعار منہ اور مستعار لہ اس قسم کے ہوں گے کہ ان کا باہم جمع ہونا ایک جگہ ممکن ہو تو اس کو استعارہ وفاقیہ کہتے ہیں کیونکہ دونوں طرفوں میں موافقت اور اتفاق ہوتا ہے، جیسے:

میر

اندھے ہیں جہاں کے لوگ سارے اے میر
سوجھے نہ جسے، اسے کہتے ہیں بصیر

جاہل کا استعارہ اندھے سے کیا ہے۔ نا بینائی مستعار منہ اور جہالت مستعار لہ ہے اور جہالت و نا بینائی کا ایک شخص میں جمع ہونا ممکن ہے کیونکہ جائز ہے کہ جاہل ہو اور نا بینا ہو۔

حالی

وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے
تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے

ان لوگوں کا جو آتش زبانی اور شیوا بیانی سے عاری تھے گونگے کے ساتھ استعارہ کیا ہے اور عدم فصاحت و بلاغت اور گونگا ہونا ایک شخص میں جمع ہو سکتا ہے۔

ولہ

ترقی کا جس دم خیال ان کو آیا
اک اندھیر تھا ربع مسکوں پہ چھایا

جہالت کا استعارہ اندھیرے سے کیا ہے اور ایک جگہ اندھیر کا اور جہالت کا جمع ہونا جائز ہے۔

ولہ

یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا
یہ راعی نے للکار کر جب پکارا

پیغمبر کا استعارہ راعی سے کیا ہے اور ایک شخص میں راعی ہونا اور پیغمبر ہونا جمع ہو سکتا ہے چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب کے کہنے سے بکریاں چرائی تھیں۔

ولہ

مناقب سے بدلے گئے سب مثالب
ہوئے بہرہ ور روح سے ان کے قالب

کمال کا استعارہ روح سے کیا ہے اور ان دونوں چیزوں کا ایک جگہ ہونا ممکن ہے۔

ولہ

گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر
گرہ میں لیا باندھ حکم پیمبر

روشنی سے مراد علم و حکمت ہے اور ان دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا جائز ہے۔

ولہ

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی
نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی

ولہ

نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے
کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے

غفلت کا استعارہ سونے سے کیا ہے اور ہوشیاری کا جاگنے سے۔ اور ایک شخص میں غفلت اور سونا اور دونوں جمع ہونا ممکن ہے۔ اسی طرح ہوشیار ہونے اور جاگنے کا ایک شخص میں جمع ہونا ممکن ہے۔

اور اگر جمع ہونا محال ہو تو اس کو استعارہ عنادیہ کہتے ہیں کیونکہ دونوں طرفوں کا اجتماع اس میں ممتنع ہوتا ہے، جیسے کسی شخص نابینائے محض کو بہ اعتبار اس کے کمال علم و عقل کے آنکھوں والا کہیں۔ ظاہر ہے کہ اندھا ہونے اور آنکھوں والا ہونے میں باہم عناد ہے۔ ایک شخص میں یہ دونوں امر جمع نہیں ہو سکتے۔ مرزا غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں" والی رام پور نے بھی تو مرشدزادے کی شادی میں بلایا تھا یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں" باوجودے کہ مرزا موجود تھے، مگر بہ وجہ کسر نفس کے اپنے آپ کو کسی کام کے قابل نہ سمجھ کر معدوم محض کہا اور ظاہر ہے کہ موجود معدوم میں باہم تنافی ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک شخص میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اسی قبیل سے ہے انیس کا یہ شعر:

پہنچے انھیں لے کر جو وہ ظالم سر دربار
خدام نے کی عرض کہ حاضر ہیں گنہ گار

یہ ذکر صاحب زادگان حضرت مسلم کا ہے۔ وہ گنہ گار یعنی مجرم نہ تھے لیکن قتل کرنے کے واسطے لائے گئے تھے اس لیے گنہ گار کہا۔ گنہ گاری اور بے گناہی میں عناد ہے۔

اور عنادیہ کے قبیل سے ہے کہ ظرافت اور خوش طبعی اور طنز کے طور پر دو ضدوں یا دو نقیضوں کا باہم استعارہ کریں۔ ضدین اور نقیضین میں یہ فرق ہے کہ ضدین ایسی وجودی چیزوں کو کہتے ہیں کہ وہ جمع نہیں ہو سکتیں، مرتفع ہو سکتی ہیں، اور دو نقیض باہم نہ جمع ہو سکتے ہیں اور نہ مرتفع ہو سکتے ہیں، اور ان میں سے ایک وجودی ہوتا ہے، ایک عدمی، اور ایک قسم کے استعارے میں یہ وجہ ظرافت و استہزا وغیرہ کے تضاد و تناقص کو تناسب کی جگہ سمجھ لیا جاتا ہے مثلاً نامرد کو شیر یا رستم کہا جائے اور بخیل کو حاتم بولا جائے یا ظالم کا استعارہ نو شیرواں کے ساتھ کیا جائے۔ اسی قبیل سے ہے میر کے اس شعر میں آسمان کی نسبت مہربان کا اطلاق کیا جانا۔

کوئی آج سے ہے فلک مدعی کیا
ہمیشہ مرے حال پر مہرباں ہے

ولہ

گالی ہے دھول ہے یہ عزت ہے
کہیں غیرت کا سر میں کچھ ہے خیال

ذلت کا استعارہ عزت سے کیا ہے۔

میر حسن

تم ہی کچھ ایسے نہ دنیا میں جفا کار ملے
جو ملے مجھ کو سو ایسے ہی وفادار ملے

بے وفا کا استعارہ وفادار سے کیا ہے۔

حالی

شریعت ہوئی ہے نکونام ان سے
بہت فخر کرتا ہے اسلام ان سے
نہ گفتار میں ان کی کوئی خطا ہے
نہ کردار ان کا کوئی نا سزا ہے

بدنام کا استعارہ نکونام سے اور ننگ و عار کرنے کا استعارہ فخر کرنے سے اور خطا ہونے کا استعارہ خطا نہ ہونے سے اور ناسزا ہونے کا استعارہ نا سزا نہ ہونے سے کیا ہے۔

درد

اٹھ چلے شیخ جی تم مجلس رنداں سے شتاب
ہم سے کچھ خوب مدارات نہ ہونے پائی

مدارات اپنے خلاف سے استعارہ ہوا ہے۔ اسی قبیل سے ہے سودا کے اس شعر میں معقول کا لفظ:

سودا

ان کا غرض اعتراض دیکھو تو معقول ہے
بات جو معروف ہے ان پہ وہ مجہول ہے

نامعقول کا استعارہ معقول سے کیا ہے۔

ولہ

نہ ہووے کیونکہ مرا رتبہ شعر میں یاں تک
میں کیسے پیر کی کرتا ہوں اب ثنا خوانی

ہجو و مذمت کا استعارہ ثنا سے کیا ہے۔

بات ہم سے تو نہ کرنی اور غیروں سے تپاک
ہم مگر اس بزم میں آئے تھے ذلت کے لیے

بزم میں آنے سے غرض تحصیل عزت تھی اس غرض کو بہ طریق استہزا کے ذلت کے لیے آنے سے استعارہ کیا۔ جب حضرت عباس نے پانی لانے کے لیے نہر پر جانا چاہا تو حضرت زینب نے خطرے کے لحاظ سے ان

کو روکنا چاہا۔ امام حسینؑ بھی ان کا جانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس وقت حضرت عباس کی زوجہ حضرت زینب سے کہتی ہیں:

انیس

ہر وقت کبر یا سے طلب گار خیر ہوں
آگے جو کچھ سکھوں کی رضا، میں تو غیر ہوں

زوجہ غیر نہیں مگر اس وجہ سے غیر کہا کہ ان کی بات کا نہ ماننا گویا غیر سمجھنا ہے۔

حالی

قید خانوں میں جہاں کے ہے پڑا غل تیرا
جتنے قیدی ہیں تری جان کو دیتے ہیں دعا

دعا کا استعارہ بددعا کے لیے کیا ہے۔

دوسرا چمن: وجہ جامع کے بیان میں

وجہ جامع کی چار صورتیں ہیں۔

(1) وجہ جامع مستعار منہ اور مستعار لہ کے معنی کا جز ہوگی جیسے:

حالی

رجال اور اسانید کے جو ہیں دفتر
گواہ ان کی آزادگی کے ہیں یک سر

مطلب یہ ہے کہ رجال و اسانید کے دفتر ان کی آزادگی کے ثابت کرنے والے ہیں۔ پس ثابت کرنے والے کا استعارہ گواہ کے ساتھ کیا ہے اور وجہ جامع یہاں ثابت کرنا ہے اور وہ دونوں کے مفہوم میں داخل ہے۔

ولہ

مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ
پر نہ تھا کوئی شفیع ان کا کہ جو تھے بے گناہ

ولہ

ہیں انھوں کے گواہ حب وطن
در و دیوار پیرس و لندن

ولہ

تیری صناعی کا یہ سب ہے اثر
تیری قدرت پہ تیری صنع گواہ

میر

اس احوال کا رنگ رو بس ہے شاہد
جو دل میں ہے میرے سو منھ پر عیاں ہے

برق

اے پری چشم سیاہ و رخ تاباں ہے دلیل
دھوپ وہ پڑتی ہے جس سے کہ ہرن ہو کالا

یعنی چشم سیاہ اور رخ تاباں اس بات کو ثابت کرنے والے ہیں کہ دھوپ ایسی پڑتی ہے کہ جس سے ہرن کالا ہو۔ پس ثابت کرنے والے کا استعارہ دلیل سے کیا ہے اور وجہ جامع یہاں بھی ثابت کرنا ہے جو دونوں کے مفہوم میں داخل ہے۔

قدیر

تقدیر نے کی مدد شتابی
اغیار کٹے بصد خرابی

کٹنا جو موضوع ہے ان اجسام کا اتصال زائل ہونے کے لیے جن میں سے بعض بعض کے ساتھ متصل اور پیوستہ ہوں۔ اس کا استعارہ اجتماع اغیار کے متفرق ہو جانے اور ان میں سے بعض کے بعض سے جدا ہو جانے کے لیے کیا ہے، اور وجہ جامع دونوں میں اجتماع اور اتصال کا زائل ہو جانا ہے، اور یہ کٹنے اور متفرق ہو جانے کے مفہوموں میں داخل ہے۔ البتہ کٹنے کے مفہوم میں زوال اجتماع شدید ہے، اور متفرق ہونے کے مفہوم میں کم ہے کیونکہ کٹنے کے متفرق ہونے سے قوی ہونے ہی کی صورت میں یہ بات صحیح ہوتی ہے کہ متفرق ہونے کی تشبیہ کٹنے کے ساتھ دی جائے اور کٹنے کا استعارہ متفرق ہونے کے لیے کیا جائے۔ اگر کہا جائے کہ فن حکمت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جزو ماہیت شدت و ضعف کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتا، پس یہاں جزو ماہیت یعنی زوال اجتماع کیسے جامع بن سکتا ہے اور حال یہ ہے کہ جامع کے لیے مستعار منہ میں اقویٰ ہونا واجب ہے تا کہ استعارہ مبالغے کا فائدہ دے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اختلاف کا ممتنع ہونا ماہیت حقیقی میں معتبر ہے جیسے انسان و حیوان اور جو ماہیت لفظ سے مفہوم ہوتی ہے اس کا حقیقی ہونا واجب نہیں بلکہ کبھی امر اعتباری ہوتی ہے یعنی ایسے امور سے مرکب ہوتی ہے جن میں سے بعض شدت کے قابل ہوتے ہیں اور بعض ضعف کے قابل۔ اس صورت میں جامع کا طرفین کے مفہوم میں داخل ہونا اور باوجود اس کے مستعار منہ کے مفہوم میں اشد و اقوے ہونا جائز ہے۔

میر

طفل مطرب جو مرے ہاتھ آتا
چٹکیوں میں رقیب اڑ جاتا

اڑنے کا استعارہ نکل جانے کے لیے کیا ہے۔ وجہ جامع اس میں قطع مسافت ہے جو اڑنے اور نکل جانے دونوں کے مفہوموں میں داخل ہے کیونکہ نکل جانا اور اڑنا حرکت ہے جس سے مسافت قطع ہوتی ہے۔ لیکن اس قدر کہ مستعار منہ میں شدید ہے اور مستعار لہ میں بہ نسبت اس کے ضعیف۔

وجاہت جھنجھانوی

قوم کے واسطے ملکوں میں اڑے پھرتے ہیں
باوجودے کہ نہیں رکھتے ہیں پر آغا خان

جلد اور شتاب جانے کا استعارہ اڑے پھرنے کے ساتھ کیا ہے۔ وجہ جامع ان میں قطع مسافت ہے جو اڑنے اور جلد جانے کے مفہوموں میں داخل ہے کیونکہ جلد جانا اور اڑے پھرنا ایسی حرکت کو کہتے ہیں جس سے مسافت جلد قطع ہو۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اڑنا مسافت کا پروں کے ساتھ قطع کرنا ہے جلد ہو یا دیر میں اور سرعت اس کے مفہوم میں داخل نہیں بلکہ اغلباً لازم ہے، جواب اس کا یوں دیا جائے گا کہ اڑنا مسافت کو جلدی قطع کرتا ہے۔ پروں کو اختیاری طور پر ہوا میں ہلانے کے ساتھ، اور یوں بھی جواب دے سکتے ہیں کہ جامع میں ملتفت الیہ فقط مسافت کا قطع کرنا ہے نہ قطع کرنا مسافت کا سرعت کے ساتھ۔

حالی

چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ
بس بہت سوے اٹھو ہوش میں آو

غافل رہنے کا استعارہ سونے کے ساتھ کیا ہے اور غفلت و بے پروائی وجہ جامع ہے، جو دونوں کے مفہوموں میں داخل ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ مستعار منہ میں شدید ہے اور بہ نسبت اس کے مستعار لہ میں ضعیف ہے۔

(2) وجہ جامع مستعار منہ اور مستعار لہ کے مفہوم کا جز نہ ہوگی جیسے منور چہرے کو آفتاب کہیں اور بہادر آدمی کو شیر کہیں۔ ظاہر ہے کہ نورانیت سورج اور خوبصورت چہرے کو عارض ہیں۔ ان کے مفہوم میں داخل نہیں۔ اسی طرح شجاعت شیر اور بہادر آدمی کو عارض ہے دونوں کے مفہوم میں داخل نہیں۔ پس جامع دونوں مثالوں میں طرفین سے خارج ہے۔

غلام امام شہید

جب چلا چاند مدینے کا سوے رب جلیل
بجھ گئی مہر درخشاں کی فلک پر قندیل

پیغمبر خدا کا استعارہ چاند کے ساتھ کیا ہے اور وجہ جامع دونوں میں خوبصورتی ہے اور یہ وجہ جامع دونوں کے مفہوموں کا جز نہیں بلکہ ان کو عارض ہے۔

انیس

ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا
ہنگام یخ وبرف و تگرگ آیا

بڑھاپے کو یخ و برگ وتگرگ کے ساتھ استعارہ کیا ہے اور وجہ جامع سفیدی ہے اور وہ دونوں کے مفہوم سے خارج ہے۔

ذوق

خواب غفلت سے ہو بیدار کہ آئی پیری
نہیں مہتاب یہ ہے روشنی صبح رحیل

مہتاب یعنی چاندنی استعارہ سفید بالوں سے ہے اور وجہ جامع سفیدی ہے اور وہ دونوں کے مفہوموں سے خارج ہے۔

گلزار نسیم

کمٹی جو تھی محرم اس قمر کی
برجوں پر سے چاندنی تھی سرکی

یہاں پستان مستعار لہ ہے اور برج مستعار منہ اور وجہ جامع دونوں میں گول اور ابھر ہونا اور وہ دونوں کے مفہوم میں داخل نہیں۔

ولہ

حاجت کے گماں سے جب ہوئی دیر
جھنجھلا کے پلنگ سے اٹھا شیر

بحر

رنڈیوں کو بھی پسند آیا ہے مردوں کا لباس
اودی اودی ٹوپیاں رکھتی ہیں سر پر چھاتیاں

چھاتی کے سروں کو اودی ٹوپی سے تشبیہ دی ہے اور وجہ جامع گولائی اور رنگ ہے اور یہ دونوں کے مفہوم سے خارج ہے یا جیسے نامرد کو روباہ کہیں، اس میں وجہ جامع بزدلی اور خوف ہے اور یہ ایک صفت ہے آدمی اور اس جانور کی ان کے مفہوم میں داخل نہیں۔

انیس

اس شان سے غازی صف جنگاہ3 میں آیا
غل تھا کہ اسد لشکر روباہ میں آیا

(3) وجہ جامع ایسی ہو کہ بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہو جیسے محبوب کے رخسارے کو چاند کہنا یا آفتاب سے استعارہ کرنا یہ بات ظاہر ہے کہ روشنی جامع ہے۔ اسی طرح معشوق کے رخسار کو گل سے استعارہ کرنے میں رنگینی جامع ہے، ایسے استعارے کو عامیہ کہتے ہیں، اس لیے کہ بہ سبب ظہور کے اس کو عامۃ الناس جانتے ہیں اور اس کو مبتذلہ بھی بولتے ہیں کیونکہ ابتذال بہت صرف کرنے میں ہے اور ایسا استعارہ بہت مستعمل ہوتا ہے اور کچھ نادر نہیں ہوتا کہ سوا ایک دو جگہ کے اور کہیں استعمال میں نہ آیا ہو۔

مسکین

اس صنم نے کیا پردے میں جہاں کو بے تاب
برملا ہوتا تو کیا جانے خدا کیا ہوتا

اس بیت میں صنم کا استعارہ معشوق کے واسطے ہے اور یہ نادر نہیں بہت مستعمل ہے اس لیے وجہ جامع اس کی بہ سبب ظہور کے سب پر ظاہر ہے4۔

نسیم

یہ سن کے اشارے سے بلایا
بادام بنفشہ کو دکھایا

آنکھ کا استعارہ بادام سے کیا ہے اور وجہ جامع دونوں میں ظاہر ہے اور بنفشہ نام ہے مالن کا۔

ولہ

طوق اس کو طلسم کا پنھایا
قمری اسے سرو نے بنایا

روح افزا پری کا استعارہ سرو کے ساتھ کیا ہے جس نے بہرام وزیرزادے کو جو اس کا عاشق تھا، طلسم کے ذریعہ سے قمری بنایا تھا اور وجہ جامع روح افزا و سرو میں موزونی قامت ہے جو ظاہر ہے۔

ولہ

اے شمع نہ سوچی گربد ونیک
رشتہ کاٹے گا تجھ سے ہر ایک

بکاؤلی کا استعارہ شمع سے کیا ہے اور وجہ جامع عیاں ہے۔

نفیس

چھپے نگاہ سے نور نگاہ زینب کے
غروب ہوگئے دو مہر و ماہ زینب کے

نور نگاہ اور مہر و ماہ زینب کے فرزندوں سے استعارہ ہے اور وجہ جامع ظاہر ہے۔

مومن

درنایاب تو کیا، خاک سے بھی منھ نہ بھرے
جس کے در پر میں کروں لولوے شاداب نثار

اس بیت میں اشعار بلیغ کا استعارہ لولوے شاداب سے کیا ہے اور وجہ جامع ظاہر ہے۔

ولہ

میرے گوہر تمام نا سفتہ
میرے یاقوت سب بدخشانی

اس شعر میں گوہر و یاقوت استعارہ اشعار سے کیا ہے اور وجہ جامع ہر شخص پر ظاہر ہے۔

ظفر

سن کے نالوں کو مرے ہوگئے پتھر پانی
سر مژگاں بھی ترا نم نہ ہوا پر نہ ہوا

پتھر سخت دل بے رحم سے استعارہ کیا ہے اور پانی ہونا استعارہ ہے ترس کھانے اور غم خواری کرنے سے اور وجہ جامع ظاہر ہے۔

غلام محمد خان رہا

شیر روباہوں کو ہم برپا کردیا تو نے فلک5
اب تو چیتا تیرا اے گردون گرداں ہو گیا

شیر استعارہ بہادر سے ہے اور روباہ نامرد سے اور وجہ جامع دونوں میں ظاہر ہے۔

نعیم

شکست چرخ سے ہے اپنے آبگینے کی
الٰہی ٹوٹے کہیں گردن اس کمینے کی

دل کا استعارہ آبگینے سے کیا ہے اور وجہ جامع دونوں میں ہر شخص پر ہویدا ہے۔

انشا

بے کلی سے ترے کچھ دل کو سروکار نہ ہو
تیری نرگس بھی الٰہی کبھی بیمار نہ ہو

آنکھ کا استعارہ نرگس سے کیا ہے اور یہ استعارہ مبتذل ہے۔

فقیر

تو نے اوبت دل کو اپنے کرلیا فولاد حیف
کچھ اثر کرتی نہیں تجھ کو مری فریاد حیف

ولہ

ہو بہار چمن حسن پہ نازاں نہ بہت
اے گل تر یہ رہے گا ترا جوبن کب تک

امجد علی اصغر

خوب رو بت کے آشنا ہیں ہم
عاشق مذہب خدا ہیں ہم

آباد

واللہ کیا ہے حسن بت پر غرور کا
بندوں کو شک ہوا ہے خدا کے ظہور کا

(4) وجہ جامع بہ وجہ نادر ہونے کے ہر ایک پر ظاہر نہ ہو سکے بلکہ بہ دقت سمجھ میں آتی ہو اور سوائے خواص کے عامۃ الناس اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں اس قسم کو استعارہ غریبہ کہتے ہیں۔

میر

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا
مے گل گوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے روووے گا

شیشے کی آواز کو ہچکی سے استعارہ کیا ہے اور وجہ جامع اس میں شیشے کے اندر سے شراب وغیرہ کا نکلنا اور رک رک کر آواز پیدا ہونا ہے اور یہ بات یکا یک خیال میں نہیں آتی[6]۔

ذوق

جس کی آواز سے ہوں روئنگٹے سوہاں کے کھڑے
وہ محبت نے دیا سلسلۂ پا ہم کو

سوہان کے دندانے ابھرے ہوئے ہونے کو روئنگٹے کھڑے ہونے سے استعارہ کیا ہے اور وجہ جامع اس میں بن مو کا اندک اندک اونچا ہو جانا ہے روئنگٹے کھڑے ہونے کے وقت چنانچہ یہ امر تجربہ اور مشاہدہ پر موقوف ہے اور اس طرح کی حالت سوہان کے اندر بعینہ پائی جاتی ہے اور خفا اس کا ظاہر ہے۔

سودا

ہوا یہ جوش میں سودا کہ میری آنکھوں سے
بجاے لعل نکلتے ہیں اب سلیمانی

جوش سودا سے سیاہ ہونے کے سبب اشک خونیں کو دانہ سلیمانی سے استعارہ کیا ہے اور سودا ایک خلط ہے اس کا رنگ سیاہ ہے اور چونکہ دانہ سلیمانی قدرے سفیدی بھی رکھتا ہے اس میں اشک رطوبت کا ہونا بھی معتبر ہے یہ بات بجز خواص کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔

میر

دم بدم رک رک کے ہے منھ سے نکل پڑتی زباں
وصف اس کا کہہ چکے فوارے یا کہنے کو ہیں[7]

فوارے کے سوراخ سے پانی کی دھار کے نکلنے کو زبان کے نکل پڑنے سے استعارہ کیا ہے وجہ جامع اس میں دھار کا کبھی نیچا ہونا کبھی اونچا ہونا کبھی رک جانا کبھی نکلنے لگنا ہے اسی طرح زبان کبھی منھ سے باہر نکل آتی ہے اور کبھی اندر چلی جاتی ہے، کبھی زیادہ نکل آتی ہے، کبھی کم نکل آتی ہے۔

کبھی استعارہ عامیہ مبتذلہ میں تصرف کرنے سے غرابت حاصل ہو جاتی ہے جیسے۔

نجانے قصد ہے کس خوں گرفتہ کا کہ رہتی ہے
علم شمشیر زہر آلودہ سر پر چشم فتان کے

ابرو کا استعارہ تیغ سے کیا ہے اور یہ استعارہ مبتذل ہے لیکن زہر آلودہ کہنے سے ایک طرح کی غرابت اس میں آ گئی کیونکہ زہر کو سبزی سے نسبت ہے اور سبزی و سیاہی میں چنداں تفاوت نہیں۔ پس ابرو کو بہ سبب سیاہی رنگ کے تیغ زہر آلودہ سے استعارہ کرنا امر غریب ہے۔

گلزار نسیم

غولوں نے بزور پھول اڑایا
اس خضر کو راستہ بتایا

تاج الملوک کے بھائیوں کو غولوں سے استعارہ کیا ہے اور چھین لینے کو اڑانے سے اور تاج الملوک کو خضر سے استعارہ کیا ہے اور تاج الملوک سے پھول چھین کر بھگا دینے کا استعارہ راستہ بتانے سے کیا ہے۔ حاصل معنی یہ ہیں کہ تاج الملوک کے بھائیوں نے زبردستی پھول اس سے چھین کر وہاں سے بھگا دیا اگرچہ استعارہ اپنے مفردات کی وجہ سے مبتذل ہے لیکن ترکیب کی وجہ سے اس میں غرابت پیدا ہو گئی ہے۔

ولہ

آنکھوں سے اس انجمن کو دیکھا
یک جا بت و برہمن کو دیکھا
لعل و گہر ایک درج میں ہے
شمس و قمر ایک برج میں ہے

تاج الملوک کا استعارہ برہمن سے کیا ہے اور بکاؤلی کا بت سے۔ اسی طرح لعل و گہر اور شمس و قمر سے ان دونوں کا استعارہ کیا ہے اور مٹھ کا استعارہ درج اور برج کے ساتھ کیا ہے اور یہ استعارے اگرچہ اپنے مفردات کے اعتبار سے مبتذل ہیں لیکن بہ سبب ترکیب کے غرابت حاصل کر لی ہے۔

ولہ

بولی وہ کہ بخت تھا زبردست
خورشید کو ذرے نے کیا پست

بکاؤلی کا استعارہ خورشید سے کیا ہے اور تاج الملوک کا ذرے سے اور یہ استعارہ اگرچہ اپنے مفردات کے اعتبار سے نادر نہیں مگر بہ سبب ترکیب کے غرابت آ گئی ہے۔

عاشق

تماشا دیکھتا ہوں میں تری قدرت نمائی کا
خدا کی شان دعویٰ ہے بتوں کو بھی خدائی کا

بتوں کا استعارہ معشوق کے لیے مبتذل ہے مگر یہ کہہ دینے سے کہ خدا کی شان بتوں کو بھی خدائی کا دعویٰ ہے کسی قدر ندرت آ گئی ہے۔

غالب

کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

ایمان کے ذکر نے بت کے استعارے میں معشوق کے لیے غرابت پیدا کر دی ہے۔

حواشی

1 دیوان ناسخ اول میں رباعیاں نہیں ہیں۔ دیوان دوم میں ہیں، اور یہ رباعی ان میں سے نہیں ہے۔ (مطبع نولکشور کانپور، 1872، ایڈیشن)

2 اس لفظ کا استعمال لازمی نہیں تھا۔ اور یہ درست بھی نہیں ہے۔ گرجا گھروں میں حضرت عیسیٰ اور جناب مریم کی شبیہیں ہیں، لیکن مسیحی فرقے کو کفار کے زمرے میں نہیں رکھا جاتا۔ اردو شاعری میں، اور کلاسیکی فارسی شاعری میں کافر اور بت، دونوں لفظ معشوق کے مردوی معنوں میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ خود اس کتاب میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔

3 مرکب لفظ جنگ گاہ ہے، لیکن میر انیس نے ایک گاف کی تخفیف کر کے جنگاہ بنایا ہے۔ جو لغات دیکھے، ان میں یہ لفظ نہیں ہے۔ اس کا اضافہ کیا جانا چاہیے۔

4 اس شعر کے ایک معنی اور بھی ہیں، اور اس کا امکان بعید نہیں کہ وہی مفہوم شاعر کا منشا ہو۔ اگر عشق حقیقی یا تصوف کا شعر مانیں تو بہت ہی مربوط خیال بہت ہی مربوط طریقے سے نظم ہوا ہے۔

5 رہا کے شعر کا پہلا مصرع رمل مثمن محذوف الآخر (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) ایک سبب خفیف زیادہ ہونے کی وجہ سے بے آہنگ ہے۔ 'شیر روباہوں کو برپا کر دیا تو نے فلک' یا متبادل 'شیر روباہوں کو ہم پا کر دیا تو نے فلک' ہو تو مصرع آہنگ میں ہوگا۔

6 حکیم مولوی نجم الغنی اس کوچے کے آدمی نہیں تھے، اس لیے قلقل مینا اور خندۂ ساغر/ خندۂ جام کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا۔ خدائے سخن نے اسی کی بات کی ہے، جو فوراً خیال میں آتی ہے۔

7 میر تقی میر کے کلیات میں کوئی غزل اس زمین میں نہیں ملی۔

■

ماخذ: بحر الفصاحت (جلد دوم)، **تالیف:** حکیم نجم الغنی خاں نجمی رامپوری، **تدوین:** کمال احمد صدیقی، **دوسری اشاعت:** 2023، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

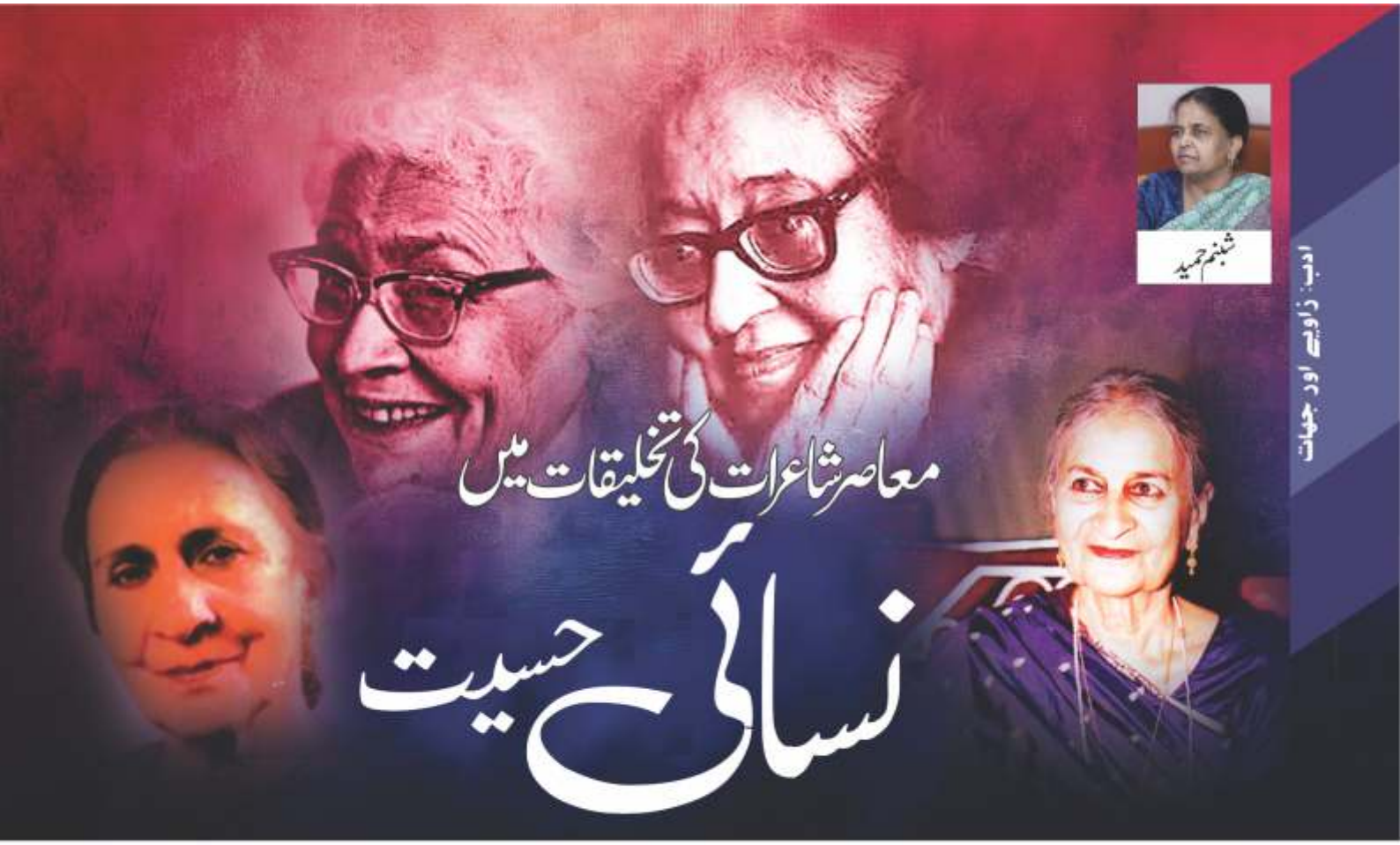

شبنم حمید

معاصر شاعرات کی تخلیقات میں

نسائی حسیت

نسائی حسیت (Feminine Sensibility) ایک ایسا تصور ہے جو محض عورت کے حیاتیاتی وجود تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ احساس، ادراک، تجربے اور اظہار کے ایک مخصوص طریقِ کار کا نام ہے۔ نسائی حسیت نہ صرف خواتین کے سماجی اور نفسیاتی تجربات سے پیدا ہوتی ہے بلکہ زبان، ثقافت، تاریخ اور طاقت کے نظاموں کے ساتھ اس کے تعلق سے بھی تشکیل پاتی ہے۔ اس لیے نسائی حسیت کو صرف عورت کے جذبات و احساسات سے تعبیر کرنا ایک سطحی عمل ہے۔ درحقیقت نسائی حسیت ایک فکری رویہ، جمالیاتی زاویۂ نظر اور تنقیدی شعور ہے جو مرد اساس بیانیے کے مقابل ایک متبادل ادراک پیش کرتا ہے۔

نسائی حسیت کی اصطلاح تانیثی مطالعے کے موضوع کے تحت آتی ہے جو عورتوں کی اقدار کو زیرِ بحث لاتی ہے۔ یہ صنفوں کی برابری پر یقین کی بنیاد پر عورتوں کے حقوق کی وکالت کرنے والے سب سے زیادہ زیرِ بحث نظریاتی بحثوں میں ایک ہے۔ عام طور پر نسائی حسیت کو عورتوں کے فطری جذبات، نرمی، محبت، شفقت، وفا، ایثار و قربانی وغیرہ سے مربوط کر کے دیکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن جدید فکری مباحث خصوصاً تانیثیت کے زیرِ اثر اس تصور کو چیلنج کیا گیا۔ نسائی حسیت کو صرف حیاتیاتی جنس کا نتیجہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے ایک ثقافتی اور فکری تشکیل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ کہ نسائی حسیت بعض اوقات مرد تخلیق کار کے یہاں بھی ظاہر ہو سکتی ہے اور بعض خواتین تخلیق کار کے یہاں بھی۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ نسائی حسیت کسی فطری جوہر کا نام نہیں بلکہ ایک تشکیل شدہ شعور ہے جو سماجی حالات، طاقت کے عدم توازن اور تاریخی محرومیوں کے تجربے سے پیدا ہوتا ہے۔

خالدہ حسین نسائی حسیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

> نسائی حسیت کی اصطلاح تانیثی مطالعے کے موضوع کے تحت آتی ہے جو عورتوں کی اقدار کو زیرِ بحث لاتی ہے۔ یہ صنفوں کی برابری پر یقین کی بنیاد پر عورتوں کے حقوق کی وکالت کرنے والے سب سے زیادہ زیرِ بحث نظریاتی بحثوں میں ایک ہے۔

''نسائی حسیت صرف یہی نہیں کہ مونث واحد متکلم کا صیغہ اپنا لیا جائے۔ گھر آنگن اور سنگھار اور برہا کی بات کی جائے۔ اوڑھنی کے رنگوں اور چوڑیوں کی چھنک کو شاعری میں ایک معتبر مقام دلوایا جائے۔ نسائی حسیت سے مراد ہے کہ عورت جس طرح زندگی کو دیکھتی اور بسر کرتی ہے وہ مرد سے مختلف ہے۔ تحقیق بتاتی ہے کہ ہر انسان وقت کو اپنے حوالے سے پہچانتا ہے۔ یعنی اس کا وقت کا تصور ذاتی اور داخلی نوعیت رکھتا ہے۔ اس طرح عورت کا وقت کے ساتھ تعلق اور زمانی احساس مرد سے مختلف ہے کیوں کہ اس کے شب و روز اور معاملات و مسائل کی نوعیت منفرد ہے۔ وہ اپنی سائیکی (جو مرہونِ منت ہے اس کی جسمانیت کی) کے حوالے سے فطرت کے تمام مظاہر کو، جن میں اس کے پانچوں حواس سے اخذ کردہ تجربہ یعنی رنگ، خوشبو، آواز، لمس اور ذائقہ شامل ہیں اپنے انداز سے محسوس کرتی ہے اس میں صدیوں کے روایتی تلازمات کا بھی دخل ہے اور حال کی تبدیلیوں اور مستقبل کی امیدوں کا تعلق بھی۔ وہ جب موسموں، رتوں رنگوں اور خوشبوؤں کا تجربہ کرتی ہے تو اس کے تلازمات میں ممتا اور بیٹی، بہن اور بیوی کی ذات بھی شامل ہے۔ مرد اس سے مختلف انداز میں سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ جب کہ عورت بے شمار کام بہ

یک وقت نمٹاتی اور ان گنت رشتوں کو قائم رکھتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ہر عورت فنکار ہے۔ یوں شعر میں عورت کی شخصیت ایک منفرد نقطۂ نظر کی صورت اختیار کرتی ہے تو اسے ہم نسائی حسیت کا نام دیں گے ورنہ محض مونث کا صیغہ استعمال کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔''

(خالدہ حسین، زہرا نگاہ، مشمولہ شعر و حکمت، کتاب 12، دور سوم، ص:103)

نسائی حسیت ایک پیچیدہ، تہہ دار اور متحرک تصور ہے جو عورت کے سماجی ثقافتی اور نفسیاتی تجربے سے جنم لیتا ہے مگر اس تک محدود نہیں رہتا۔ یہ حسیت ہمیں دنیا کو طاقت کے زاویے سے نہیں بلکہ تجربے، احساس اور تعلق کے تناظر میں دیکھنا سکھاتی ہے۔ نسائی حسیت نہ صرف عورت کی شناخت کو نئے معنی دیتی ہے بلکہ انسانی شعور کو بھی وسعت عطا کرتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نسائی حسیت کسی ایک جنس کی میراث نہیں بلکہ ایک ایسا فکری امکان ہے جو حاشیے سے مرکز کو سوال کے کٹہرے میں کھڑا کرتا ہے اور معنی زبان اور وجود کے بارے میں ہمارے مسلمہ تصورات کو از سرِ نو غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

زبان اور ادب نسائی حسیت کے اظہار کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ نسائی حسیت کو ظاہر کرنے والے ادب میں صرف واقعات کو محض بیان نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے نفسیاتی جذباتی اور اخلاقی اثرات کو نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح کی ادبی تخلیقات میں کردار اکثر فیصلہ کن عمل کے بجائے داخلی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ بظاہر کسی انجام پر پہنچنے کے بجائے کیفیت کے اظہار پر ختم ہوتے ہیں۔

اردو شعر و ادب میں بھی نسائی حسیت کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔ خواہ وہ خواتین کی تخلیق ہو یا مرد کی تحریر۔ البتہ خواتین کے یہاں یہ حسیت تجربے کی صداقت کے باعث زیادہ شدت سے سامنے آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، ذکیہ مشہدی، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، بلقیس ظفیر الحسن، شائستہ یوسف، شہناز نبی، شفیق فاطمہ شعریٰ، رفیعہ شبنم عابدی، عذرا نقوی وغیرہ نے ایک طرف جہاں عورتوں کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے وہیں سماجی، سیاسی اور معاشی سطح پر ان کے مساوات کی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔ ان تخلیق کاروں کے یہاں طرزِ اظہار اور لہجے کے برتاؤ میں فرق نظر آتا ہے۔ تاہم سب کا مقصد عورت کے وجود کو اس کے پورے احترام کے ساتھ قبول کرنے اور حق و انصاف دلانے پر ہے۔ اس حوالے سے جب ہم معاصر اردو شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر اردو شاعرات نے اپنی شاعری کا آغاز نسائیت کے موضوعات سے ہی کیا ہے۔ یعنی بلوغت کے نسوانی اور غنائی جذبات کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن بہت جلد ہی وہ عورت کو اس کے تجربے اور تعلق کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔

نسائی حسیت نہ صرف عورت کی شناخت کو نئے معنی دیتی ہے بلکہ انسانی شعور کو بھی وسعت عطا کرتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نسائی حسیت کسی ایک جنس کی میراث نہیں بلکہ ایک ایسا فکری امکان ہے جو حاشیے سے مرکز کو سوال کے کٹہرے میں کھڑا کرتا ہے اور معنی زبان اور وجود کے بارے میں ہمارے مسلمہ تصورات کو از سرِ نو غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اردو کی نسائی شاعری میں عورت کی محکومی اور محرومی کو موضوعِ سخن بنانے والی شاعرات میں ایک نام ساجدہ زیدی کا بھی ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی خواہش تھی کہ عورت خود اپنے میں طاقت ور ہو جائے۔ وہ عورت کی ترقی اور تعلیم یافتہ ہونے کی خواہش مند نظر آتی ہیں۔ لکھتی ہیں:

کئی عمریں گزار آئی
کئی دنیائیں چھان آئی
کئی صحراؤں میں نقش قدم چھوڑے
کئی دریا لہو کے پار کر کے آئی
کئی آتش کدوں میں جذب کندن بنا آئی
مگر اب بھی میری زنجیر آہن کھڑکھڑائی ہے
مجھے جب جب نیلا آسمان حسرت سے تکتا ہے
میں اپنی آتش دل سے جلا دیتی ہوں
اس زنجیر کی کڑیاں
ستاروں تک پہنچتی ہوں
مدار نور میں مہتاب کی ہم رقص ہوتی ہوں

زاہدہ زیدی ایک معتبر شاعرہ کی حیثیت سے نمودار ہوئیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے ''زہر حیات'' 1970، ''دھرتی کا لمس'' 1975، ''سنگ جاں'' 1989، ''شعلۂ جاں'' 2000، ''شام تنہائی'' 2008 میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں عرفانِ ذات کے مسائل، نفسیاتی پیچیدگیاں اور سائیکی حیات کے ارتعاش جلوہ گر ہیں۔ ان کی شاعری فکری، فنی، اسلوبیاتی اور موضوعاتی اعتبار سے منفرد مقام کی حامل ہے۔ لفظ و معنی کی بحث، ہمکتی تجربے، متنوع تخلیقی موضوعات، ڈرامائی کیفیات، وقت، حیات و ممات، تنہائی اور وجودیت کے موضوعات وغیرہ ان کے حوالے کے طور پر ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو وقتی موضوعات، نعرہ بازی اور تانیثی بیان سے پاک رکھا۔ ایک عورت ہو کر بھی انھوں نے کبھی تانیثی فکر کا اعتراف نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے عورت کی ذات ترحم بھری نگاہ سے دیکھی جانے لگتی ہے جو انہیں ازحد ناپسند تھا۔ وہ بلند افتاد شاعرہ، ڈرامہ نگار، ناول نگار، محقق، مترجم اور ادیبہ ہیں۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں پروفیسر تھیں اس سے قبل چند سال دہلی یونیورسٹی کے مرانڈا ہاؤس اور لیڈی اروِن کالج میں انگریزی کی لکچرر رہیں۔ انہوں نے سماجی، نفسیاتی اور فلسفیانہ موضوعات پر انگریزی اور اردو میں تقریباً 30 سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ چیخوف، سارتر، بیکٹ، پرانڈیلو اور آئسکو کی تخلیقی تحریروں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ وہ عمدہ ڈرامہ نگار تھیں اور انھوں نے کئی ڈرامے پروڈیوس اور اسٹیج بھی کیے۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی البتہ نظموں میں ان کے خیالات و احساسات کی واضح طور پر تفسیر ملتی ہے۔ ان کی نظموں میں اپنے عہد کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی مسائل کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری درد و غم کی شاعری ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے اور پورے نسائی طبقے کا درد سمو کر رکھ دیا ہے۔ فیض کی نظم 'تنہائی' سے متاثر ہو کر انھوں نے بھی ایک نظم 'تنہائی' لکھی اس کے یہ ٹکڑے ملاحظہ کیجئے۔

نہ کوئی منزل مقصود، نہ انجام سفر
اور نہ کوئی آغاز
بس اک گراں بار سکوت
اک پُر ہول خلا
دہشت تنہائی میں پھیلا ہوا تا حد نظر

بلقیس ظفیر الحسن کا نام 80 کی دہائی میں خصوصیت کا حامل ہے انھوں نے غزلیں اور نظمیں دونوں میں طبع آزمائی کی، لیکن ان کی تخلیقی شخصیت کا تعین ان کی نظموں کے حوالے سے ہوتا ہے ان کا نظموں اور غزلوں پر مشتمل مجموعہ 'گیلا ایندھن' (1986) میں منظر عام پر آیا اس کے علاوہ ان کا کلام دور جدید سے لے کر اب تک شائع ہونے والے ادبی رسائل کی زینت بن چکا ہے جن میں شب خون، ذہن جدید، ایوان اردو، شاعر اور آجکل کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کی نظموں کو ان کی چابک دستی کے انداز کے لیے ادبی حلقوں میں پذیرائی ملی۔ ان کی نظموں میں فکری گہرائی اظہار و وسائل پر گرفت اور موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ ان کے یہاں ما بعد جدید ڈسکورس کے حوالے سے خواتین کی زندگی کے مختلف معاملات و وسائل کا کھل کر اظہار ہوا ہے۔ نئی شاعری میں تانیثیت کے تحت سماج میں عورت کی حیثیت و مقام کے ساتھ دیگر مسائل کو توجہ کا مرکز بنایا گیا اور جو ابتدا سے مردانہ معاشرتی نظام نے عورتوں کو درجہ دوئم پر رکھا تھا اس کے خلاف بھی عورت نے مرد کی بالا دستی کو قبول کرنے سے انکار کیا بلقیس نے سماجی تفریق کے اس انداز کو بہترین ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کے شعری سرمایہ میں ''گیلا ایندھن'' کے علاوہ مجموعہ ''شعلوں کے بعد'' (2004) بھی قابل ذکر ہے۔ تانیثی جذبات کے اظہار میں ان کے یہاں مرد کی بے وفائی کے جواب میں آنسو بہانے والی عورت کے بجائے ایک باوقار عورت کا تصور ملتا ہے جو زندگی کے حقائق سے واقف ہے اور بنا کسی سہارے کے بھی معاشرے میں سر اٹھا کر چل سکتی ہے۔

کیا نہ سہتے ہیں یہاں لوگ سہیں گے ہم بھی
بن ترے جی نہیں پائیں گے یہ امکاں تو نہیں
شل ہوئے ہاتھ ہمارے تو کوئی بات نہیں
برف کی سل کا یہ حصہ ذرا سا ٹوٹا تو

شہناز نبی ہندوستانی ہم عصر شعری دبستان میں اہم ادبی شناخت رکھتی ہیں ان کی تخلیقی شخصیت کا تعین ان کے مجموعوں ''بھیگی راتوں کی کتھا'' (1990) اور ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' (2001) سے ادب میں ہوا۔ شہناز نبی کی شاعری نسائی حسیت کے فطری حسن اور نئی عورت کی زندگی کا مرقع ہے جس میں پروین شاکر کی 'خوشبو' کی ہی مانند ایک نو عمر لڑکی سے لے کر ایک با شعور عورت تک کے سفر کو زندگی کے تمام تر رنگوں کے ساتھ برتا گیا ہے یہ وہ عورت ہے جس نے سماجی انحرافات کو اپنا شعار بنایا اور نو خیز عشقیہ معاملات سے لے کر عورت کی زندگی کے تمام تجربات کے اظہار کو پیش کیا۔ ان کی شاعری میں شروعاتی دور میں جو لڑکی محبوب کے لیے خود سپردگی کے جذبات سے سرشار ہے اور یہ کہتی ہے کہ:

مجھ کو تو ہر چہرے میں اب اس کا چہرہ دکھتا ہے
کیا اس کو بھی مجھ جیسی ہر شکل و شباہت لگتی ہے

وہی لڑکی عملی زندگی کے تلخ تجربات سے گزرنے کے بعد ایک باشعور عورت کی طرح محبوب سے بچھڑنے کے ڈر و غم میں ہلکان ہونے کی بجائے خود مختاری کے جذبے کو ظاہر کرتی ہے:

وہ شخص جس سے مل کے میں گم کر دوں اپنا آپ
اب عافیت ہے اس میں کہ اس سے ملا نہ جائے

شہناز کے یہاں عشق کی کیفیت کے تمام تر اسرار و رموز اپنی پوری حسیت کے ساتھ موجود ہیں جس میں شکوہ بھی ہے وفا شعاری بھی اضطراب بھی شکایات بھی اور ساتھ ہی لطیف جذبات کا اظہار بھی۔ ان کے یہاں نسائیت کی اصل صورت کی تشکیل غزلوں سے زیادہ نظموں میں ہوئی ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' کا انتساب انھوں نے ''تنہا عورتوں کے نام'' کیا ہے۔ شہناز نبی نے اپنی نظموں میں جنسی تفریق پر مبنی سماج میں نئی عورت کے تجربات کو بھی بخوبی نظم کیا ہے۔ سماجی استحصال کی روایت سے انحراف اور بغاوت کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اقدار کی شکست و ریخت سماجی اور سیاسی نظام زندگی کی تلخیاں بھی ان کی نظموں میں عصر حاضر کے حالات کی درست ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ مرد اساس معاشرے کے طریقہ کار اور عورت کے استحصال بے چارگی و معصومیت کی زندگی کی ترجمانی اجتماعی صورت حال کے تناظر میں کرتی ہیں۔ پدرانہ معاشرتی نظام اور عورت کے استحصال کو انھوں نے اساطیری کرداروں کے حوالے سے بھی کیا ہے جو جدیدیت کے مہابیانیہ کے بر خلاف مابعد جدیدیت کے منی بیانیہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کا تعلق علاقائی ادب سے ہے اور نسائیت کی بھی عمدہ ترجمان ہے۔ شہناز نبی کے یہاں عدم مساوات سے متعلق جو نظم ''الحق'' ہے، اس میں ان کا انداز خدا سے سوال اور شکوہ کا ہے۔ اسے انھوں نے تاریخی تناظر میں عورت کے وقار و عظمت اور برابری کے متعلق پیش کیا ہے۔

ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، اور شفیق فاطمہ شعریٰ نے فلسفیانہ موضوعات کو اپنی شاعری میں تانیثی حوالوں کے ساتھ برتا۔ انھوں نے 'شجر ممنوعہ' کو بھی ہاتھ لگایا اور 'دشمن ریکھاؤں' کو بھی پار کیا، جس سے اردو شاعری میں نسائی حسیت کی ایک نئی راہ ہموار ہوئی۔

■

Prof. Shabnam Hameed
Head Dept. of Urdu, University of Allahabad
U.P-211002
Mob:9839055704
Email: shabnamhameed.au@gmail.com

غالب بحیثیت رباعی گو

ساجد ذکی فہمی

مرزا اسداللہ خاں غالب کا شمار ان نابغہ شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے نظم ونثر دونوں سطح پر اردو ادب کے دامن کو وسیع کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے لیکن شاعری کی دیگر اصناف پر بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے جس قسم کا پیرایۂ بیان اختیار کیا وہ فارسی زدہ تھا۔ دور دراز کی تشبیہات واستعارات کے استعمال کے ساتھ ان کے کلام میں بیان کی پیچیدگی بھی نمایاں تھی۔ ان کے اسی انداز سے متاثر ہوکر ان کے ہمعصروں نے کہا تھا ع

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ اردو کے سبک اور رواں الفاظ کی طرف راغب ہوگئے۔ غالب کا شاعرانہ کمال یہ بھی ہے کہ سلیس اور آسان لفظوں کو برتنے کے باوجود ان کے اشعار میں معنی کی ایک دنیا آباد دکھائی دیتی ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

غالب کی رباعیات پر گفتگو سے قبل صنف رباعی کے متعلق چند باتوں کا ذکر ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ 'رباعی' عربی زبان کے لفظ 'ربع' سے ماخوذ ہے جس کے معنی چار کے ہوتے ہیں۔ یعنی رباعی چار مصرعوں یا دو بیتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہوتا ہے، لیکن اس سے رباعی کی صحت پر کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ دوم رباعیات غیر مردف بھی کہی جاسکتی ہیں۔ سوم رباعی میں اوزان کی پابندی کا نظام اس قدر سخت ہے کہ کسی دوسرے وزن میں نظم کی جانے والی شاعری خواہ چار مصرعوں پر مشتمل ہو، کو رباعی سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ چہارم رباعی کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں اس لیے اس کا شمار ہیئتی صنف میں کیا جاتا ہے۔

غالب نے صنف رباعی (اردو) پر بہت زیادہ طبع آزمائی نہیں کی لیکن جو بھی لکھا اس میں اپنے منفرد انداز بیان کا اظہار یا انفرادیت قائم رکھی۔ ان کی رباعیات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں پیش کردہ بیشتر بیانات کا تعلق براہ راست غالب کی شخصی یا ذاتی زندگی سے ہے۔ اب خواہ اس میں شکایت اہل دنیا ہو یا شکوۂ دوستاں، عشق کا بیان ہو یا درد وغم کا اظہار، اپنی حاجت وضرورت کا رونا ہو یا قرض سے چھٹکارے کی بات وغیرہ۔ علاوہ ازیں انھوں نے رباعی میں اپنے ظریفانہ انداز اور شوخی بیان کا بھی سہارا لیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی طبیعت کی شوخی کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں۔ کہتے ہیں:

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح وشام کرنے والے 1

یہاں غالب کی شوخی اپنے منتہا پر دکھائی دیتی ہے۔ کہتے ہیں ہم تو عام سلام کرنے والوں کی طرح ہی سلام کرنے والے ہیں یعنی دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں تاکہ ان کی نظر کرم ہم پر بھی رہے اور حاجت روائی ہوتی رہے، لیکن وہ تمام بااختیار حضرات مجھ سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ لہٰذا جب ان سے ایک طرح کی مایوسی ہاتھ آتی ہے تو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ چل کر خدا ہی سے اپنے مسائل کا تذکرہ کیا جائے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر قدم رک جاتے ہیں کہ وہ تو خود ہی صبح شام کرنے والا ہے۔ خدا کا کام چونکہ صبح کو شام میں اور شام کو صبح میں تبدیل کرنا ہے اس لیے خدا کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ صبح وشام کرنے والا ہے۔ لغت میں 'صبح وشام کرنا' کے ایک معنی لیت ولعل کرنا، ٹال مٹول کرنا، بہانے بنانا، آج کل کرنا وغیرہ کے آتے ہیں اور شاعر کی مراد اسی معنی سے ہے۔ اب غالب کی اس رباعی پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے کس قدر شوخی بیان سے کام لیا ہے۔

شوخی بیان کے متعلق غالب کی ایک اور رباعی ملاحظہ فرمائیں جس میں انھوں نے اپنا رشتہ شیعوں کے بجائے سنیوں سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی اپنی کتاب 'یادگار غالب' میں لکھتے ہیں:

''ایک بار مرحوم بہادر شاہ ظفر نے دربار میں کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہوگئی۔ چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں۔ جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی تھی...

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری'' 2

جیسا کہ ہم جانتے ہیں دہری اور صوفی دونوں ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔ اوّل الذکر کے

یہاں خدا کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں جب کہ آخر الذکر کے نزدیک خدا ہی موجود ہے اس کے علاوہ کسی چیز کی اہمیت نہیں۔ غالب کہتے ہیں کہ ان تمام باتوں کو ان لوگوں نے ہوا دی ہے جو مجھ سے حسد اور عداوت رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مجھے رافضی اور دہری گردانتے ہیں۔ حالانکہ صوفی اور دہری میں بُعد کا بھی رشتہ نہیں ہوتا ہے۔ رباعی کے آخری مصرعے میں انھوں نے ماوراءالنہر کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کا خاندانی سلسلہ وارءالنہر سے تعلق رکھتا ہے اور ماوراء النہر یعنی ترکستان کے لوگ کٹر سنی ہونے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مختصر یہ کہ جب غالب کو رافضی اور دہری کہا گیا تو انھوں نے خود کو صوفی ثابت کرنے کی کوشش کی اور جب کسی نے شیعی المذہب کہا تو انھوں نے خود کو ماوراءالنہری ثابت کر دیا۔ اس قسم کے بیانات یا خیالات کا اظہار ان کی حاضر دماغی اور ظریفانہ طبیعت پر دال ہے۔

غالب لذیذ اور اچھے کھانے بالخصوص گوشت کے بہت شوقین تھے۔ اخیر عمر میں جب نقاہت اور کمزوری بڑھ گئی تھی اس وقت بھی گوشت بدستور ان کے دسترخوان پر موجود ہوتا تھا۔ حالی نے 'یادگار غالب' میں لکھا ہے:

''مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا۔''3

حالی کے بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالب گوشت کے کس حد تک شوقین تھے۔ گوشت کی تعریف میں اگر غالب نے رباعی کہی ہوتی تو مضائقہ نہ تھا، لیکن انھوں نے گوشت کے برعکس دال اور سیم کی تعریف میں رباعی کہی ہے۔ پہلے رباعی ملاحظہ فرمائیں اس کے بعد ہم اس کی علت پر غور کریں گے۔

بھیجی ہے جو شاہ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایت شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت دین و دانش وداد کی دال 4
ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغان شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے 5

اول الذکر رباعی میں غالب نے اس دال کی بے انتہا تعریف کی ہے جو بادشاہ کے یہاں پکا کرتی تھی۔ یہ دال مونگ کی ہوتی تھی اور بادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ بادشاہ نے جب غالب کو اپنی پسند کی دال بھجوائی تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ غالب اس کی تعریف نہ کرتے، کیوں کہ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا اور اصول فطرت بھی۔ لہٰذا غالب نے دال کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر رکھ دیے۔ کہتے ہیں کہ شاہ جمجاہ یعنی بادشاہ کی رعایا پروری کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے لطف و کرم اور عنایتوں کی پوری خلق شاہد ہے۔ رعایا پروری کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ 'شاہ پسند دال' جو بالخصوص بادشاہ کے لیے بنائی جاتی تھی اور جس کا چکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، میرے لیے بھجوائی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنی پسندیدہ اشیا کے استعمال میں بھی رعایا کو نظر انداز کرنے کے قائل نہیں۔ وہ شاہ پسند دال کی تعریف میں مزید لکھتے ہیں کہ اس دال کا بحث و جدال سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے کیوں کہ فقط مقدار میں کمی و زیادتی کے علاوہ ہر شخص کی رکابی میں اس کا ذائقہ اور اس کی شکل وصورت یکساں دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخری مصرعے میں غالب نے اس دال کو دولت دین و دانش اور وداد یعنی دوستی اور اتحاد کا نشان کہا ہے۔

آخری الذکر رباعی میں بادشاہ کی طرف سے بھیجی گئی سبزی کی تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں کہ سیم کے بیجوں کی سبزی جو بادشاہ سلامت نے مجھے تحفۃً بھیجی ہے، میں اس کے عوض انھیں صرف دعائیں ہی دے سکتا ہوں۔ سیم کے بیجوں کو غالب نے اس رباعی میں فیروزے سے تشبیہ دی ہے۔ فیروزہ ایک قسم کا پتھر ہے جس کے دانے سیم کے بیجوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ سیم کی سبزی غالب کو کس قدر مرغوب تھی اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا، لیکن بادشاہ کی طرف سے بھیجی گئی سبزی کی تعریف کرنا غالب کے لیے ناگزیر تھا۔

مندرجہ بالا رباعیوں کے علاوہ غالب کی اور بھی ایسی رباعیات ہیں جن میں انھوں نے اپنی شخصی اور ذاتی زندگی سے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ غالب کی رباعیات ان کے منفرد انداز بیان کی حامل ہیں لیکن جو انفرادیت یا بلند آہنگی ان کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں وہ ان کی رباعیات میں مفقود ہیں۔ چند رباعیات کی تفصیل اوپر گزر چکی ہیں۔ ذیل میں چند مزید رباعیات کی وضاحت درج کی جارہی ہیں ملاحظہ فرمائیں:

مشکل ہے زبس کلام میرا، اے دل!
سن سن کے اسے، سخن وران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں مجھ سے فرمایش
گویم مشکل، وگر نگویم، مشکل 6

درج بالا رباعی میں غالب نے اپنے مخصوص انداز بیان کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ غالب کی مشکل پسندی یا مشکل گوئی کے تعلق سے اس زمانے کا عام رجحان یہی تھا کہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہی وجہ تھی اکثر لوگ ان سے آسان کہنے کی فرمائش کرتے تھے۔ مذکورہ رباعی کی جان چوتھے مصرعے میں پوشیدہ ہے۔ اس مصرعے میں دو باتوں کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ اوّل یہ کہ لوگوں کی خواہش کے پیش نظر اگر آسان شعر کہا جائے تو اپنی طبیعت کے خلاف جانا پڑے گا اور اگر طبیعت کی پیروی کی جائے یعنی مشکل شعر کہے جائیں تو لوگ برا مانتے ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر صاف صاف بات کہہ دی جائے تو سخن وران کامل کی کند ذہنی ظاہر ہوتی ہے اور اگر پیچیدگی اختیار کی جائے تو خود کو مورد الزام ٹھہرانا پڑتا ہے، یعنی ہر طرح سے مشکل ہی مشکل ہے۔

دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالب!
دل رک کر بند ہوگیا ہے غالب!
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہوگیا ہے غالب! 7

رباعی پر گفتگو سے قبل اس کی وضاحت کرتا چلوں کہ دیگر نسخوں یا شرحوں مثلاً 'شرح دیوان اردوئے غالب' (مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی)، 'نسخۂ عرشی' (امتیاز علی خاں عرشی) اور 'نقش چغتائی' (محمد عبدالرحمٰن چغتائی) میں دوسرا مصرع ''دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالب'' درج ہے۔ دوسرے مصرعے میں ''رک رک'' کی تکرار پر اظہار خیال کرتے ہوئے نظم طباطبائی رقم طراز ہیں:

''اس رباعی کے دوسرے مصرعے میں دو حرف وزن رباعی سے زائد ہوگئے ہیں اور ناموزوں ہے۔ مختلف چھاپہ کے سب نسخوں میں بھی اور جس نسخہ کی کاپیاں خود مصنف

مرحوم کی صحیح کی ہوئی ہیں اس میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے، اوزان رباعی میں سے جس وزن میں سبب خفیف سب سے زیادہ ہیں وہ یہ مصرع مشہور ہے: ''یا می گویم نام تو یا می گویم'' اس وزن پر اگر اس مصرع کو کھینچیں تو یوں ہونا چاہیے: 'دل رک رک کر بند ہوا ہے غالب' اور اس صورت میں زمین بدل جاتی ہے۔ غالباً اسی فارسی مصرع نے مصنف کو دھوکا دیا۔ اب خیال کرو غالب سا موزوں طبع شخص اور ناموزوں کہہ جائے۔''8

اس ضمن میں امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں:

''اس رباعی کے دوسرے مصرع میں مرزا صاحب نے از راہ سہو ایک رکن بڑھا دیا ہے۔''9

مالک رام نے اسے کتابت کی غلطی قرار دیتے ہوئے ایک ''رک'' کو حذف کر دیا ہے۔ مذکورہ رباعی چوں کہ مالک رام کے نسخے سے نقل شدہ ہے اس لیے متن میں ایک ہی ''رک'' کا اندراج کیا گیا ہے۔ یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ اسے غالب کی غلطی قرار دی جائے یا کاتب کی۔ راقم کے نزدیک رباعی کے دوسرے مصرعے کے متعلق اس کی وضاحت ضروری سمجھی گئی اس لیے اس جانب اشارہ کر دیا گیا۔

بہرحال مذکورہ رباعی میں شاعر نے عشق سے پیدا ہونے والی بے چینی، بے کیفی اور اضطراب کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ معاملات عشق میں انھیں اس قدر مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ تمام مصیبتیں اور مشکلات ان کے لیے حرز جاں کی صورت اختیار کر گئیں۔ یعنی ان تکالیف میں انھیں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار غالب نے غزلیہ اشعار میں کئی جگہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر میں کہتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

بہرحال چوتھے مصرعے جسے رباعی کی جان بھی کہا جاتا ہے میں ''سونا سوگند'' محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ لغت میں اس کے معنی نیند اڑ جانا، نیند غائب ہو جانا کے آتے ہیں۔ یہاں نیند نہ آنے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں ایک عشق کی وجہ سے۔ یعنی عام طور پر دیکھا بلکہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ عاشق کی شب کروٹیں بدلتے ہی گزرتی ہیں۔ نیند آنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا دل اور دماغ پرسکون ہو۔ Parasympathetic Nervous System معمول کے مطابق کام کر رہا ہو۔ Melatonin کا اخراج بھی حسب معمول ہو رہا ہو جب ہی انسان پرسکون نیند لے سکتا ہے۔ مگر عاشق کے دل اور دماغ میں ہمہ وقت ایک بے چینی کی سی کیفیت نمایاں رہتی ہے جس کی وجہ سے نیند کا نہ آنا واضح ہے۔ نیند نہ آنے کی دوسری وجہ معشوق کا ایذا نہ پہنچانا بھی ہو سکتا ہے۔ اسے ہم شاعرانہ تعبیر کہہ سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان دنوں معشوق کی جانب سے بے التفاتی، بے مروتی، جفاکشی اور بے وفائی میں کمی ہی دراصل نیند نہ آنے کی کلید ہے۔ ورنہ معشوق کی جانب سے جب تک آزار پہنچانے کا سلسلہ بدستور تھا، عاشق مطمئن اور پرسکون تھا۔ رویے کی تبدیلی ہی کم خوابی یا بے خوابی کا ذریعہ بنی ہے۔

کہتے ہیں کہ، اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پُرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں 10

آخر الذکر رباعی کی طرح مندرجہ بالا رباعی میں بھی معشوق کی عادت اور خصلت کی طرف اشارہ موجود ہے۔ شاعری میں معشوق کا کام عاشق کو تکلیف میں مبتلا کرنا یا اسے آزار پہنچانا ہوتا ہے۔ ایسا کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ عاشق کی تکلیف میں معشوق کے لیے راحت کے سامان پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے اب معشوق کے رویے میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اب نہ تو کسی کو ایذا پہنچانے کا خواہاں ہے اور نہ ہی اپنے چاہنے والوں سے ملنے میں کوئی عار محسوس کرتا ہے۔ رباعی کے تیسرے مصرعے میں ابہام کی کیفیت نمایاں ہے۔ ''ظلم سے اٹھایا ہوگا'' کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ظلم کرنے کے لیے اٹھایا ہوگا۔ اس لیے عاشق تذبذب کے عالم میں گرفتار دکھائی دیتا ہے۔

سامان خور وخواب کہاں سے لاؤں؟
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے، غالب! لیکن
خمخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟11

مذکورہ رباعی میں بے سروسامانی کا نوحہ بیان کرنے کے ساتھ مذہبی عقیدے کا اظہار بھی موجود ہے۔ یعنی وہ روزے کو حکم خداوندی اور فرض تو گردانتا ہے لیکن روزہ رکھنے کے لیے جن لوازمات یعنی سحری وافطار اور آرام کے لیے خمخانہ و برفاب کی ضرورت ہے وہ میسر نہیں، لہٰذا روکھے سوکھے ٹکڑے کھا کر چلچلاتی دھوپ میں روزہ رکھنا نہایت دشوار عمل ہے۔ یہاں غالب نے نہ بھوک کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی گرمی کی شدت کا لیکن اشعار میں استعمال کیے گئے الفاظ سے قاری اس کی تہ تک بآسانی پہنچ جاتا ہے۔

مضمون میں درج شدہ رباعیات کے علاوہ اردو میں غالب کی چند اور رباعیاں موجود ہیں، جن پر طوالت کی وجہ گفتگو نہیں کی جا سکی۔ مذکورہ مضمون کے پیش نظر مجموعی طور پر غالب کی رباعی گوئی کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ انھوں نے اردو میں بہت زیادہ رباعیاں نہیں کہیں، لیکن اگر اس میدان میں طبع آزمائی کرتے تو یقیناً یہاں بھی ان کے فن کا بھرپور مظاہرہ دیکھنے کو ملتا۔

حواشی

1. دیوان غالب (صدی ایڈیشن، باراوّل)، مالک رام، آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی، ص280
2. یادگار غالب مع فارسی متن وترجمہ، مولانا الطاف حسین حالی، فارسی متن کے مترجم: نسیم احمد عباسی، غالب اکیڈمی، دہلی، 2011، ص80
3. ایضاً، ص73
4. دیوان غالب (صدی ایڈیشن، باراوّل)، مالک رام، آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی، ص279
5. ایضاً، ص280
6. ایضاً، ص278
7. ایضاً، ص278
8. شرح دیوان اردوئے غالب، مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی، رضوی پرنٹرس، حیدرآباد ص337-334
9. دیوان غالب نسخۂ عرشی (نوائے سروش)، امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 1958، ص340
10. دیوان غالب (صدی ایڈیشن، باراوّل)، مالک رام، آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی، ص279
11. ایضاً، ص280

Dr. Md. Sajid Zaki Fahmi
Assistant Professor
Department of Urdu, Hiralal Bhakat College
Nalhati, Birbhum-731220
Mob: 9990121625
Email: sajidzakifahmi@gmail.com

خصوصی گوشہ

بین الاقوامی

یوم یوگ

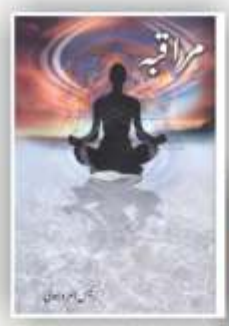

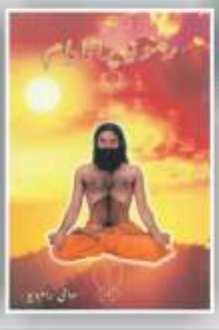

"دماغی لہروں اور خیالات کو پرسکون کرنا ہی یوگا ہے"۔ مہارشی پتنجلی

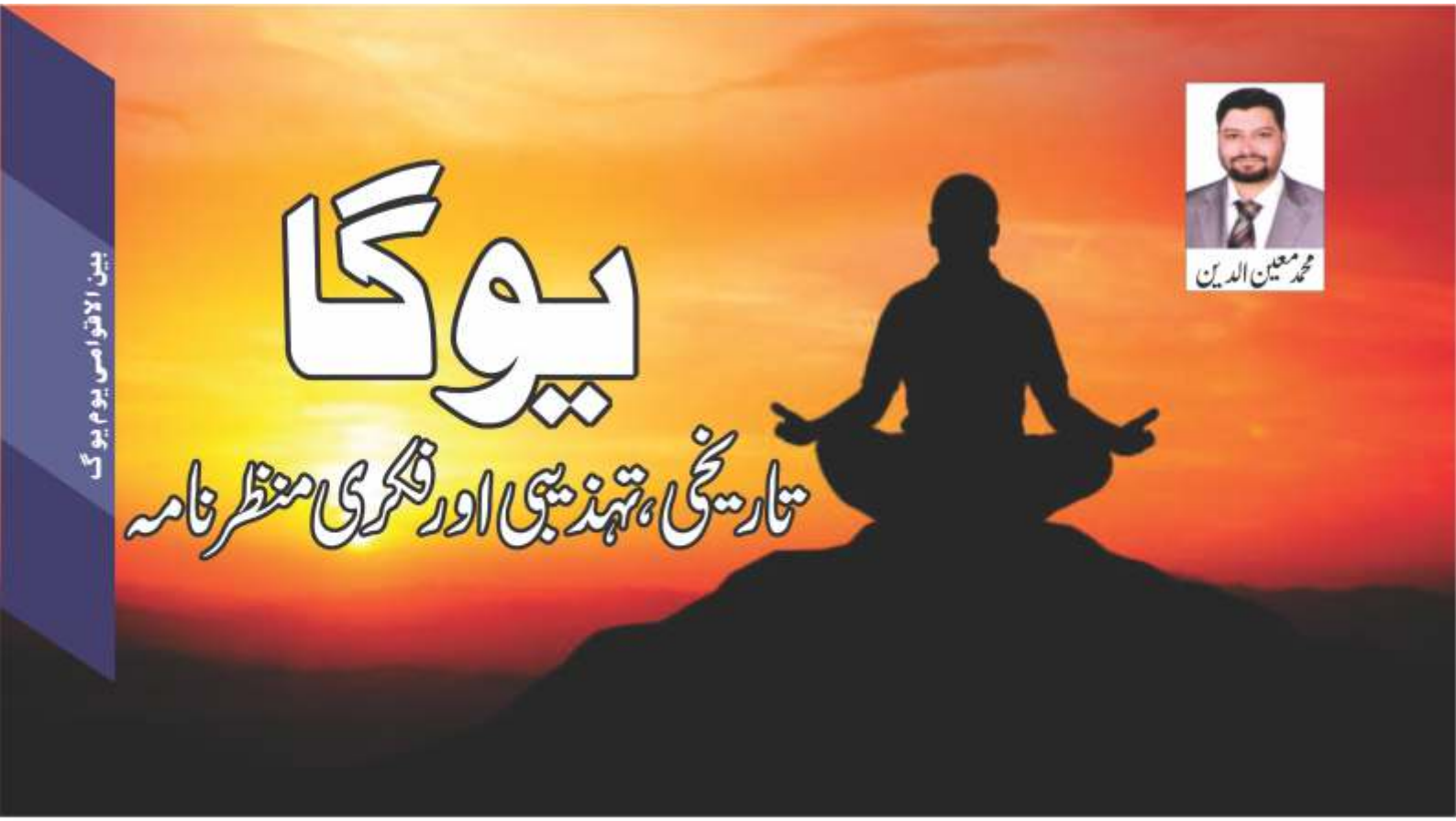

یوگا

تاریخی، تہذیبی اور فکری منظر نامہ

محمد معین الدین

انسان نے ہر دور میں اپنے حالات، مسائل اور تقاضوں کے تحت نئے راستے تلاش کیے اور اپنی زندگی کو زیادہ متوازن، پرسکون اور بامقصد بنانے کی کوشش کی۔ اگر آج دنیا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جدید ترین سائنسی ترقیات اور سہل ترین طبی وسائل کی فراوانی کے باوجود پوری دنیا ایک بار پھر نیچر اور فطرت کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ یہ رجوع محض ایک عارضی رجحان نہیں بلکہ ایک فکری تبدیلی کی علامت ہے، جس میں انسان مصنوعی سہولتوں اور مادی ہنگاموں سے نکل کر اپنی اصل اور داخلی توازن کی بازیافت کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی پس منظر میں جب ہم عالمی سطح پر یوگا کے روز افزوں فروغ کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ محض ایک جسمانی مشق کی مقبولیت کا مسئلہ نہیں رہتا، بلکہ فطرت سے ہم آہنگ زندگی کی اسی عالمی جستجو کا تسلسل محسوس ہوتا ہے۔ درحقیقت یوگا جدید انسان کی اُس داخلی ضرورت کا اظہار ہے جو ذہنی سکون، روحانی توازن اور جسمانی ہم آہنگی کی تلاش میں اسے دوبارہ فطری اصولوں کی طرف واپس لے جا رہی ہے۔

یوگا کی جامع تعریف پیش کرنا آسان نہیں۔ مختلف ادوار میں اہلِ فکر نے اسے اپنے اپنے فہم اور تجربے کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ عام طور پر یوگا کو ایک ایسے ہمہ گیر نظام کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس میں فن، علم اور فلسفہ باہم مدغم ہیں۔ بنیادی طور پر یہ خالص ہندوستانی فکر کی پیداوار ہے، جس کا مقصد انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی داخلی اور خارجی کیفیات کو سمجھ سکے اور ان پر کسی حد تک قابو پا سکے۔ اس اعتبار سے یوگا محض مشق نہیں بلکہ ایک شعوری اور فکری عمل ہے، جو انسان کو اس کی ذات کے ساتھ بامعنی ربط عطا کرتا ہے۔

یوگا کی معنوی اور فکری جہات کو سمجھنے کے ساتھ اس کے لفظی پس منظر پر بھی ایک نظر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ لغوی اعتبار سے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ لفظ یوگا سنسکرت لفظ ''یوگ'' سے ماخوذ ہے، یوگ کی مشق کرنے والے کو عموماً ''یوگی'' کہا جاتا ہے۔ یوگ کے معنی اتحاد، اتصال یا وحدت کے ہیں، یعنی ایسی کیفیت جس میں انسان اپنی ذات کے مختلف پہلوؤں میں ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ تاہم بعض اہلِ قلم نے اس سلسلے میں ایک مختلف زاویہ بھی پیش کیا ہے۔ شکیل شمسی نے اپنی تحریر ''یوگا پر مباحثہ'' میں اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اصل لفظ ''یوگ'' ہے، جسے بعد میں انگریزی اثرات کے تحت ''یوگا'' کی شکل دے دی گئی۔ ان کے بقول ''جس طرح 'اشوک' کو 'اشوکا'، 'رام' کو 'راما' اور 'کرشن' کو 'کرشنا' کہا جانے لگا، اسی طرح ''یوگ'' بھی ''یوگا'' بن گیا''[1]۔ یہ نکتہ اپنی جگہ قابلِ توجہ ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف لفظی تغیر کا پہلو سامنے آتا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ تہذیبی اور لسانی تعاملات کس طرح الفاظ کی ہیئت اور اس کے تلفظ کو متاثر کرتے ہیں۔

یوگا کے تاریخی آغاز و ارتقا کا قطعی تعین اگرچہ آسان نہیں، تاہم اس کے ابتدائی نقوش قدیم تہذیبوں کے آثار میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے مطابق وادیِ سندھ کی تہذیب سے ملنے والی بعض مہروں میں مراقبہ نما نشستوں اور کیفیتوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جنھیں اس روایت کی ابتدائی صورتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ تہذیب اپنی قدامت اور تہذیبی ارتقا کے اعتبار سے دنیا کی اہم ترین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے، جس کا عروج تقریباً ساڑھے چار ہزار برس قبل تھا۔ فکری سطح پر بعض اہلِ علم یوگا کے ابتدائی تصورات کو یاجناوالکیا (Yajnavalkya)[2]۔ سے منسوب کرتے ہیں، جن کے افکار میں باطنی تربیت اور روحانی ارتقا کے عناصر نمایاں ہیں۔ بعد کے دور میں خصوصاً دوسری صدی قبل مسیح میں پتنجلی (Patanjali) نے ان منتشر افکار کو ایک منظم فلسفیانہ نظام کی صورت میں پیش کیا۔ ان کی تصنیف ''یوگا سُوتر'' اس حوالے سے بنیادی اہمیت رکھتی ہے، جس میں یوگا کے اصول کو پہلی مرتبہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں آٹھ اصولی مراحل (AshtangaYoga) شامل ہیں۔ اس

سے قبل چھٹی اور ساتویں صدی قبل مسیح کے درمیان مرتب ہونے والے اپنشدوں میں بھی یوگا سے متعلق فکری اشارے ملتے ہیں، جہاں انسان کے باطنی شعور اور کائنات کے باہمی ارتباط پر غور وفکر کیا گیا ہے۔ یہ نقوش اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یوگا محض ایک عملی مشق نہیں بلکہ قدیم ہندوستانی فکر وفلسفے کا ایک اہم جزو رہا ہے۔3

تاریخی شواہد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یوگا محض ایک مقامی یا وقتی روایت نہیں بلکہ انسانی فکری جستجو کا ایک تسلسل ہے۔ اگرچہ اس کی منظم صورت قدیم ہندوستانی فکر میں ملتی ہے، تاہم روحانیت اور باطنی ارتقا کی جستجو کے آثار فارس، مصر، میسوپوٹامیا اور یونان جیسی قدیم تہذیبوں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے یوگا کو ایک وسیع تر انسانی تجربے کا حصہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ابتدائی ادوار میں یہ علم عام افراد کی دسترس سے باہر رہا اور مخصوص روحانی حلقوں، سادھوؤں، سنتوں اور اعلیٰ طبقات تک محدود تھا۔ یہی محدودیت ایک طرف اس کی فکری گہرائی کا سبب بنی تو دوسری طرف اس کے زوال کا اندیشہ بھی پیدا ہوا۔ وقت کے ساتھ جب قدیم روایتوں کے امین کم ہوتے گئے تو یوگا بھی ایک مرحلے پر فراموشی کے دہانے تک جا پہنچا۔ تاہم اس کی بقا اُن افراد اور حلقوں کی مرہون منت ہے جنھوں نے اسے محض نظری علم کے طور پر نہیں بلکہ ایک عملی تجربے کے طور پر زندہ رکھا اور اسے نئی نسلوں تک منتقل کیا۔ بعد کے ادوار میں یوگا کی باقاعدہ تعلیم وتدریس کا اہتمام ہوا، ادارے قائم کیے گئے اور اسے ایک منظم علمی وعملی نظام کی حیثیت دی گئی۔ یہاں تک کہ ہندوستانی تعلیمی اداروں میں بھی اسے ایک مستقل مضمون کے طور پر شامل کیا گیا۔ اسی تدریجی عمل کے نتیجے میں یوگا اپنی جغرافیائی حدود سے نکل کر عالمی سطح پر متعارف ہوا اور آج ایک ایسے فکری وثقافتی مظہر کی صورت اختیار کر چکا ہے جو مختلف تہذیبوں میں اپنی معنویت کے ساتھ موجود ہے۔

یہ سوال فطری ہے کہ موجودہ یوگا اور قدیم یوگا کی صورتیں کیا یکساں ہیں؟ یا ان میں کوئی بنیادی فرق پایا جاتا ہے؟ اس سلسلے میں معروف امریکی اسکالر David Gordon white کے مطابق آج دنیا بھر میں رائج یوگا کی بیشتر شکلیں قدیم فلسفیانہ یوگا، خصوصاً ''یوگا سوتر'' اور دیگر کلاسیکی متون سے براہِ راست مطابقت نہیں رکھتیں۔ ان کے نزدیک موجودہ تصورات زیادہ تر گزشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران تشکیل پائے ہیں جب کہ اس کی بعض عملی صورتیں بارہویں صدی عیسوی سے پہلے واضح طور پر نہیں ملتیں۔ تاہم یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ یوگا کی تاریخ میں ازسرِ نو تشکیل کا عمل کوئی نئی بات نہیں۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ دو ہزار برسوں کے دوران یوگا مختلف صورتوں میں سامنے آتا رہا ہے۔ ہر عہد اور ہر فکری حلقے نے اپنے سماجی اور ثقافتی تناظر میں اس کی نئی تعبیر پیش کی اور اسی کے مطابق اس کی عملی صورت متعین کی۔ اس طرح یوگا کو ایک جامد روایت کے بجائے ایک زندہ اور ترقی پذیر فکری وعملی سلسلہ قرار دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، جو وقت کے تقاضوں کے ساتھ خود کو ڈھالتا رہا ہے۔4

تاریخی شواہد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یوگا محض ایک مقامی یا وقتی روایت نہیں بلکہ انسانی فکری جستجو کا ایک تسلسل ہے۔ اگرچہ اس کی منظم صورت قدیم ہندوستانی فکر میں ملتی ہے، تاہم روحانیت اور باطنی ارتقا کی جستجو کے آثار فارس، مصر، میسوپوٹامیا اور یونان جیسی قدیم تہذیبوں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے یوگا کو ایک وسیع تر انسانی تجربے کا حصہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ امر بھی خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ مختلف سماجی و سیاسی تغیرات کے باوجود یوگا کی روایت مختلف صورتوں میں برقرار رہی۔ حتیٰ کہ سلطنت مغلیہ کے زوال اور برطانوی اقتدار کے آغاز کے زمانے میں بھی یوگا کی مختلف شکلیں ہندوستانی معاشرت اور فکری زندگی میں موجود رہیں۔ سیاسی تبدیلیوں کے باوجود یوگا کی یہ روایت کبھی منقطع نہیں ہوئی۔ ایک روحانی اور عملی نظام کے طور پر یہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔ درحقیقت مختلف ادوار میں متعدد روحانی شخصیات سامنے آئیں، جن میں بعض نے مقامی سطح پر، بعض نے ملکی اور بعض نے عالمی سطح پر شہرت حاصل کی۔ آج ان کے افکار و نظریات علمی و تحقیقی مطالعے کا موضوع ہیں۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ان میں سے کئی نام عوامی حافظے سے اوجھل ہو گئے۔ یوں جدید دور میں بھی یوگا نے نہ صرف اپنی قدیم روایت کو برقرار رکھا بلکہ بدلتے ہوئے عالمی تناظر میں ایک نئے فکری اور ثقافتی مفہوم کے ساتھ خود کو منوایا۔ اسی فکری و تاریخی تسلسل کے تحت بعض مقدس شخصیات کی زندگی اور خدمات کا مختصر جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے جنھوں نے یوگا اور ہندوستانی روحانیت کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں رام کرشن پرم ہنس کا نام بطورِ نقطۂ آغاز خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

رام کرشن پرم ہنس

جدید دور میں رام کرشن پرم ہنس کو ان اولین ہندوستانی روحانی شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے جن کی شہرت ہندوستان سے باہر تک پہنچی۔ وہ 1836 میں مغربی بنگال کے ایک روایتی برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر ہی سے ان میں غیر معمولی روحانی میلان اور باطنی کشش کے آثار نمایاں تھے۔ انھوں نے ہندو مذہبی ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور جلد ہی روحانی

حلقوں میں ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لی۔ وہ فنونِ لطیفہ خصوصاً گائیکی، اداکاری اور رقص سے بھی فطری مناسبت رکھتے تھے۔ اسی ذوق کے تحت انھوں نے رامائن اور مہابھارت کے واقعات کی ڈرامائی پیشکش کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ بعد ازاں وہ دکشنیشور کالی مندر کے پجاری مقرر ہوئے، جو بنگالی بھکتی روایت کا اہم

روحانی مرکز تھا۔ان کے انتقال (1886) کے بعد ان کے شاگردوں بالخصوص سوامی وویکانند کی قیادت میں، ایک ایسی فکری وروحانی تحریک کی بنیاد رکھی گئی جس نے آگے چل کر عالمی سطح پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔

سوامی وویکانند

جدید دور میں یوگا اور ہندوستانی روحانیت کو عالمی سطح پر متعارف کرانے میں سوامی وویکانند کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت، خطیبانہ صلاحیت اور فکری وسعت کے باعث وہ ویدانتی افکار اور یوگا کے مؤثر ترجمان کے طور پر ابھرے۔ وویکانند 1863 میں کلکتہ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا

ہوئے۔ دورانِ تعلیم ان کی ملاقات رام کرشن پرم ہنس سے ہوئی جنھوں نے ابتدا ہی میں ان کی فکری صلاحیت کو پہچان لیا۔ وہ اپنے استاد کی روحانیت شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور انہی کی تربیت میں روحانی اور ریاضت کے تمام مراحل طے کیے۔ رام کرشن پرم ہنس کی وفات کے بعد انھوں نے کچھ عرصہ ہمالیہ میں خلوت اختیار کی اور پھر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے استاد کے افکار کی تبلیغ کی۔ 1893 میں شکاگو میں منعقدہ ''مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ'' میں ان کی شرکت فیصلہ کن ثابت ہوئی، جہاں ان کے خطابات نے غیر معمولی توجہ حاصل کی اور وہ مغربی دنیا میں ہندوستانی روحانیت کی نمایاں آواز بن گئے۔ بعد ازاں امریکہ اور یورپ میں ان کے لیکچرز نے یوگا اور ویدانت کے لیے وسیع فکری دلچسپی پیدا کی۔ جدید دور میں یوگا کی عالمی مقبولیت کی فکری بنیادوں کو مضبوط کرنے والوں میں ان کا نام نمایاں ہے، جبکہ بعد کے مفکرین مثلاً رَمَنا مہارشی اور اروبندو گھوش نے اس روایت کو مزید فکری گہرائی اور وسعت بخشی۔

رمنا مہارشی

رمنا مہارشی 30 دسمبر 1879 کو تمل ناڈو میں ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کم عمری ہی سے ان میں روحانی رجحان نمایاں ہونے لگا۔ نوجوانی میں وہ خاموشی سے گھر چھوڑ کر ارونا چل پہاڑی کے دامن میں واقع ''ترونا ملائی'' پہنچ گئے، جو ہندو روایت میں ایک مقدس مقام سمجھا جاتا ہے۔ وہاں انھوں نے طویل عرصہ خلوت، مراقبے اور خاموش ریاضت میں گزارا۔ ابتدا میں وہ مکمل طور پر خاموشی اختیار کیے رہے، تاہم ان کی روحانی کیفیت اور سکون آمیز شخصیت لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ بعد میں انھوں نے اپنے معتقدین کے سوالات کے مختصر تحریری جوابات دینا شروع کیے، جو ان کے افکار و تصورات کی بنیاد بنے۔ ان کی تعلیمات کا مرکزی نکتہ ''خود شناسی'' اور ''باطن کی دریافت'' تھا۔ انھوں نے فلسفیانہ پیچیدگی کے بجائے داخلی شعور اور روحانی تجربے پر زور دیا، جس نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کیا۔ رمنا مہارشی 1950 تک ارونا چل میں مقیم رہے، تاہم اس دوران ان کی تعلیم و تلقین بیرون ہند بھی متعارف ہو چکی تھی۔ ان کی تعلیمات کو عمومی طور پر ''گیان یوگا'' کی قدیم روایت کا سادہ اور مؤثر اظہار قرار دیا جاتا ہے۔

اروبندو گھوش

اروبندو گھوش کا تصورِ یوگا، رمنا مہارشی کے تجرباتی اور خاموشی پر مبنی رجحان سے مختلف تھا۔ وہ 15 اگست 1872 کو کلکاتا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک روشن

خیال طبیب تھے، جنھوں نے انھیں ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیج دیا، جہاں انھوں نے مغربی فلسفے، ادب اور سیاسی افکار کا گہرا مطالعہ کیا، تاہم ان کا رشتہ ہندوستانی تہذیب اور قومی شعور سے مضبوط رہا۔ وطن واپسی پر وہ تحریکِ آزادی سے وابستہ ہوئے، مگر جلد ہی ان کی توجہ روحانی ریاضت اور یوگا کی طرف مبذول ہوگئی۔ 1904 کے بعد انھوں نے باقاعدہ یوگا کی مشق شروع کی، خصوصاً ''پرانایام'' کو اپنی ریاضت کا حصہ بنایا۔ بعد ازاں ''وشنو بھاسکر لیلی'' کی رہنمائی میں باطنی تجربات نے ان کی فکر و روحانیت کو مزید نکھارا۔ اروبندو نے یوگا اور ہندوستانی روحانیت کو جدید فکری تناظر میں پیش کیا۔ ان کی تحریروں نے تعلیم یافتہ طبقے اور مغربی علمی حلقوں کو بھی متاثر کیا۔ ان کی شخصیت میں روحانیت، فلسفہ اور انسانی ارتقا کا تصور اس طرح یکجا نظر آتا ہے کہ انھیں مشرق و مغرب کے فکری امتزاج کی ایک اہم علامت سمجھا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یوگا کے قدیم و جدید مطالعے سے اس روایت کی وسعت اور فکری گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی عملی صورتیں مختلف رہی ہیں، تاہم اس کا بنیادی مقصد انسان کو داخلی سکون، روحانی بالیدگی اور اعلیٰ شعور سے آشنا کرنا ہے۔ اسی لیے یوگا کے کئی تصورات دنیا کی مختلف روایتوں سے قریب محسوس ہوتے ہیں، جو باطنی تطہیر اور روحانی ارتقا پر زور دیتی ہیں۔

عصرِ حاضر میں یوگا کی عالمی مقبولیت کا ایک نمایاں اظہار اُس وقت سامنے آیا جب اقوامِ متحدہ نے 21 جون کو ''عالمی یومِ یوگا'' قرار دیا۔ اس سلسلے میں 27 ستمبر 2014 کو اس وقت ایک اہم پیش رفت ہوئی جب ہندوستان کے وزیرِ اعظم نریندر مودی نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 69 ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یوگا کے لیے ایک عالمی دن مختص کرنے کی تجویز پیش کی، جسے 193 میں سے 177 رکن ممالک کی حمایت حاصل ہوئی۔ اپنے خطاب میں وزیرِ اعظم نے یوگا کو ہندوستان کی قدیم تہذیبی روایت کا ایک قیمتی عطیہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ جسم و ذہن کی ہم آہنگی، فکر و عمل کے توازن اور انسان و فطرت کے باہمی ربط کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے مطابق یوگا محض جسمانی ورزش نہیں بلکہ ایسی مشق ہے جو جدید دور کے ذہنی دباؤ اور ماحولیاتی بحران کے درمیان انسان کو داخلی توازن اور فطرت سے ہم آہنگ طرزِ زندگی کی طرف متوجہ کرتی ہے[5]۔ بعد ازاں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 21 جون کو عالمی یومِ یوگا قرار دینے کی قرارداد منظور کی۔ اُس وقت کے سکریٹری جنرل بان کی مون نے کہا کہ یہ دن یوگا کے ہمہ جہت فوائد کی جانب عالمی توجہ مبذول کرانے کا ذریعہ بنے گا۔ ان کے مطابق یوگا نہ صرف ذہنی دباؤ اور اضطراب میں کمی لاتا ہے بلکہ مختلف طبقات کے درمیان باہمی احترام اور سماجی ہم آہنگی کو بھی فروغ

دیتا ہے 6۔اس لیے اسے محض جسمانی مشق تک محدود کرنا مناسب نہیں، بلکہ اسے ایک وسیع تہذیبی، فکری اور روحانی روایت کے طور پر سمجھنا زیادہ قرین حقیقت معلوم ہوتا ہے۔

اسی تناظر میں ہندوستان کی جانب سے یوگا اور دیگر روایتی علوم کو عالمی سطح پر فروغ دینے کی منظم کوششیں بھی قابل توجہ ہیں۔ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (ICCR) نے وزارتِ آیوش کے اشتراک سے تعلیمی سال 2026-2027 کے لیے ''آیوش اسکالرشپ اسکیم'' کا اعلان کیا ہے، جس کے تحت غیر ملکی، خصوصاً عرب ممالک کے طلبہ کو آیورویدا، یوگا، یونانی، سِدّھا اور ہومیوپیتھی جیسے روایتی علوم میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں۔ سعودی عرب، مصر، شام اور دیگر عرب ممالک میں قائم ہندوستانی سفارت خانوں کی جانب سے اس اسکیم کی تشہیر اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہندوستان اپنی تہذیبی وراثت اور روایتی علوم کو عالمی علمی و ثقافتی منظرنامے میں ایک موثر فکری و ثقافتی قوت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

درحقیقت یہ پیش رفت ہندوستان کی ایک اہم تہذیبی کامیابی کی علامت ہے۔ یوگا، جو کبھی ایک محدود روحانی روایت سمجھا جاتا تھا، آج عالمی جامعات اور تحقیقی اداروں میں ایک باقاعدہ علمی موضوع کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آیوش اسکالرشپ جیسے اقدامات اس امر کی دلیل ہیں کہ ہندوستان نے اپنی قدیم فکری روایتوں کو جدید دنیا کے لیے ایک قابلِ قبول علمی و ثقافتی ماڈل کے طور پر پیش کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس تناظر میں یوگا اور دیگر ہندوستانی روایتی علوم اب محض صحت یا روحانیت تک محدود نہیں رہے، بلکہ تہذیبی سفارت کاری اور ''سافٹ پاور'' (Soft Power) کے ایک مؤثر وسیلے کی صورت اختیار کر چکے ہیں، جن کے ذریعے ہندوستان اپنی ثقافتی شناخت کو عالمی سطح پر مستحکم کر رہا ہے۔

بطور حاصل بحث یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں یوگا ایک محدود روحانی روایت سے نکل کر عالمی طرزِ حیات کا حصہ بن چکا ہے۔ آج اسے مذہبی اور نظریاتی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر ایک سائنسی اور معروضی نظام کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف نسلوں، مذاہب اور معاشرتی طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد نے اسے اختیار کیا۔ نوجوانوں، بزرگوں، گھریلو خواتین

یوگا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے صرف جسمانی ورزش یا تجارتی سرگرمی کے محدود دائرے میں نہیں دیکھا جانا چاہیے، بلکہ اس کے تاریخی، تہذیبی اور فکری پس منظر کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یوگا کی اصل قوت اس کی اسی جامع فکر میں مضمر ہے، جو انسان کو اپنے باطن، معاشرے اور فطرت کے ساتھ متوازن تعلق قائم کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اسی بنا پر یوگا آج بھی انسانی تہذیب کے اُن زندہ مظاہر میں شمار ہوتا ہے، جو وقت گزرنے کے باوجود اپنی معنویت اور افادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

اور پیشہ ور طبقات میں اس کی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ یوگا اب کسی مخصوص خطے یا طبقے تک محدود نہیں رہا۔ امریکہ اور یورپ میں لاکھوں افراد کی باقاعدہ مشق / پریکٹس اس امر کی غماز ہے کہ یوگا ہندوستان کے ایک اہم تہذیبی عطیے کے طور پر عالمی شناخت حاصل کر چکا ہے۔

تاہم یوگا کی اس عالمی مقبولیت نے بعض فکری سوالات کو بھی جنم دیا ہے۔ خصوصاً یہ کہ آیا یوگا اپنی اصل روحانی معنویت کو برقرار رکھ پایا ہے یا محض ایک طرزِ زندگی اور تجارتی صنعت بن کر رہ گیا ہے؟ مغربی دنیا میں اس کی پذیرائی نے اسے صحت، ذہنی سکون اور توازن کے ایک مؤثر ذریعے کے طور پر متعارف کرایا، لیکن اس کے ساتھ یوگا ایک وسیع تجارتی دائرے میں داخل ہوا، جس میں مختلف کورسز، مراکز اور مصنوعات شامل ہیں۔ بعض ناقدین کے نزدیک اس عمل نے یوگا کی اصل روحانی بنیادوں کو کسی حد تک متاثر کیا ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ اہم ہے، کیونکہ ہر وہ روایت جو اپنی جغرافیائی حدود سے نکل کر عالمی سطح پر پھیلتی ہے، وہ لازماً تغیر کے عمل سے بھی گزرتی ہے۔ یہ پہلو مزید علمی تحقیق اور سنجیدہ مکالمے کا متقاضی ہے۔

یوگا اب محض ایک قدیم روایت نہیں رہا بلکہ انسان کی ایک اہم ضرورت بنتا جا رہا ہے، اور یہی ضرورت اس کے عالمی عروج کے بنیادی اسباب میں شامل ہے۔

تاہم یوگا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے صرف جسمانی ورزش یا تجارتی سرگرمی کے محدود دائرے میں نہیں دیکھا جانا چاہیے، بلکہ اس کے تاریخی، تہذیبی اور فکری پس منظر کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یوگا کی اصل قوت اس کی اسی جامع فکر میں مضمر ہے، جو انسان کو اپنے باطن، معاشرے اور فطرت کے ساتھ متوازن تعلق قائم کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اسی بنا پر یوگا آج بھی انسانی تہذیب کے اُن زندہ مظاہر میں شمار ہوتا ہے، جو وقت گزرنے کے باوجود اپنی معنویت اور افادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

حواشی

1۔ روزنامہ انقلاب، نئی دہلی، 10 جون 2015ء۔

2- Benjamin walker, Hindu World (An Encyclopedic Survey of Hinduis), Volume II, (M-Z), PP: 616-17 .

3- The New Encyclopedia Britannica, Volume 12, 15th Edition, New Delhi, 2010, P 846 .

4- David Gordon white: Yoga: Brief History of an idea, PP 2-3 .

5- Speech of the Prime Minister of India at the 69th Session of the UN -General Assembly, delivered on 27 /9/ 2014. Official website of the Government of India: (pib.nic.in) accessed on 27/09/2014.

6- Al-Riyadh Newspaper, published by Al-Yamamah Press, Riyadh, Issue No.16971, dated 12/2014.

Dr. Mohammad Moinuddin
Flat No. 706, Ostwal Garden, Near Galaxy Hospital, Kanakai Road, Laxmi Park, Mira Road, Bhayander, Thane Maharashtra-401107
Emai: drmoinjnu@gmail.com

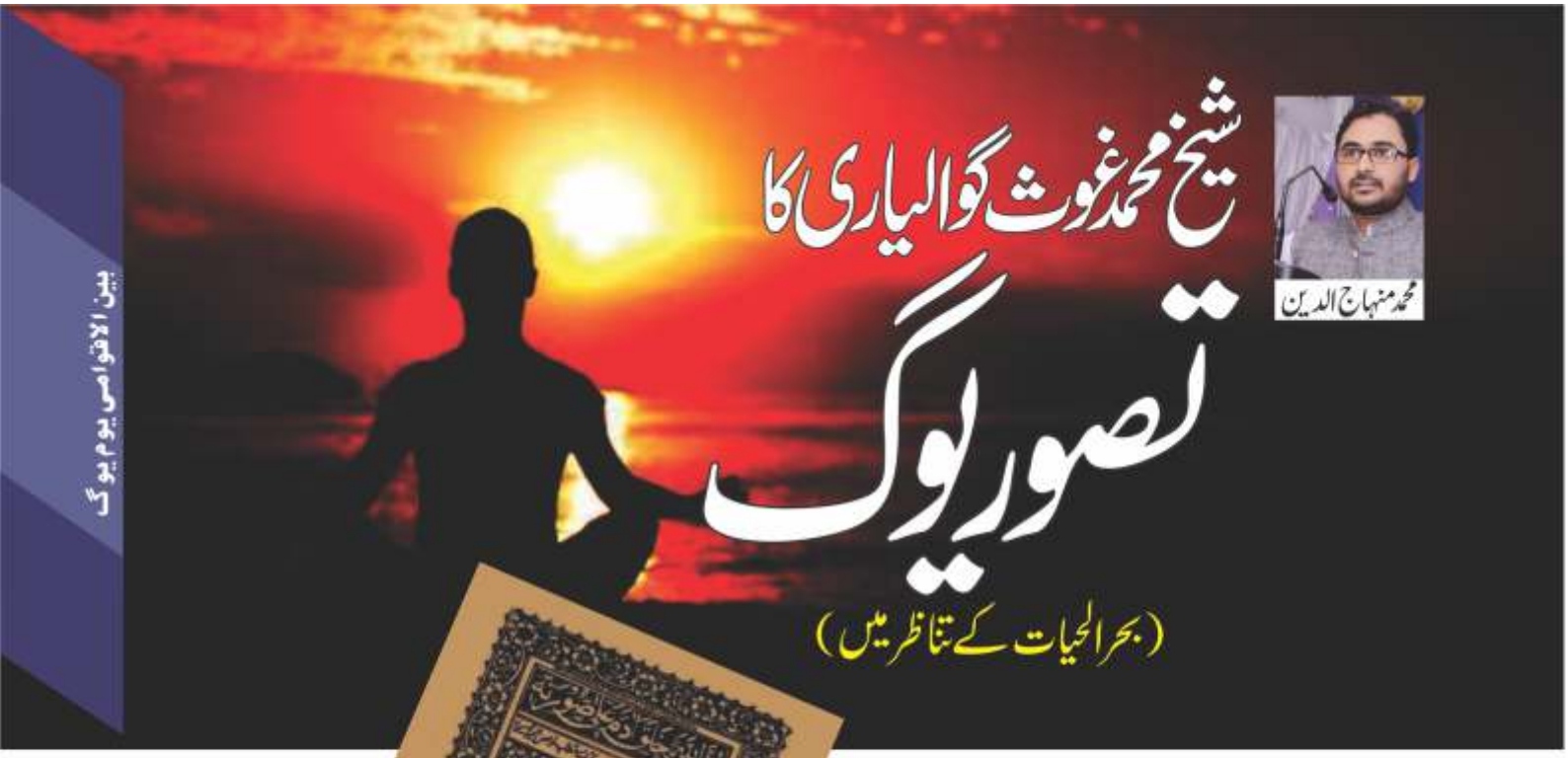

شیخ محمد غوث گوالیاری کا تصور یوگ

(بحر الحیات کے تناظر میں)

محمد منہاج الدین

یوگا ایک قدیم اور ہمہ گیر ہندوستانی فلسفہ ہے جو انسان کی جسمانی، ذہنی اور روحانی صحت کو جسد خاکی کے لیے لازمی عمل تصور کرتا ہے۔ یہ علم روح، جسم اور ذہن کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے تاکہ انسان قلبی سکون کے ساتھ مکمل صحت حاصل کر سکے۔ قدیم ہندوستانی علوم اور علمی روایت میں یوگا کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ آج یوروپ امریکہ، جاپان اور روس جیسے ممالک میں یوگا ایک مقبول ترین ورزش ہے۔

یوگا کی تعلیمات کو انگریزی سے پہلے عربی اور فارسی میں منتقل کیا گیا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں البیرونی نے پاتنجلی کی ''یوگ سوترا'' کو پہلی بار عربی زبان میں ترجمہ کر کے پیش کیا۔ یوگا کی ایک اہم اور تاریخی کتاب ''امرت کنڈ'' ہے، جو ہندوستانی علمی روایت کی اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کتاب میں یوگا کے فوائد اور طریقۂ کار بیان کیے گئے ہیں۔ ''امرت کنڈ'' کو تیرہویں صدی عیسوی میں 'شیخ رکن الدین سمرقندی' نے ''حوض الحیاۃ'' کے نام سے عربی زبان میں منتقل کیا۔ اسی کو سامنے رکھ کر مشہور صوفی عالم 'شیخ محمد غوث گوالیاری (1500-1562) نے سولہویں صدی میں ''بحر الحیات'' کے نام سے پہلی بار ''امرت کنڈ'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

شیخ محمد غوث گوالیاری شطاری سلسلے کے صوفی تھے۔ والد کا نام سید علی تھا۔ حضرت شیخ ظہور حاجی حمید کے مرید تھے۔ وہ عالم دین تھے، ہندو مذہب کی کتابوں کا مطالعہ بھی ان کا عمیق تھا۔ عربی، فارسی کے ساتھ سنسکرت زبان پر بھی ان کو دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے کئی اہم کتابیں لکھی ہیں جو ہندوستان کی صوفیانہ روایت میں اہم اور معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ ''بحر الحیات'' کے علاوہ ان کی دوسری اہم کتاب ''جواہر خمسہ'' ہے جو فارسی میں تصوف پر لکھی گئی ضخیم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ انھوں نے کل سات کتابیں لکھی ہیں، ''بحر الحیات''، ''جواہر خمسہ''، ''اوراد غوثیہ''، ''معراج نامہ''، ''ضمائر اور بصائر''، ''کلید مخازن'' اور ''کنز الوحدہ''۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ ظہور حمید کے حکم پر چونار کے پہاڑی علاقے میں چلے گئے۔ جہاں تقریباً 13 برس سے زیادہ رہے اور اسی دوران یہاں کی پہاڑیوں میں رہنے والے یوگی، سادھو، سنتوں سے گہرے تعلقات قائم ہوئے جس کا اثر ان کی زندگی پر بھی پڑا۔ یوگ سے رغبت یہیں سے پیدا ہوئی اور اس کی تحقیق کی طرف راغب ہوئے۔

''بحر الحیات'' شیخ غوث گوالیاری کی شاہکار تصنیف ہے جو کامروپ (بنگال) کے یوگیوں کی تعلیمات اور یوگ آسنوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہندو سادھو سنتوں اور یوگیوں کے شغل، ان کی طرز زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کتاب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ یوگا کی تعلیمات اور طریقوں پر مشتمل پہلی تصویری کتاب ہے۔ اس میں ایک یوگی سادھو کے بائیس (22) مختلف آسن کی تصویریں ہیں۔ ان تصاویر کے ساتھ آسنوں کے نام اور طریقۂ کار بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی تاریخی اور ادبی دونوں لحاظ سے اہمیت ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو ہندوستانی علمی روایت کی ایک اہم کتاب ہے جس میں اچھی صحت کے لیے یوگا کی افادیت اور یوگا کے طریقۂ کار سے لوگوں کو واقف کرایا گیا ہے اور ادبی اعتبار سے دیکھیں تو اس کتاب کو فارسی میں یوگا کے موضوع پر تحریر کردہ پہلی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ''امرت کنڈ'' کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے اور غوث گوالیاری کی یہ کتاب ''امرت کنڈ'' کی تعلیمات کو جس قدر سلیقے سے سمیٹ کر لکھی گئی ہے ہندوستانی علمی روایت میں یہ ''امرت کنڈ'' کی بہترین نمائندگی کرتی ہے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب نے قدیم ہندوستانی نظام تعلیم کی اہم تاریخی کتاب کو معدوم ہونے سے بچا لیا، ''بحر الحیات'' کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ ایک مسلم صوفی بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری نے شریعت اور

طریقت کی روشنی میں جسمانی صحت مندی کے ساتھ باطنی توانائی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور ریاضت کے لیے ہندو فلسفہ-یوگ کی افادیت اور اس کے طریقۂ کار پر تصویر کے ساتھ کتاب تحریر کی ہے۔

شیخ محمد غوث گوالیاری کا ''بحرالحیات'' کی تالیف کا بنیادی مقصد اس میں موجود پوشیدہ رموز واسرار کو اپنے مریدوں اور تمام صوفیا کے لیے واضح کرنا تھا۔ ان کے نزدیک یوگیوں کے افکار جنھیں وہ علم جسد (جسم کا علم) کہتے ہیں، ایسے نتائج تک پہنچاتے ہیں جو مسلمان صوفیوں کے لیے بھی انتہائی مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ یوگا کی مشقوں اور اشغال پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ اسے اپنے مریدوں پر واجب قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''جوگی سدھ کہتے ہیں کہ ہم ماہیت روح میں درویشوں کے ساتھ متفق ہیں۔ جب کہ اشیا، تنزل و طلعت ترقی کرتی ہیں، حق ہے۔ مگر یہ حقیقت کو پہچانتے ہیں وسیلہ کو چھوڑتے ہیں۔ جوگیوں کی جماعت وسیلے کو پا کر نگہبانی وتتبع کرتی ہے۔ کیونکہ جسد سے معرفت حقیقی پیدا ہوتی ہے۔''[1]

یوگیوں نے جسم کی توانائی پر خاص زور دیا تاکہ اسے محفوظ رکھ کر حقیقت تک پہنچ سکیں اور معرفت حاصل کر سکیں۔ یوگا کے ذریعے یوگیوں نے جسد خاکی کو توانا و تندرست رکھنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ یوگی سدھ کے مطابق روح کی توانائی کے ساتھ جسم کی تندرستی بھی لازمی ہے۔ صرف روح سے معرفت حقیقی لاحاصل ہے۔ صوفیوں کو معرفت حاصل کرنے کے لیے جسم کی حفاظت کو بھی فرض سمجھنا چاہیے جس کے لیے یوگا مفید عمل ہے۔

شیخ محمد غوث گوالیاری ہندو یوگی اور مسلمان عارفین کے اقوال میں یکسانیت پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کے مطابق جو کچھ ہندو یوگیوں نے دریافت کیا ہے وہ صوفیا کے حال کے عین مطابق ہے، اگرچہ مذاہب اور زبانیں مختلف ہیں لیکن بیان ایک ہی حقیقت کا ہے۔ کئی جگہ وہ یوگیوں کی تعلیمات اور اسلامی عقائد کے درمیان فرق کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں لیکن اس تفریق کے بیان میں بھی ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اختلافات کی صحیح تاویل کریں اور دونوں مذاہب کے درمیان ایک تعلق قائم کریں۔

''بحرالحیات'' کے متن کی بات کی جائے تو کتاب کا آغاز حمد باری تعالیٰ اور درود وسلام محمدؐ سے ہوتا ہے

شیخ محمد غوث گوالیاری کا ''بحرالحیات'' کی تالیف کا بنیادی مقصد اس میں موجود پوشیدہ رموز واسرار کو اپنے مریدوں اور تمام صوفیا کے لیے واضح کرنا تھا۔ ان کے نزدیک یوگیوں کے افکار جنھیں وہ علم جسد (جسم کا علم) کہتے ہیں، ایسے نتائج تک پہنچاتے ہیں جو مسلمان صوفیوں کے لیے بھی انتہائی مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ یوگا کی مشقوں اور اشغال پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ اسے اپنے مریدوں پر واجب قرار دیتے ہیں۔

، اس کے بعد مقدمہ ہے۔ مقدمہ ایک تمثیلی سفر سے شروع ہوتا ہے، جس میں مختلف خیالی صورتوں، نفس کے دس دروازوں، پانچ ظاہری اور پانچ باطنی (ظاہری۔ لمس، بینائی، سمع، ذوق اور شم؛ باطنی۔ حس، خیال، وہم، فکر اور حافظہ) کے رازوں کا ذکر کرتے ہوئے تصوف کے فلسفہ کے راز افشاں کر الٰہی مراتب تک پہنچنے کے مراحل کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اصل باب کا آغاز ہوتا ہے۔ کتاب مختلف عنوانات کے تحت دس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب۔ عالم صغیر کی معرفت: دوسرا باب۔ عالم کی تاثیرات کی معرفت: تیسرا باب۔ دل کی معرفت اور تخیلات و واردات کی ماہیت: چوتھا باب: معرفت ریاضت اور اس کی کیفیت: پانچواں باب۔ معرفت ایجاد انسان انواع دم اور اس کی ماہیت اور کیفیت: چھٹا باب۔ معرفت چگونگی جسد اور اس کی ماہیت: ساتواں باب۔ وہم کی معرفت: آٹھواں باب۔ معرفت فساد جسد اور ظاہر ہونے کی علامت: نواں باب۔ تسخیرات: دسواں باب۔ ایجاد عالم کے بیان پر مشتمل ہے۔

باب اول (عالم صغیر کی معرفت) میں آفتاب کو مرکز میں رکھ کر نظام شمسی سے آدم کی تخلیق اور سرشت کو تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیں:

''دو سوراخ بنی مثل آفتاب و ماہتاب۔ اور یہ آیت من آیات اللہ ہے اور نور من نوراللہ ہے۔ عالم ضیا میں ماہتاب آفتاب سے فیض حاصل کرتا ہے۔ اگر آفتاب نہ ہوتا تو تمام عالم ظلمات ہوتا اگر ماہتاب نہ ہوتا تو اٹھائیس منزلیں بیکار ہوتیں اور ان میں کوئی تاثیر نہ ہوتی۔''[2]

اس باب میں طویل صوفیانہ گفتگو کے بعد وہ یہ معنی خیز جملہ بیان فرماتے ہیں کہ ''جس نے اپنے کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا''۔ باب دوم (عالم کی تاثیرات کی معرفت) میں سانس کے نظام کا ذکر کچھ اس طرح سے ہے:

جاننا چاہیے کہ آفتاب اور ماہتاب جیسے عالم کبیر میں ہیں بمعنی خاص عالم صغیر میں بھی موثر ہیں۔ چناچہ عالم صغیر میں آفتاب و ماہتاب دو سوراخ بنی ہیں۔ آفتاب جانب راست ماہتاب جانب چپ۔ اور سانس کبھی جانب راست اور کبھی جانب چپ سے چلتا ہے نوبت نوبت اس واسطے دو چند جمع نہیں ہوتے دوسرے دونوں جہت سے باہر نہیں جاتے مگر حالت خوف اور وقت جماع یا بلندی پر چڑھنے یا ورزش کرنے یا بھاری بوجھ اٹھانے یا کھانے میں۔''[3]

اس باب میں سانس کی ورزش اور اس کے فوائد بیان کیے گئے ہیں۔ جس طرح یوگ میں روح کو جسم پر فوقیت دی جاتی ہے اسی طرح شیخ محمد غوث گوالیاری نے روح کو عالم صغیر مانا ہے اور سانس کو قابو میں رکھ کر سانس کی ورزش کے مختلف جسمانی علاج بھی بتائے ہیں۔ طاقت و قوت حاصل کرنے کے اشغال کا بھی ذکر کیا ہے۔

تیسرے باب میں علم نجوم کے فلسفیانہ مباحث ہیں جنھیں صوفیانہ فکر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چوتھا باب یوگ اور ریاضت کی اہمیت اور اشغال سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں کسب و ریاضت کی تلقین کی گئی ہے تاکہ جسم خراب نہ ہو۔ جب انسان غفلت، شوق مباشرت اور لذت دنیوی میں پڑ جاتا ہے تو جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرتا ہے۔ جو انسان اپنے جسم کی حفاظت نہیں کرتا ہے تو کئی بیماریوں میں مبتلا ہو کر قبل از وقت ضعیف ہو

جاتا ہے۔ اللہ کے فرمان کا حوالہ دے کر ورزش اور یوگ کو جسد خاکی کی توانائی کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان کو حق نہیں کہ وہ خود کو برباد کرے بلکہ اسے چاہیے کہ تن کو ریاضت میں اور فکر کو تصور باطن پر متعین کر دے۔ اس باب میں یوگ کے مختلف آسنوں کے طریقۂ کار کا تصویروں کے ساتھ بیان ہے۔ یہ تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ ان آسنوں کو خالی پیٹ خلوت میں کرنے اور بلا ناغہ روز وقت مقررہ پر کرنے سے ہی اس کا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے اور نتائج حیران کن ہو سکتے ہیں۔ بدن کی صفائی اور لطافت ان چلوں (آسنوں) سے حاصل ہوتی ہے جن کی تعداد چوراسی (84) ہے، ہر ایک آسن کے فوائد الگ الگ ہیں، مگر اس کتاب میں چند مخصوص آسنوں کا بیان ہوا ہے جن کو عمل طور پر برتنے سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں یوگ کی انہیں تیئس (23) اہم آسنوں کا بیان ہے۔ یہ آسن ہیں... ذکر ہنس، طریقہ چلہ، ذکر الکھ، ذکر کھکتی، ذکر نرنجن، ذکر چکری، ذکر بنولی، ذکر گورکھی، ذکر اکوجن، ذکر الندسبد، ذکر نصبد، ذکر سیتکی، ذکر بھونگم، ذکر بورکھ، ذکر تراوت، ذکر کنجری، ذکر ملیکا، ذکر کھنبہ، ذکر یہاں آسن، ذکر جگر آسن، ذکر تھینسہ، ذکر بھیر آسن اور ذکر سن آسن۔ مثال کے طور پر یہاں صرف ایک آسن کا طریقۂ کار دیکھیں:

''طریقہ چلہ'' اس کرم کو سہج آسن کہتے ہیں۔ ترکیب اس کی یہ ہے کہ سر اور کمر اور پشت برابر رکھے اور ساق پر ساق رکھے۔ ٹخنا پائے چپ زیر انتہائے زانوئے راست اور ٹخنا پائے راست انتہائے زانوئے چپ پر رکھے دونوں ہاتھ باہم ملا کر مشغول ہو۔ جو سانس آئے اس کو ہنسو کہتے ہیں۔ جن سے مراد رب روحی ہے اور سو سے مراد نفس کا اندر کھینچنا ہے۔ اس کو رب الارباب کہتے ہیں۔ جب رب روحی رب الارباب کی صورت قبول کر لیتا ہے اس وقت وہ محل تجلی و مشاہدہ و مکاشفہ و معاینہ کا بن جاتا ہے۔ چاہیے کہ اس ذکر کی مواظبت کرے کہ فتح باب غیب الغیوب حاصل ہو۔''[4]

پانچویں باب میں انسان کی تخلیق اور رحم مادر میں لڑکا لڑکی کی تخلیق کے متعلق صوفیانہ تعلیمات اور جوگیوں کے علم کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ دونوں میں ایک قسم کی مطابقت ہے۔ دونوں کے نزدیک انسان کی تخلیق کا مقصد معرفت الٰہی ہے۔ سانس محض زندگی کی علامت نہیں بلکہ انسان کی تخلیق کی اصل پہچان ہے جو روح کی پاکیزگی اور تزکیہ نفس کا ذریعہ بھی ہے۔ چھٹا باب جسم کی حقیقت اس کی ساخت اور روحانی پہلوؤں کی پہچان سے متعلق ہے۔ دراصل یہ خود شناسی کا پہلا قدم ہے جو انسان کو معرفت الٰہی تک لے جاتا ہے۔ ساتواں باب وہم کی معرفت کے بیان میں ہے، جس میں وہم کی حقیقت بیان کرتے ہوئے معرفت حاصل کرنے کے سات درجات کا ذکر کچھ اس طرح سے ہے کہ اہل تصوف کے مراقبے اور جوگیوں کے دھیان میں مماثلت ظاہر ہوتی ہے اور اختلاف کی گنجائش ختم کرنے کے لیے دھیان کی مروج اصطلاحات کے تصوف پر مبنی متبادل بھی پیش کیے گئے ہیں۔ آٹھواں باب جسم کی خرابی اور اس کے بگاڑ کی پہچان کے سلسلے

شیخ محمد غوث گوالیاری کی کتاب اور یوگا کے متعلق ان کی تعلیمات کا واضح پیغام ہے کہ یوگا صرف ورزش نہیں ہے بلکہ زندگی کو بہتر بنانے کا ایک آرٹ ہے۔ یہ ہندوستانی علمی روایت کا وہ تحفہ ہے جو ملک و مذہب سے بالاتر ہو کر نسل انسانی کے لیے جسمانی صحت کا درس دیتا ہے۔ اگر اسے روزمرہ کی زندگی کا حصہ بنا لیا جائے تو یہ نہ صرف بیماریوں سے بچاتا ہے بلکہ توانائی کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

میں صوفیانہ تحریر پر مشتمل ہے اور نواں باب تسخیرات کے بیان میں معرفت کے اس درجے کا بیان ہے جہاں انسان کو اس کی تخلیق کا مقصد معلوم ہو چکا ہوتا ہے اور اس باب میں اسے معرفت حاصل کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ دسویں باب میں ایجاد عالم کا بیان اسلامی تصوف اور جوگیان سدھ دونوں تعلیمات کا موازنہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو متن میں انسانی روح کے ارتقا کا سفر صوفیانہ لہجے میں ہے تو جسم کی توانائی کا درس جوگیوں کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ تصوف اور یوگ کے امتزاج سے معرفت الٰہی کے لیے پاکیزہ روح کے ساتھ توانا جسم بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔

''بحر الحیات'' کے مطالعے کے بعد ایک اہم نکتہ واضح ہوتا ہے کہ کتاب کا مرکزی موضوع ''ہٹھ یوگ'' ہے جس کا بنیادی مقصد جسم کو صحت منداور دل و دماغ کو متوازن رکھ کر روحانی ترقی حاصل کرنا ہے، اس لئے ''بحر الحیات'' کو برصغیر کی روحانی اور علمی تاریخ میں منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب یوگا اور تصوف کے امتزاج پر مبنی قدیم فارسی کتاب ہے۔ یہ کتاب محض ترجمہ نہیں اصل کتاب ''امرت کنڈ'' کی محافظ بھی ہے اور شرح بھی، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری نے تصوف خاص طور پر سلسلۂ شطاریہ کے تناظر میں ''امرت کنڈ'' کی از سر نو تشکیل کی ہے۔ یہ کتاب محض ایک کتاب نہیں بلکہ صوفیانہ تصورات اور ہندوستان کے قدیم یوگ نظریات کے درمیان ایک فکری پُل کا بھی درجہ رکھتی ہے۔

جیسا کہ مذکور ہے کہ ''بحر الحیات'' میں صوفیانہ روایات اور یوگا کے اعمال کا ایک سادہ امتزاج موجود ہے۔ اس متن کا بڑا حصہ ''ہٹھ یوگ'' کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں حبس دم (سانس روکنا)، خاص قسم کے مراقبے، کائناتی تشریحات اور چکروں کی تفصیل شامل ہے لہذا کتاب کے یوگا متن میں موجود ہندومت کے عناصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عناصر چاہے تصوراتی اور فلسفیانہ لحاظ سے ہوں یا عملی تشریحات اور اصطلاحات کے اعتبار سے اس میں واضح طور پر یوگا کے عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔ شیخ محمد غوث گوالیاری کی کتاب اور یوگا کے متعلق ان کی تعلیمات کا واضح پیغام ہے کہ یوگا صرف ورزش نہیں ہے بلکہ زندگی کو بہتر بنانے کا ایک آرٹ ہے۔ یہ ہندوستانی علمی روایت کا وہ تحفہ ہے جو ملک و مذہب سے بالاتر ہو کر نسل انسانی کے لیے جسمانی صحت کا درس دیتا ہے۔ اگر اسے روزمرہ کی زندگی کا حصہ بنا لیا جائے تو یہ نہ صرف بیماریوں سے بچاتا ہے بلکہ توانائی کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

حواشی

1 اکسیر حیات، ترجمہ اردو ''بحر الحیات'' ترجمہ کنندہ/ ناشر، اسلامی پریس دہلی 1315/1897ھ

2 ایضاً؛ ص۔7,6

3 ایضاً؛ ص۔9

4 ایضاً؛ ص۔24

Dr. Md Minhajuddin
(Assistant Professor)
Department of Urdu, Gaya College, Gaya Ji, Bihar.
Mob.: 9304720184,
Email: khanminhaj762@gmail.com

راکیش کمار

ہندوستان اور مغرب کا تصور یوگ

ہندوستان میں یوگا کا تصور محض ایک عملی مشق یا جسمانی سرگرمی نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر روحانی، فکری اور اخلاقی نظام ہے جو انسانی وجود کے ہر پہلو کو اپنے دائرے میں سمیٹتا ہے۔ اس کی بنیاد اس قدیم احساس پر ہے کہ انسان صرف جسم نہیں بلکہ ایک باطنی حقیقت کا حامل ہے اور اس حقیقت تک رسائی کے لیے ایک باقاعدہ راستہ درکار ہے۔ یوگا اسی راستے کا نام ہے۔ ایک ایسا سفر جو انسان کو اس کے ظاہری وجود سے اٹھا کر اس کے اندر پوشیدہ اصل تک پہنچاتا ہے۔ ہندوستانی روایت میں یوگا کا آغاز کسی ایک لمحے یا شخصیت سے منسوب نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ صدیوں کے تجربات، مشاہدات اور روحانی انکشافات کا نتیجہ ہے۔ رشیوں اور منیوں نے جنگلوں اور آشرموں میں بیٹھ کر زندگی، کائنات اور انسان کے باطنی ربط پر غور کیا اور ان کے یہی تجربات رفتہ رفتہ یوگا کی صورت میں سامنے آئے۔ ان کے نزدیک زندگی کا اصل مقصد محض مادی کامیابی نہیں بلکہ اس حقیقت کا ادراک ہے جسے کبھی آتما، کبھی برہمن اور کبھی پرماتما کے نام سے تعبیر کیا گیا۔

یوگا کو اگر محض ایک مشق یا طریقہ حیات سمجھا جائے تو اس کی معنوی وسعت کم ہو جاتی ہے؛ درحقیقت یہ کائنات کی قدامت جتنا قدیم ایک ایسا تجربہ ہے جو بیک وقت سفر بھی ہے اور اس سفر کی آخری منزل بھی۔ یہ منزل دراصل اس ازلی حقیقت کے ادراک کا نام ہے جسے مختلف روایتیں مختلف ناموں سے پکارتی ہیں، آتما، پرش، شو، دیوی یا ستہ مگر سب کا اشارہ ایک ہی اعلیٰ ترین وجود کی طرف ہوتا ہے۔ سانکھیا اور یوگا کے فلسفے میں اسی مطلق حقیقت کو ''پرش'' Purusha کہا گیا ہے جب کہ اس کا وہ روپ جو مادی اور حسی دنیا میں جلوہ گر ہوتا ہے ''پراکرتی'' Prakrithi کہلاتا ہے۔ انسان، جو اپنی انفرادی حیثیت میں ''جیو'' ہے، اسی پراکرتی کے تجربات سے گزرتے ہوئے بتدریج اپنی اصل، یعنی ''پرماتما'' کی طرف لوٹتا ہے۔ گویا پرش اور پراکرتی دو الگ حقیقتیں نہیں بلکہ ایک ہی وجود کے دو رخ ہیں۔ ایک منتہا، دوسرا اس تک پہنچنے کا وسیلہ۔

سنسکرت کا لفظ ''یوگ'' Yuj جس سے ''یوگا'' نکلا ہے، جوڑنے اور ملانے کے معنی رکھتا ہے اور اسی نسبت سے اسے ایک ایسے عمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو بکھرے ہوئے وجود کو پھر سے یکجا کر دیتا ہے۔ لفظ ''یوگا'' کو عام طور پر اتحاد یا وصال کے مفہوم میں بھی لیا جاتا ہے مگر اس کے اندر ایک گہرا روحانی اشارہ مضمر ہے یعنی فرد کا اپنی اصل سے دوبارہ جڑ جانا، اپنی محدود شناخت کو کائناتی کلیت میں تحلیل کر دینا۔ اپنشدوں کی تعلیم کے مطابق جو حقیقت ابتدا میں واحد تھی، وہی کثرت میں ظاہر ہوئی اور یوگا کا عمل اسی کثرت کو پھر وحدت میں ڈھالنے کی ایک شعوری کاوش ہے۔ یوں یہ نہ صرف اس منزل کا نام ہے جہاں انسان اپنے اصل سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے بلکہ وہ راستہ بھی ہے جو اسے اس ہم آہنگی تک لے جاتا ہے۔ دراصل یہ تصور اس بنیاد پر قائم ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ ایک ہی حقیقت کا اظہار ہے اور انسان اسی حقیقت کا ایک جزو ہے۔ مگر انسان اپنی محدود شعوری حالت اور حسی وابستگیوں کی وجہ سے اس وحدت کو بھول جاتا ہے۔ یوگا کا مقصد اسی بھولی ہوئی وحدت کو دوبارہ دریافت کرنا ہے۔ اس لیے اس کے لیے ''اتحاد'' یا ''وصال'' کے الفاظ بھی استعمال میں لائے گئے ہیں۔ ایک ایسا عمل جس میں فرد اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر کلی حقیقت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی فلسفے میں یوگا کا تعلق صرف مراقبے یا خاموش بیٹھنے تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک مکمل طرز زندگی ہے۔ اس میں اخلاقی اصول، ضبط نفس، ذہنی یکسوئی، روحانی تفکر اور عملی توازن سب شامل ہیں۔ یوگا کی ابتدا انسان کے کردار کی اصلاح سے ہوتی ہے، جہاں سچائی، عدم تشدد، قناعت، ضبط اور ایمان جیسے اصول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اصول محض نظری نہیں بلکہ عملی زندگی کا حصہ ہیں کیونکہ یوگی کے نزدیک اندرونی پاکیزگی کے بغیر اعلیٰ شعور تک پہنچنا ممکن نہیں۔ رام اوتار شرما اپنی کتاب یوگ اور صحت میں لکھتے ہیں:

''یوگ ہمیں وہ درخشاں بصیرت عطا کرتا ہے جس کے سہارے ہم دنیا کی بیرونی مشکلوں، اندرونی اندیشوں کا ازالہ کر سکتے ہیں۔ اس فن کے ذریعہ حقیقت ابدی معلوم ہو جانے پر آپسی اختلاف اور جھگڑے طمانت وسکون میں بدل جاتے ہیں۔ جسمانی اور غیر جسمانی اشیا کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر فطرت کے راز آشکار ہو جاتے ہیں اور دکھوں کے بندھن سے چھوٹ کر پرسکون نجات حاصل ہو سکتی ہے''[1]

ہندوستانی روایت میں یوگا کی تفہیم ایک ایسے

کاسمولوجیکل اور انتھروپولوجیکل فریم میں ہوتی ہے جہاں وجود کو محض مادی سطح پر نہیں بلکہ ایک کثیر سطحی حقیقت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہاں انسان کو ایک ایسے وجود کے طور پر سمجھا جاتا ہے جو نہ صرف جسمانی سطح پر متحرک ہے بلکہ ذہنی اور روحانی سطحوں پر بھی مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ یوگا اسی ارتقائی عمل کو منظم کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔فرح فاروقی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''یوگا جسم کو خوبصورت بنانے ،جسمانی حسن کو برقرار رکھنے اور بہترین تفریح کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ نہ تو صرف لڑکیوں اور خواتین کے لیے مخصوص ہے اور نہ مردوں سے۔ بچے ،جوان اور بوڑھے مرد و زن کی قید سے بے نیاز ہو کر کسی بھی وقت یوگا کی مشقوں کو باقاعدگی سے شروع کر کے اپنے حسن و جمال کی حفاظت کر سکتے ہیں۔۔۔ یوگا مغرب سے درآمد کردہ کوئی دوا نہیں بلکہ برصغیر کے اپنے کلچر کی پیداوار ہے اور اسی سرزمین سے نکل کر چین، جاپان اور یورپ کے کئی ممالک میں اس نے اپنے لیے ساز گار فضا پیدا کی ہے اور وہاں جدید سائنسی انداز میں اس پر ریسرچ ہو رہی ہے۔''[2]

پاتنجلی کے پیش کردہ آٹھ مدارج یم، نیام، آسن، پرانایام، پرتیہار، دھارنا، دھیان اور سمادھی درحقیقت ایک ایسے تدریجی سفر کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں انسان اپنے اندرونی انتشار کو نظم میں بدلتا ہے اور اپنی شعوری سطح کو بلند کرتا ہے۔ آسن کا مقصد جسم کو مضبوط یا لچکدار بنانا نہیں بلکہ اسے اس قابل بنانا ہے کہ انسان طویل عرصے تک سکون اور استحکام کے ساتھ بیٹھ سکے۔ پرانایام محض سانس کی مشق نہیں بلکہ زندگی کی توانائی پر قابو پانے کا ایک ذریعہ ہے۔ دھیان ذہن کو یکسو کرنے کا عمل ہے اور سمادھی وہ کیفیت ہے جہاں انسان اپنی محدود انا سے آزاد ہو کر ایک وسیع تر شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستانی روایت میں یوگا ہمیشہ گرو اور شاگرد کے تعلق کے ساتھ جڑا رہا ہے۔ یہ علم کتابوں سے زیادہ تجربے اور رہنمائی کے ذریعے منتقل ہوتا رہا ہے۔ گرو نہ صرف ایک استاد ہوتا ہے بلکہ ایک رہنما، ایک رہبر اور ایک قائد ہوتا ہے جس کی قیادت میں شاگرد اپنے اندر کی حقیقت کو پہچانتا ہے۔

لفظ یوگا کا اولین ذکر رگ وید(Rig Ved) میں ملتا ہے۔اس کے علاوہ اس کی موجودگی دیگر تین ویدوں، 108 اپنشدوں، بدھ مت اور جین مت کے متون، درشنوں، اور رزمیہ کتب جیسے مہابھارت اور رامائن میں بھی پائی جاتی ہے۔ مزید برآں ،یوگا واششٹہ (YOGA VASHISHTA) اور بھگوت گیتا(GITA BHAGAVAD) سب اس امر پر متفق ہیں کہ مادی دنیا کی غیر حقیقت کا گہرا شعور حاصل کیا جائے، دنیاوی اشیا سے دل کو بے نیاز رکھا جائے، حواس کو ضبط میں لایا جائے اور ذہنی توازن کو برقرار رکھا جائے۔ یہ متون انسان کو مظاہر عالم کی ناپائیداری کا ادراک عطا کرتے ہیں، ذہن کی یکسوئی کی تلقین کرتے ہیں اور روحانی ارتقا کے لیے خلوت کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ اسی بنا پر اخلاقی و روحانی اوصاف کو ہر سادھنا کی اساس قرار دیا گیا ہے۔

ہندوستانی فکر میں یوگا کا تعلق وقت کے ایک وسیع تصور سے بھی ہے، جہاں زندگی کو ایک مسلسل سفر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ سفر صرف ایک زندگی تک محدود نہیں بلکہ ایک طویل روحانی ارتقا کا حصہ ہے۔ اس تصور میں انسان کے اعمال، اس کی نیت اور اس کا شعور اس کے مستقبل کی تشکیل کرتے ہیں۔ یوگا اس شعور کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ ہے تا کہ انسان اپنی زندگی کو زیادہ بامعنی اور بامقصد بنا سکے۔ یوگا کا بنیادی مقصد خود شناسی(Self-realization) اور نجات(Moksha) کا حصول ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ یوگا واششٹہ میں رشی واششٹہ کی جانب سے نوجوان رام کو دی گئی تعلیمات (جیسا کہ Valmiki نے بیان کیا) اور بھگوت گیتا میں (جیسا کہ VyasaVed نے روایت کیا) دونوں میں انتہا درجے کی ریاضت(Extremeasceticism) کو نہ صرف ناپسند کیا گیا ہے بلکہ بعض مواقع پر اس پر طنز بھی کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس، رشی واششٹہ اور Krishna دونوں اعتدال کی راہ کو اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں اور افراط و تفریط سے گریز کی تلقین کرتے ہیں۔ان تعلیمات میں یہ پہلو بھی نمایاں ہے کہ اگرچہ دھیان کے لیے تنہائی ناگزیر ہے، تاہم یوگا کے توازن میں قائم رہتے ہوئے دنیا کے اندر اپنے فرائض کی ادائیگی بھی اسی قدر ضروری ہے۔ روشن ضمیر حکمرانوں کی مثالیں، خصوصاً راجا جنک(RajaJanaka) ایک ایسے یوگی۔بادشاہ کی صورت میں پیش کی جاتی ہیں جو دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس سے بے تعلق رہتا تھا۔ یوں قدیم ہندوستانی فکر کی ایک مضبوط آواز یہی رہی ہے کہ انسان دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کا اسیر نہ بنے۔ کنول (lotus) کا پھول اسی حقیقت کی علامت ہے کہ کیچڑ میں جڑیں رکھنے کے باوجود وہ اپنی پاکیزگی اور جمال کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے بلند رہتا ہے۔

ہندوستانی فکر میں یوگا کا تعلق وقت کے ایک وسیع تصور سے بھی ہے، جہاں زندگی کو ایک مسلسل سفر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ سفر صرف ایک زندگی تک محدود نہیں بلکہ ایک طویل روحانی ارتقا کا حصہ ہے۔ اس تصور میں انسان کے اعمال، اس کی نیت اور اس کا شعور اس کے مستقبل کی تشکیل کرتے ہیں۔ یوگا اس شعور کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ ہے تا کہ انسان اپنی زندگی کو زیادہ بامعنی اور بامقصد بنا سکے۔ یوگا کا بنیادی مقصد خود شناسی(Self-realization) اور نجات(Moksha) کا حصول ہے۔

مغربی دنیا میں یوگا کا تصور ایک تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے، جہاں یہ اپنی اصل روحانی بنیادوں سے نکل کر ایک عملی اور روزمرہ زندگی سے جڑا ہوا نظام بن گیا ہے۔ جدید مغربی تناظر میں یوگا کو زیادہ تر ایک ایسی مشق کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو جسمانی صحت، ذہنی سکون اور داخلی توازن کو بہتر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ اس میں آسنوں اور جسمانی حرکات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جب کہ وہ گہری روحانی جہت، جو کلاسیکی یوگا کا خاصہ تھی، نسبتاً پس منظر میں چلی گئی ہے۔ یوں یوگا اب مغرب میں ایک مکمل روحانی تجربہ کم اور ایک صحت بخش طرز زندگی کا حصہ زیادہ بن کر سامنے آتا ہے۔

انیسویں صدی میں جب یورپ اور امریکہ کے اہل علم نے یوگا سے واقفیت حاصل کی تو ابتدا میں ان کی توجہ اس کے فلسفیانہ پہلوؤں پر مرکوز رہی۔ تاہم یہ علمی دلچسپی

زیادہ دیر تک عوامی سطح پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ بیسویں صدی کے وسط تک مغربی تعلیمی اداروں میں یوگا، خصوصاً اس کی جسمانی شکل، زیادہ معروف نہ تھی۔ اس صورتحال میں تبدیلی اس وقت آئی جب Mircea Eliade کی تصنیف (Le Yoga : Immortalite'et Liberte) نے یوگا کو ایک منظم فکری اور عملی نظام کے طور پر پیش کیا، جس میں جسمانی مشقوں کو ذہنی اور روحانی تیاری کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

مغرب میں یوگا کے تعارف اور اس کی فکری بنیادوں کے استحکام میں Swami Vivekananda کا کردار نہایت اہم ہے۔ انھوں نے یوگا کو محض ایک مذہبی یا ثقافتی روایت کے بجائے ایک آفاقی فلسفے کے طور پر پیش کیا، جسے ہر انسان سمجھ اور اختیار کر سکتا ہے۔ ان کے بعد Paramahansa Yogananda نے امریکہ میں کریا یوگا کو فروغ دیا اور اسے ایک عملی روحانی تجربہ بنا کر پیش کیا، جس کی جڑیں Sri Mahasaya Lahiri کی تعلیمات میں پیوست تھیں۔ ایک اہم نام Shivapuri Baba کا بھی ہے جو ملکہ وکٹوریا کی فرمائش پر انگلینڈ گئے اور بڑے پیمانے پر یوگا کو استحکام بخشا۔ بعد ازاں ان کی امریکہ میں موجودگی نے بہت سے امریکیوں کو یوگا کی طرف مائل کیا۔ ان میں ایک بڑی شخصیت Theos Casimir Bernard ہیں جو بعد میں ہندوستان تشریف لائے اور یہاں سے یوگا کی تعلیم حاصل کر کے واپس اپنے ملک جا کر ہٹھ (Hatha Yoga) یوگا پر ایک کتاب تصنیف دی جسے خاصی شہرت حاصل ہوئی۔

اسی تسلسل میں Swami Sivananda نے یوگا کو ایک جامع طرز حیات کے طور پر پیش کیا، جس میں خدمت، محبت، تزکیہ اور مراقبہ کو یکجا کیا گیا۔ اگرچہ وہ خود مغرب نہیں گئے مگر ان کی تعلیمات نے عالمی سطح پر اثر ڈالا۔ بعد کے دور میں B.K.S. Iyengar, Tirumalai Krishnamacharya, Sri Pattabhi Jois, Mahesh Yogi, Swami Vishnu Devananda, اور Selvaranjan Yesudian جیسے اساتذہ نے یوگا کو ایک منظم جسمانی نظام کی صورت میں پیش کیا، جس نے مغربی معاشروں میں اسے تیزی سے مقبول بنایا۔ Indra Devi (جن کا اصل نام Eugenie Peterson تھا) نے ایک دہائی تک بالی ووڈ اور میکسیکو کے درمیان سفر کرتے ہوئے یوگا کی تعلیم دی اور اسے جدید شہری زندگی کا حصہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یوں مغربی دنیا میں یوگا ایک ایسی عملی مشق میں ڈھل گیا جو نہ صرف جسمانی فٹنس بلکہ ذہنی سکون اور توازن کے حصول کا بھی ذریعہ بن گیا۔

> مغربی دنیا میں یوگا کا تصور ایک تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے، جہاں یہ اپنی اصل روحانی بنیادوں سے نکل کر ایک عملی اور روزمرہ زندگی سے جڑا ہوا نظام بن گیا ہے۔ جدید مغربی تناظر میں یوگا کو زیادہ تر ایک ایسی مشق کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو جسمانی صحت، ذہنی سکون اور داخلی توازن کو بہتر بنانے میں مدد دیتی ہے۔

مغرب میں یوگا کی نئی تعبیرات نے اسے ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ جدید سائنسی تحقیق نے نہ صرف یوگا کے فوائد کو ثابت کیا بلکہ اسے ایک ایسے عالمی مکالمے کا حصہ بنایا جس میں مختلف ثقافتیں ایک دوسرے کے تجربات سے سیکھتی ہیں۔ اس طرح یوگا ایک ''بین الثقافتی مظہر'' (Intercultural Phenomenon) بن گیا ہے جس میں مشرق اور مغرب دونوں کا اشتراک شامل ہے۔ اس تناظر میں یوگا کو ایک ایسے متحرک تصور کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو مختلف تہذیبوں میں مختلف معانی اختیار کرتا ہے مگر اپنی بنیادی روح یعنی داخلی سکون اور ہم آہنگی کی تلاش کو برقرار رکھتا ہے۔

اگر اس پورے تقابل کو ایک فکری زاویے سے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں یوگا کا تصور ''وجودی'' (existential) ہے جب کہ مغرب میں یہ ''عملی'' (pragmatic) بن جاتا ہے۔ بھارت میں یوگا انسان کو اپنی ذات سے ماورا لے جا کر ایک کائناتی حقیقت کے ساتھ جوڑتا ہے جب کہ مغرب میں یہ انسان کو اس کی روزمرہ زندگی کے مسائل سے نمٹنے کا ایک ذریعہ فراہم کرتا ہے۔ ایک میں یوگا کا مقصد ''خودی کی نفی'' ہے جب کہ دوسرے میں ''خودی کی بہتری''۔ یہ فرق دراصل دو مختلف تہذیبی اور فکری رویوں کا عکاس ہے۔ ایک میں حقیقت کو باطنی تجربے کے ذریعے سمجھا جاتا ہے اور دوسرے میں حقیقت کو تجرباتی اور سائنسی طریقوں سے پرکھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود دونوں تصورات میں ایک گہری مماثلت بھی موجود ہے اور وہ ہے انسان کا داخلی سکون اور توازن کی جستجو۔ یہی وہ مشترک بنیاد ہے جو یوگا کو ایک عالمی اور ہمہ گیر عمل بناتی ہے۔ یوگا دراصل ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر تہذیب اپنی ترجیحات، اپنے مسائل اور اپنی امیدوں کو منعکس دیکھتی ہے۔ بھارت میں یہ آئینہ روحانیت کی روشنی سے منور ہے جب کہ مغرب میں یہ عقل اور سائنس کی روشنی میں چمکتا ہے۔ ان دونوں زاویوں کے درمیان یوگا کی اصل وسعت اور معنویت پوشیدہ ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ یوگا نہ تو صرف ایک قدیم روایت ہے اور نہ ہی محض ایک جدید رجحان بلکہ یہ ایک ایسا زندہ اور متحرک تصور ہے جو مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ اس کی اصل قوت اسی میں ہے کہ یہ مختلف تہذیبوں کے درمیان ایک مکالمہ قائم کرتا ہے اور انسان کو اپنے باطن کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو یوگا کو نہ صرف ایک علمی موضوع بناتا ہے بلکہ ایک ایسے انسانی تجربے کی صورت بھی دیتا ہے جو ہر زمانے اور ہر معاشرے میں اپنی معنویت برقرار رکھتا ہے۔

حواشی

1۔ شرما، رام اوتار، یوگ اور صحت، مترجم حسان عتیق، لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ، 1988، ص: 11

2۔ جاوید، اسما، یوگا اور حسن، ایس کے آفسیٹ، دہلی، 1997، ص 3، 4۔

3۔ D.G White Yoga in Practice, Princeton NJ: Princeton University Press, 2012c

4۔ Syman. S. The Story of Yoga in America, New York: Farrar Straus and Giroux, 2010

5۔ رگ وید The Reg Veda، 2022

Dr. Rakesh Kumar
Assistant Professor
Dept. of Urdu, Kashmir University,
Srinagar-190006
Email: rakeshjnu000@gmail.com,
Mob: 9103975270

اسعد اللہ

جسمانی صحت اور فلسفۂ یوگ

ہندو میتھالوجی کے مطابق یوگا بنیادی طور پر ایک انتہائی لطیف سائنس پر مبنی روحانی نظام ہے جو دماغ اور جسم کے درمیان ہم آہنگی لانے پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ لفظ 'یوگ' سنسکرت کے لفظ 'یوج' سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے 'جوڑنا' 'متحد کرنا' اور جب ہم 'یوگی' کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ایسا شخص جو یوگا کی مشق کرتا ہے۔ یہ مشق انفرادی شعور کے ساتھ ساتھ عالمگیر شعور اور اتحاد کی طرف لے جاتی ہے، جو دماغ اور جسم، انسان اور فطرت کے درمیان کامل ہم آہنگی کی نشاندہی کرتی ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ڈاکٹر برج بھوشن کی کتاب سے یہ اقتباس پیش کیا جارہا ہے ان کے مطابق ''شیو جی یوگ کے علم کے اصلی خالق ہیں۔ دل کو ادھر اُدھر بھٹکنے سے روکنا ہی یوگ ہے۔ کام میں مہارت ہی یوگ ہے۔ سکھ اور دُکھ میں یکساں رہنا ہی یوگ ہے۔ یاگیہ بلک سنتا نامی کتاب میں روح اور پروردگار عالم کے ملاپ کو یوگ کہا گیا ہے۔ یوگ سے نیک عمل اور ہنر کی حفاظت ہوتی ہے۔ یوگ کے ذریعہ علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یوگ کے برابر کوئی طاقت نہیں ہوتی''۔[1] وہ آگے لکھتے ہیں'' یوگ کے آٹھ حصے ہیں اور یوگ کے موجد رشی پتنجلی نے اس کو آٹھ حصوں والا یوگ (آشٹانگ یوگ) کہا ہے۔ اس میں (1) یم (2) نیم (3) آسن (4) پرانا یام (5) پرتیا ہار (6) دھارنا (7) دھیان اور (8) سمادھی آتے ہیں۔ پھر اس کی انھوں نے تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یم کے ذریعہ دوسرے جانداروں کے ساتھ عملی زندگی نیک اور نورانی بنتی ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں۔

اہنسا (عدم تشدد): دل، دماغ اور جسم سے کسی بھی جاندار کو دکھ نہ دینا عدم تشدد کے زمرے میں آتا ہے۔ سچائی: دھوکا اور فریب سے مبرا عمل ہی سچائی ہے۔ چوری نہ کرنا: کسی کی کوئی چیز نہ چرانا، کام کی مناسب اجرت نہ دینا بھی چوری ہے۔ برہم چریہ (تجرد) دل، دماغ اور جسم سے ہونے والے سب طرح کے مباشرتی افعال کا تمام حالات میں ترک کردینا، سب طرح کا ویرج (دھات/ مذی/ منی) کی حفاظت کرنا برہم چریہ (تجرد) ہے۔ اپری گرہ: بلا ضرورت سامان اکٹھا نہ کرنا ہی اپری گرہ (قناعت) ہے۔[2]

یوگا فلسفے کا ایک اہم پہلو جمود اور ٹھہراؤ کو درکنار کرکے انسان کے انداز حیات اور بود و باش میں تبدیلی لانا ہے۔ اسی لیے جنھوں نے اس کی تاریخ اور اس کے فلسفے پر بات کی ہے ان کا ماننا ہے کہ یہ ہندوستان کی عظیم وراثت ہے اور اس کو بڑھاوا دینا، اس بابت عوام کو آگاہ کرنا، اس کی طرف لوگوں کو مائل کرنا، اسے سیکھنا، سکھانا دراصل اپنے دھرو ہر اور وراثت کی حفاظت کرنا ہے۔ ذہن کو صاف کرکے اس بابت مطالعہ کیا جانا بھی اسی ضمن میں شامل ہے۔ یوگا کے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس کے اصول اور ضابطے سناتن دھرم کے ماننے والوں کے لیے آفاقی سکون دیتے ہیں اور مختلف امراض میں تریاق کا کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سانس سے متعلق بیماریاں، قلب و جگر، ذہنی تناؤ اور ماحولیاتی کشیدگی اور کثافت میں انسانی جسم کے توازن کو برقرار رکھنے میں مدد و معاون ہیں۔ ہری کرشن داس گوئند نے لکھا ہے کہ'' ادراک انسانی کے اعلیٰ ترین مقام تک رسائی یا مجاز کی قید سے رہائی یا نجات ہے۔ لہٰذا ان دونوں فلسفوں کا ایک ہی موضوع ہے لیکن دونوں کی مزاولت میں تفاوت ہے۔ یوگ میں منزل مقصود کا حصول کیفیات قلب کو مسدود کرکے کیا جاتا ہے اور سانکھیہ میں روح شخصی کی پاک ہیئت کے علم کی تکمیل باطن کے غائر مطالعہ اور تفکر سے کی جاتی ہے۔ اجمالی نظر سے سانکھیہ کی طریقت علم اور یوگ کی طریقت عبادت ہے۔ سانکھیہ میں علم افضل فعل اور عبادت ثانوی ہیں جب کہ یوگ میں فعل اور عبادت افضل ہیں۔ دونوں کے ابتدائی مدارج اور منزل مقصود یعنی دنیاوی اذیتوں کا ازالہ اور ذات کا اپنی ہیئت میں قیام کرنا ایک ہی ہیں۔ یوگ کا راستہ لمبا ہے لیکن سانکھیہ کے مقابلے آسان ہے۔ سانکھیہ کے علم کا راستہ چھوٹا ہے لیکن دشوار ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جب ہم اپنے میں اس کی یعنی ذات کی بحث کی کھوج کرتے ہیں تو یہ یوگ ہے اور جب اپنے میں خود کی کھوج کرتے ہیں تو یہ سانکھیہ ہے۔ ایک کہاوت یہ بھی ہے کہ سانکھیہ سا کوئی علم نہیں اور یوگ کی سی کوئی دوسری قوت نہیں''۔[3]

یوگ کی دنیا میں پانچ ایسے فلسفے ہیں جن سے دور رہنے کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے۔ ان میں (1) جہالت (2) انانیت (3) رغبت (4) نفرت اور (5) خوف ہے۔ اس کی تشریح اس طرح سے ہے کہ جہالت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ جہل سے مراد صرف یہی نہیں کہ کسی کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا یہ تو بعد میں وجود میں آیا کہ کیسے پڑھنا اور کیسے لکھنا ہے۔ تعلیمی تاریخ اس ضمن میں رہنمائی کرے گی کہ اس کی صحیح تاریخ کب سے شروع ہوئی۔ لیکن یوگ کی دنیا میں جہالت سے مراد گمراہی، عقل و شعور کی کمی، اخلاقیات اور بداعتقادی کے ساتھ ساتھ ایک 'پرماتما' کو نہ ماننا ہے۔ جب کہ

سمجھدار اور عقلمند انسان سب سے پہلے اپنے جسم کی حفاظت اور بیماریوں سے بچاؤ کا سامان تیار کرتا ہے۔اس کے لیے وہ بہترین اور طاقتور غذائیں کام و دہن میں لاتا ہے تاکہ صحت کی دیکھ بھال ہو سکے اور 'پرانایام' کر سکے۔دوسرا ہے انانیت: اس سے مراد کسی بھی شخص کی خودی کی شناخت اور خودی کی قدر کا شعوری احساس ہے، جو بنیادی خواہشات اور حقیقت کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کرتا ہے۔یہ انفرادیت کا احساس فراہم کرتا ہے، جب کہ بنیادی طور پر انا کے اندر تخریبی کا رویہ اور عنصر موجود ہوتا ہے، جس کی وجہ سے تکبر اور غرور پیدا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جب انسان اپنی صلاحیتوں کو کسی اچھے کام میں لگاتا ہے مثلاً کسرت کرنا، کھیل کود میں حصہ لینا، جسمانی ورزش کے تئیں حساس ہونا تو یہی 'انا' اس کی زندگی کے فلسفے کو ایک اچھے موڑ پر لا کھڑا کرتی ہے اور اس کے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ میرا جسم میری طاقت ہے۔انا کا ایک دوسرا مثبت پہلو بھی ہے جس کے مطابق یہ دماغ کا وہ حصہ ہے جو توازن، خود آگہی اور جذباتی ضابطہ فراہم کرتا۔ یہ پس منظر میں خاموشی سے کام کرتا ہے، جذبات کو معتدل کرتا ہے، اور ان طریقوں سے جواب دینے میں مدد کرتا ہے جو حقیقت پسندانہ اور سماجی طور پر مناسب ہوں۔رغبت: اس سے مراد کشش، دلکشی، یا سحر کا ایک طاقتور معیار ہے جو کسی کو یا کسی چیز کو پرکشش بناتا ہے۔ یہ اکثر مقناطیسی نظریہ کے ساتھ ہمارے ذہن کو اپیل کرتا ہے۔جس سے کسی اچھے انسان کی چاہت، اچھے گھر، خوبصورت وادیاں، پہاڑ، جھرنے مختلف طرح کے تصورات ہمارے دل میں جاگزیں ہوتے ہیں۔نفرت: دشمنی، عداوت، یا انتہائی ناپسندیدگی کا ایک شدید، گہرا جذبہ انسانوں میں پنہاں ہوتا ہے، جو اکثر خوف، غصہ، یا چوٹ کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔یہ افراد، گروہوں یا تصورات کی طرف ایک طاقتور اور غیر معقول نفرت کے طور پر کام کرتے ہیں، جو اکثر تعصب اور جارحیت کو جنم دیتا ہے۔اسے عام طور پر محبت کا مخالف سمجھا جاتا ہے۔نفرت کی بنیادی وجوہات میں اکثر خوف، غصہ، یا خطرہ جڑا ہوا ہوتا ہے جس کا اظہار زبانی بدسلوکی، ایذا رسانی، غنڈہ گردی، یا جسمانی تشدد کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔جب کہ سماجی سیاق وسباق (Context) میں یہ ایک منظم تعصب پر مبنی ہوتا ہے۔خوف: ان سات آفاقی جذبات میں سے ایک ہے جس کا تجربہ دنیا بھر میں ہر کوئی کرتا ہے۔خوف جسمانی، جذباتی، نفسیاتی، حقیقی یا تصوراتی، نقصان کے خطرے کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ روایتی طور پر ایک منفی جذبہ ہے۔تاہم اسے یوگا کی مشق سے قابو میں لایا جاسکتا ہے۔

یوگا کی دنیا میں ان پانچوں عناصر پر قابو پایا جاسکتا ہے کیونکہ اس کا فلسفہ انتہائی سادہ اور ذہن کو اپیل کرنے والا ہے۔ان امور پر عمل آوری کے لیے یہ اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔''یوگا تمام جسم میں ایک خوش کن ہیجان اور سرور پیدا کرتا ہے اور پھر ہم اپنے جسم میں چستی اور ذہن

یوگا کے وجود کے تاریخی پہلو، پہلے ویدک دور (2700 قبل مسیح) میں اور اس کے بعد پتنجلی کے دور تک ملتے ھیں۔ اس وقت کے جو اھم ماخذدستیاب ھیں، جن سے ھمیں اس دور میں یوگا کے طریقوں کے بارے میں معلومات ملتی ھیں ان میں وید، اپنشد، بدھ مت کی تعلیمات، جین مت، پانینی، پرُان اور مھاکاویہ وغیرہ میں دستیاب ھیں۔ عارضی طور پر، (500 قبل مسیح سے لے کر 800 عیسوی) کے درمیان کا عرصہ کلاسیکی دور کے طور پر یاد کیا جاتا ھے جسے یوگا کی تاریخ اور ترقی میں سب سے زیادہ زرخیز اور نمایاں دور بھی سمجھا جاتا ھے۔

میں زندہ دلی محسوس کرتے ہیں۔ بسیار خوراکی، سگریٹ نوشی اور اسی طرح کے دوسرے انسانی عوامل میں یوگا جسم اور ذہن کی قدرتی کارگزاری کے درمیان ایک توازن پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔باقاعدہ مشق سے ہم اپنے آپ سے ہم آہنگ ہو کر اپنی خوراک، لباس اور دوسرے معمولات میں توازن پیدا کر لیتے ہیں اور اس طرح ضرورت سے زیادہ سگریٹ وشراب نوشی اور بسیار خوراکی پر قابو پا لیتے ہیں۔یوگا ایک خوش ترتیبی ہے، نہ ان کے لیے جو بہت زیادہ کھاتے ہیں اور نہ ان کے لیے جو بہت کم کھاتے ہیں۔نہ ان کے لیے جو بہت زیادہ سوتے ہیں اور نہ ان کے لیے جو بہت کم سوتے ہیں۔ جب کوئی انسان اپنے نفس کا مالک بن جاتا ہے تو وہ یوگی کہلاتا ہے پھر اس کے لیے سونا، پتھر یا زمین سبھی ایک جیسے ہو جاتے ہیں ان میں اسے کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔وہ اپنی روح کی بلندیوں پر رہتا ہے اور وہاں سے وہ اپنے عزیز واقارب کو دیکھتا ہے جو اس کے ساتھ لاتعلق ہیں، غیر جانبدار ہیں، جو اس سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ سب کو اندرونی قلبی سکون کے ساتھ دیکھتا ہے۔ پھر اسے اس بات کا بالکل احساس نہیں ہوتا کہ کون اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔پھر وہ اپنی رومانی زندگی میں مگن ہو جاتا ہے''۔4 ارنسٹ ووڈ کی کتاب کا یہ اقتباس مزید وضاحت کرتا ہے کہ''ہمیں لامحدود اور بہتر موقع کی تلاش میں اپنے سے چھوٹے وجود سے باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح یہ احساس لالچ، نفرت، تعصب، حماقت اور نفس پرستی کو ختم کرتا ہے''۔5 جتنا قدیم یوگ کی دنیا ہے اتنا ہی اس کا فلسفہ بھی ہے۔تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوگا کی مشق تہذیب کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی۔ روایت کے مطابق مذاہب یا عقائد کے نظام کے پیدا ہونے سے بہت پہلے اس کا مشق کیا جاتا رہا ہے۔یوگا کے پہلے معلم شیوجی کو مانا گیا اور انھیں ہی پہلے یوگی یا آدیوگی (گرو یا آدی گرو) تسلیم کیا جاتا ہے۔ انڈس سرسوتی تہذیب جسے ہڑپا تہذیب کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے، کے مہروں کی باقیات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا گیا کہ قدیم ہندوستان میں یوگا کی موجودگی کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یوگا کے وجود کے تاریخی پہلو، پہلے ویدک دور (2700 قبل مسیح) میں اور اس کے بعد پتنجلی کے دور تک ملتے ہیں۔اس وقت کے جو اہم ماخذ دستیاب ہیں، جن سے ہمیں اس دور میں یوگا کے طریقوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں ان میں وید، اپنشد، بدھ مت کی تعلیمات، جین مت، پانینی، پرُان اور مہاکاویہ وغیرہ میں دستیاب ہیں۔عارضی طور پر، (500 قبل مسیح سے لے کر 800 عیسوی) کے درمیان کا عرصہ کلاسیکی دور کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جسے یوگا کی تاریخ اور ترقی میں سب سے زیادہ زرخیز اور نمایاں دور بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ دور بنیادی طور پر ہندوستان کے دو عظیم مذہبی اساتذہ مہاویر اور گوتم بدھ کے لیے معنون کیا جاسکتا ہے۔یوگا کا جدید دور سنہ 1700 سے لے کر 1900 تک کا مانا جاتا ہے۔یہ دور جدید دور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس میں عظیم یوگا آچاریہ رمنا مہارشی، رام کرشنا پرم ہنس، پرم ہنس یوگ نند اور وویکانند وغیرہ نے یوگا کی ترقی اور اس کے تئیں بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار

ادا کیا ہے۔ اسی دور میں ویدانت، بھگتی یوگا، ہتھیوگا یا ہتھ یوگا (جسمانی یوگا) اپنے عروج کو پہنچا۔

ہندوستان کی موجودہ حکومت نے اس جانب مزید توجہ مبذول کی اور کئی اہم اصلاحات کے ساتھ ساتھ یوگا کو پوری دنیا میں نئے سرے سے متعارف کروایا۔ حکومت ہند کی اس پہل کی وجہ سے اقوام متحدہ (UNO) میں دنیا کے 170 ممالک نے یوگا کے حق میں ووٹ کیا اور آج عرب، افریقہ اور مغربی ممالک میں یوگا کے تئیں بیداری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے سابق پروفیسر سی پی بھامبری مرحوم کے انگریزی مضمون سے، ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جس کو انھوں نے 5 جولائی 2015 میں تحریر کیا تھا وہ لکھتے ہیں ''یوگا جیسی مکمل طور پر انفرادی جسمانی ورزش کو آزادی کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک قومی درجہ دیا گیا ہے۔ کیونکہ مرکزی حکومت نے اعلان کیا کہ 21 جون، ہندوستانی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت سے جانا جائے گا۔ سبھی ہندوستانی باشندگان سے سرکاری سطح پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں یوگا کی مشق کریں گے۔ مرکزی حکومت نے ہر سرکاری ملازم، خود مختار یونیورسٹیوں/ کالجوں اور دیگر سے 21 جون کو 'بین الاقوامی یوگا ڈے' کے طور پر منانے کی اپیل کی۔ جسے اقوام متحدہ نے وزیر اعظم نریندر مودی کی پہل پر قبول کیا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں یہ بھی پہلی بار ہوا ہے کہ 21 جون کو مرکزی حکومت کی زیر قیادت سماج کے سبھی طبقوں نے اس جانب اپنی دلچسپی کا اظہار کیا''۔ 6

دنیا کی قدیم ترین ثقافت اور تہذیب و وراثت میں، ہندوستان کی اپنی الگ شناخت اور پہچان ہے اور یوگا انہی میں سے ایک ہے۔ یوگا کے عالمی دن پر وزیر اعظم نریندر مودی کے خطاب کا یہ اقتباس یوگا کی مشق کرنے اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ خطاب یوگا کے جدید فلسفے کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ ''یوگا جسم، دماغ، روح اور عقل کا اتحاد ہے۔ یہ محض ایک جسمانی ورزش نہیں ہے بلکہ ایک ذہنی نظم و ضبط بھی ہے۔ ایک ہی وقت میں، یہ ہمارے باطن کو پہچاننے کے ایک ذریعہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ یوگا ہماری خود آگاہی یا روحانی شعور کو بیدار کرتا ہے۔ ہمارے طرز زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔ یوگا کو اپنا کر ہم اپنی زندگی کو نئی بلندیوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ یوگا ہمیں ایک صحت مند جسم، ایک متوازن ذہن، اور مثبت ماحول میں کام کرنے کی صلاحیت فراہم کرتا ہے۔ اس کا مقصد صرف ایک صحت مند جسم نہیں بلکہ ایک صحت مند ذہن اور صحت مند قوم کی تشکیل بھی ہے۔ یوگا کا بنیادی مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کو اپنانے، خود کو جاننے اور اپنی زندگی کو جسمانی اور ذہنی توازن کے ساتھ آگے بڑھنے کی ترغیب دینا ہے''۔ 7 یوگ کا جدید فلسفہ اور ہندوستانی نظریہ کی بات کی جائے تو یوگا ہندوستانی ثقافت کا ایک انمول تحفہ ہے، جس نے پوری دنیا کو صحت مند زندگی گزارنے کی سمت دی ہے۔ اسے ایک شاندار سائنس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو جسم، دماغ اور روح کو متحد کرتی ہے۔ یوگا جسمانی صحت کے تناظر میں ایک بنیادی سچائی بیان کرتا ہے۔ زمین پر تمام زندگی کی فلاح و بہبود ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔

یوگا انسان کو اس گہرے تعلق کی طرف بیدار کرنے میں مدد کرتا ہے اور دنیا کے ساتھ اتحاد کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یوگا کا جدید فلسفہ سکھاتا ہے کہ ہم الگ تھلگ افراد نہیں بلکہ فطرت کا لازمی حصہ ہیں۔ ابتدائی طور پر انسان صحت اور تندرستی کی دیکھ بھال کرنا سیکھتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ، یہ دیکھ بھال پورے ماحول، معاشرے اور سیارے تک پھیل جاتی ہے۔ یوگا ایک گہرا ذاتی نظم و ضبط ہے جو ایک ہی وقت میں، ایک اجتماعی نظام کے طور پر کام کرتا ہے، جو افراد کو 'میں' سے 'ہم' میں تبدیل کرتا ہے۔ یہی جذبہ ہندوستان کی روح کو سمیٹتا ہے، اور ہندوستانی اقدار کی عکاسی کرتا ہے جو افراد کو ذاتی مفاد سے بالاتر ہونے اور سب کی فلاح و بہبود کو اپنانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ یوگا کا ثقافتی فلسفہ خدمت، بے لوث محبت اور ہم آہنگی کی بنیاد رکھتا ہے۔ دنیا بھر میں تناؤ، عدم استحکام اور تنازعات کی بڑھتی ہوئی سطح اور کشیدگی کی حالت میں یوگ کا فلسفہ انسانی زندگی کے غموں کا مداوا ہے جہاں اندرونی امن عالمی پالیسی بن جاتا ہے۔ یوگا کا فلسفہ ایک پر امن، متوازن اور پائیدار کرۂ ارض کی تعمیر کے لیے ایک جامع نقطۂ نظر کے طور پر عالمی سطح پر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

جسمانی صحت اور یوگ کے فلسفے کے متعلق اتنی بات ہر انسان کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ یہ کوئی علم الاصنام نہیں بلکہ مشقی عمل ہے۔ اس کے تحت چھ فلسفی نظام ہیں جن میں ویدانتا، اپنشد، سانکھیہ، وشیکا، مماسا، اور 'یوگا' ہیں۔ یوگا کے ضمن میں زیادہ تر عمل اور آسن ویدانتا اور سانکھیہ سے ماخوذ ہیں۔ یوگا کا بنیادی نظریہ ہے کہ انسانی زندگی مشکلات اور مصائب کے ساتھ وابستہ ہے۔ یوگا کی مشق کر کے انسان سچائی اور معرفت کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ زندگانی کے اس پہیے میں انسان کو خدا کی عطا کردہ نعمتوں اور علوم سے فائدہ اٹھاتے رہنا چاہیے۔ خدا کی معرفت بغیر دشوار راہوں سے گزرے ہوئے ناممکن ہے۔ یوگا روایات کے مطابق اس کے دو اہم اور بنیادی فلسفے ہیں جنھیں 'یاما' اور 'نیاما' سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی کہ 'یاما' کا فلسفہ تشدد، چوری، بے ایمانی، اور حرص و طمع سے منع کرتا ہے۔ جب کہ 'نیاما' کا فلسفہ کہتا ہے کہ انسان کو پاکیزگی، سادگی، قناعت، مطالعہ، اور خدا کے ساتھ عقیدت رکھنا لازمی ہے۔ یہ فلسفے مثبت رویے کے عکاس اور انسانی زندگی کے لیے بے حد اہم اور ضروری مانے جاتے ہیں۔ یعنی جس کے اندر مذکورہ بالا تمام صفات ہوں گی وہ ایک بہترین انسان مانا جائے گا اور سماج میں اپنے مثبت نظریے سے اس کی صحیح رہنمائی کر سکے گا۔ زندگی کے مشاغل اور بھاگ دوڑ میں یوگا کا عمل انسانی جسم اور اس کے دل و دماغ کو ایک پر سکون چادر فراہم کرتا ہے جو کبھی میلی نہیں ہو سکتی۔

حوالہ جات

1 قدرتی صحت اور یوگ، ڈاکٹر برج بھوشن گوئل، آل انڈیا نیچر کیور فیڈریشن، نئی دہلی، 2004، ص 109۔
2 قدرتی صحت اور یوگ، ڈاکٹر برج بھوشن گوئل، آل انڈیا نیچر کیور فیڈریشن، نئی دہلی، 2004، ص 110۔
3 پتنجلی کا فلسفہ یوگ، ہری کرشن داس گوئنکا، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1989، ص 10۔
4 یوگا سب کے لیے، صدف ناز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، سنہ درج نہیں، ص 45۔
5 یوگا، ارنسٹ ووڈ، پینگوئن بکس، نئی دہلی، 1959، ص 176۔
6 سی پی بھامبری، انگریزی آرٹیکل، 5 جولائی 2015۔
7 خطاب بین الاقوامی یوم یوگا، نریندر مودی، 21 جون 2025۔

■

Asadullah C/o Mohd Mohsin
1444/45 Faiyaz Ganj,
Azad Market Old Delhi
Delhi-110006
Mob. 9918427753
Email: asadullahjnu@gmail.com

بین الاقوامی یوم یوگ

محمد طلحہ

یوگا: موجودہ عہد کی ایک ضرورت

آج کے تیز رفتار اور مقابلہ جاتی دور میں انسان جہاں بے شمار سہولیات سے مستفید ہو رہا ہے وہیں ذہنی دباؤ، بے چینی اور جسمانی بیماریوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے ایسے حالات میں یوگا ایک اہم اور مؤثر ذریعہ بن کر سامنے آتا ہے جو انسان کو نہ صرف جسمانی صحت فراہم کرتا ہے بلکہ ذہنی سکون اور روحانی توازن بھی دیتا ہے۔

یوگا کا آغاز قدیم ہندوستان میں ہزاروں سال پہلے ہوا ہے اور یہ دنیا کی قدیم ترین روحانی و جسمانی مشقوں میں شمار ہوتا ہے اس کی جڑیں ہندومت اور قدیم بھارتی فلسفے میں ملتی ہیں۔ یوگا کا ذکر سب سے پہلے قدیم مذہبی متن رگ وید میں ملتا ہے جو تقریباً 1500 قبل مسیح کے آس پاس لکھا گیا بعد میں یوگا کی تعلیمات کو زیادہ منظم شکل یوگا سوترا میں دی گئی حکیم پتنجلی نے یوگ سوتر میں لکھا ہے کہ ''آج سے پہلے یوگا صرف اور صرف آشرموں اور گروؤں تک محدود رہا لیکن اب یہ عام انسانوں تک بھی پہنچ چکا ہے''۔ اب ہر سال پوری دنیا میں ۲۱ جون کو International Yoga Day منایا جاتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک تحریک بن چکی ہے۔ سوامی ستیانند سرسوتی نے کہا ہے: ''یوگا صرف ورزش نہیں بلکہ ایک چراغ ہے جو باطن کی تاریکی کو دور کرتا ہے''۔

یوگا کے فوائد جاننے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یوگا دراصل کیا ہے؟ یوگا زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے جس کا مقصد ایک صحت مند جسم میں صحت مند دماغ کا ہونا ہے، انسان ایک جسمانی، ذہنی اور روحانی وجود ہے یوگا ان تینوں کے درمیان توازن پیدا کرنے میں مدد کرتا ہے۔ جیسا کہ ہندوستان میں آیورویدا میں بتایا گیا ہے؛ یوگا صرف جسم کو موڑنے اور سانس کو روکنے کے بارے میں نہیں ہے یہ آپ کو ایسی حالت میں لانے کی تکنیک ہے جہاں آپ حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں اور کھلی آنکھوں سے اس کا تجربہ کرتے ہیں جو آپ کی توانائی کو پرجوش بنا کر ہر چیز کو ایک بناتا ہے، یہ وہ اتحاد ہے جو یوگا تخلیق کرتا ہے۔

موجودہ دور میں یوگا ذہنی سکون کے لیے بہت ضروری ہے۔ آج کل انسان ڈپریشن اور Anxiety کا شکار ہے اور اس قدر مصروف ہے کہ خود کی صحت پر دھیان دینے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا اور وہ ڈپریسڈ ہو جاتا ہے اسے نفسیاتی ڈاکٹر کی ضرورت درکار ہوتی ہے اور ڈاکٹر اسے خاص سانس لینے کی تکنیک بتاتے ہیں جسے ''پرانا یام'' کہتے ہیں اسی آسن سے بلڈ سرکولیشن بڑھتا ہے اور ذہنی سکون ملتا ہے جیسا کہ کرشنا آچاریہ نے کہا ہے کہ ''سانس لو'' بھی یوگا کا پہلا اور آخری سبق ہے۔

اس طرح باقاعدگی سے یوگا کی مشق مزاج کو فوری طور پر بہتر بناتی ہے جسم کو تازگی بخشتی ہے۔

اس سے جسم میں خون کی گردش بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے بلڈ پریشر میں نمایاں کمی واقع ہوتی ہے۔

یوگا زہریلے مادوں اور آزاد ریڈیکلز کو ختم کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اور تناؤ کو بھی دور کرتا ہے جو کہ عمر بڑھنے کا ایک عنصر ہے۔

یہ تناؤ کو کم کر کے جسم کو نرم کرتا ہے۔ جب جسم آرام کرتا ہے تو نبض کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ نبض کی کم شرح اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اب دل اتنا مضبوط ہے کہ کم دھڑکنوں کے دوران زیادہ خون پمپ کر سکے۔

یوگا جسم میں آکسیجن کو بہتر کرتا ہے اور دل کی دھڑکن کو بھی کم کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں قلبی قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے۔

یوگا میں پوری طرح سانس لینا شامل ہے۔ اس میں پھیپھڑوں کو ان کی پوری صلاحیت میں بھرنا پڑتا ہے اس طرح وہ زیادہ مؤثر طریقے سے کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

اسی طرح یوگا ڈپریشن اور نیند کے مسائل کے حل میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ موجودہ دور میں اسکرین اور ٹیکنالوجی کا زیادہ استعمال ذہنی دباؤ کی بڑی وجوہات میں سے ہیں۔ یوگا کی مشقیں، خاص طور پر یوگا ندرا گہری اور پرسکون نیند دینے میں مدد کرتا ہے اس سے انسان کی کارکردگی میں بہتری آتی ہے اور انسان پھرتیلا اور چاق و چوبند رہتا ہے۔

ان سب کے ساتھ یوگا کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ انسان میں مثبت سوچ پیدا کرتا ہے جب انسان ذہنی طور پر پرسکون ہوتا ہے تو وہ مسائل کا سامنا بڑے پرعزم اور صبر کے ساتھ کرتا ہے یوگا کا اثر صرف فرد تک محدود نہیں بلکہ یہ سماج پر بھی اچھا اثر ڈالتا ہے جب ایک انسان پرسکون ہوتا ہے تو وہ اپنے آس پاس لوگوں کے ساتھ بھی اچھا رویہ اختیار کرتا ہے اس طرح یوگا ایک پرامن اور خوشحال معاشرے کے لیے بہت ضروری ہے یوگا صرف ایک ورزش نہیں بلکہ ایک مکمل طرز زندگی ہے اس کا مقصد انسان کے جسم، ذہن اور روح کے اندر ہم آہنگی پیدا کرنا ہے یوگا کی مشق انسان کو اندرونی سکون اور صبر کی طرف لے جاتی ہے آج کے دور میں یوگا پہلے سے کہیں زیادہ لوگوں کی ضرورت ہے۔

آج کل موبائل اور لیپ ٹاپ کے زیادہ استعمال اور مسلسل بیٹھنے سے ہمارے جسم متاثر ہو رہے ہیں جس سے کمر درد، گردن درد، شوگر اور موٹاپا جیسی بیماریاں جڑ پکڑ رہی ہیں جن سے نپٹنے کے لیے ڈاکٹر یوگ کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔

یوگا جسم، ذہن اور سانس کو جوڑنے کا ایک قدیم طریقہ ہے جس کی کئی قسمیں ہیں۔

1 - جنان یوگا۔

جنان یوگا خود کی تلاش اور تحقیق کا یوگا ہے اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ علم کا سمندر انسان کے اندر موجود ہے، باہر نہیں جو دنیا ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں یعنی مادی دنیا وہ ایک فریب (illusion) ہے جنان یوگا کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کتنا پہچانتا ہے اور وہ اپنے آپ پر کتنا زور دیتا ہے خود کو پہچاننے کے لیے جنان یوگا کے کچھ اصول ہیں

☆ ویوک Viveka (صحیح اور غلط میں فرق کرنے کی صلاحیت)

☆ ویراغیہ Vairagya (دنیاوی چیزوں سے بے رغبتی)

2۔ بھکتی یوگا Bhakti yoga

بھکتی یوگا خدا سے عقیدت اور محبت اور مکمل سپردگی کا راستہ ہے یہ یوگا کے اہم راستوں میں سے ایک ہے جس میں انسان اپنے دل سے خدا کو یاد کرتا ہے اور اس سے جڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

> موجودہ دور میں یوگا ذہنی سکون کے لیے بہت ضروری ہے۔ آج کل انسان ڈپریشن اور Anxiety کا شکار ہے اور اس قدر مصروف ہے کہ خود کی صحت پر دھیان دینے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا اور وہ ڈپریسڈ ہو جاتا ہے اسے نفسیاتی ڈاکٹر کی ضرورت درکار ہوتی ہے اور ڈاکٹر اسے خاص سانس لینے کی تکنیک بتاتے ہیں جسے ''پرانایام'' کہتے ہیں اسی آسن سے بلڈ سرکولیشن بڑھتا ہے اور ذہنی سکون ملتا ہے جیسا کہ کرشنا آچاریہ نے کہا ہے کہ ''سانس لو'' بھی یوگا کا پہلا اور آخری سبق ہے۔

3۔ کرما یوگا karma yoga

کرما یوگا ایک ایسا راستہ ہے جس میں انسان کسی بھی لالچ کیے بغیر دوسروں کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرتا ہے۔ ایک کرما یوگی ہر جاندار اشیا میں خدا کو دیکھتا ہے اس کے لیے لوگوں کی خدمت ہی عبادت بن جاتی ہے۔

4۔ راجہ یوگا Raja yoga

راجہ یوگا کو یوگا کا ''بادشاہی کا راستہ'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کے ذہن کو کنٹرول کرنے اور اندرونی سکون حاصل کرنے پر زور دیتا ہے اس کا مقصد ہے کہ انسان اپنے ذہن کو قابو میں رکھ کر خود شناسی اور خدا سے جڑ جائے۔ یہ سب یوگا کے اقسام ہیں اسی طرح یوگا کے آسن بھی ہوتے ہیں یوگا کے آسن وہ جسمانی ورزشیں ہیں جو جسم، ذہن اور سانس کو متوازن بنانے کے لیے کی جاتی ہیں یہ خاص طور پر پنچلی کے یوگا نظام کا ایک اہم حصہ ہیں۔

مشہور یوگا آسن یہ ہیں:

1۔ تڑاسن (Tadasana mountain pose)

پہاڑ کی حالت کی طرح یوگا کا ایک بنیادی اور اہم کھڑے ہو کر کیا جانے والا آسن ہے۔ بظاہر یہ سادہ لگتا ہے، لیکن دراصل یہ پورے جسم کے توازن، درست پوسچر (posture) اور ذہنی یکسوئی کی بنیاد رکھتا ہے۔ اسی لیے اکثر کھڑے ہو کر کیا جانے والا آسن اسی سے شروع ہوتا ہے۔

2۔ وجرآسن (Vajrasana)

یہ آسن یوگا کا ایک اہم اور بنیادی آسن ہے جسے ''ہیرا'' یا بجلی کی طرح مضبوط پوز بھی کہا جاتا ہے یہ واحد آسن ہے جسے کھانا کھانے کے بعد بھی آرام سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست نظام ہاضمہ سے ہے اس آسن میں جسم ایک مستحکم اور متوازن حالت میں ہوتا ہے جس سے جسم اور ذہن دونوں کو سکون ملتا ہے۔

3۔ بھجنگ آسن (Bhujangasana cobra)

اس آسن کو کوبرا آسن بھی کہتے ہیں۔ پیچھے کی طرف جھکنے والی مشقوں کی ترتیب میں سب سے پہلے کیا جاتا ہے جب یہ آسن مکمل طور پر کیا جائے تو اس کی شکل ایک پھن پھیلائے ہوئے سانپ (کوبرا) جیسی لگتی ہے سنسکرت میں بھوجنگ کا مطلب کوبرا ہے ہم اس آسن کو مختلف مراحل میں کرتے ہیں جس میں سانپ کی نرم اور لچکدار حرکت کا تصور کرتے ہوئے ریڑھ کی ہڈی کو آہستہ آہستہ ایک ایک مہرے کے ساتھ اوپر اور پیچھے کی طرف کھینچا جاتا ہے اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کمر کے پٹھوں، خاص طور پر نچلے حصے کو مضبوط، متحرک اور متوازن بناتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کو پیچھے کی طرف موڑنے سے لچک میں اضافہ ہوتا ہے اعصاب کو تازگی ملتی ہے اور خون کی روانی بہتر ہوتی ہے۔

4۔ ترکون آسن (AsanaTrikon)

چونکہ اس آسن کی شکل مثلث جیسی ہوتی ہے اس لیے اسے ''ترکون آسن'' کہا جاتا ہے یہ ایک منفرد آسن ہے جو ریڑھ کی ہڈی کو بہترین اطرافی (سائڈ) حرکت فراہم کرتا ہے اور جسم کے پہلوؤں کے کئی پٹھوں کو بیک وقت کھینچتا اور مضبوط بناتا ہے۔ یہ توازن بہتر بنانے

میں بھی مددگار رہتا ہے۔

5۔ پدم آسن (Padmasana Lotus Pose)

اس آسن کو ''کنول کی حالت'' بھی کہا جاتا ہے یوگا کی ایک کلاسیکی نشست ہے جس میں ٹانگیں کراس کر کے بیٹھا جاتا ہے اور ہر پاؤں کو مخالف ران پر رکھا جاتا ہے۔ یہ آسن مراقبے کے لیے نہایت موزوں ہے اور جسم میں لچک، توازن اور ذہنی سکون پیدا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ہر سطح کے یوگا کرنے والوں کے لیے ایک بنیادی اور اہم انتخاب سمجھا جاتا ہے۔

6۔اردھا متسیندر آسن (Ardha matsyendrasana)

یہ آسن ریڑھ کی ہڈی کو آگے اور پیچھے موڑنے کے بعد، آدھا اسپائل ٹوئسٹ ایک طرفہ کھنچاؤ فراہم کرتا ہے جو کمر کے نچلے حصے کے عام درد اور کمر و کولہوں کے عضلاتی گٹھیا کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے اس میں ریڑھ کی ہڈی کے ہر مہرے کو دونوں سمتوں میں گھمایا جاتا ہے یہ آسن پتہ، تلی، گردے، جگر، اور آنتوں پر بہت مثبت اثر ڈالتا ہے۔ اس سے پیٹ کے پٹھوں کی مالش ہوتی ہے اور خاص طور پر بڑی آنت متحرک ہوتی ہے جس سے قبض، بد ہضمی اور دیگر ہاضمے کے مسائل میں بہتری آتی ہے۔

7۔ ہیڈ اسٹینڈ Headstand

آسنوں کا بادشاہ کہلانے والا یہ آسن اپنے حیرت انگیز فوائد کی وجہ سے بہت اہم ہے توجہ بڑھانے، یاد داشت کو بہتر بنانے اور جنسی توانائی کو طاقتور حیاتیاتی قوت میں تبدیل کرنے کے لیے بہترین سمجھا جاتا ہے اس کے علاوہ جو لوگ باقاعدگی سے یہ آسن کرتے ہیں ان کی سانس لینے کی رفتار اور دل کی دھڑکن نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ بہت سے نئے سیکھنے والوں کے لیے یہ حیرت کی بات ہوتی ہے کہ اس آسن کے لیے کسی خاص طاقت یا لچک کی ضرورت نہیں ہوتی، بس باقاعدہ مشق اور مرحلہ وار سیکھنا ضروری ہے۔

8۔ٹڈی Locust

تمام آسنوں میں سے شبھاسن وہ آسن ہے جو قوت ارادی کو سب سے زیادہ بڑھاتی ہے سوامی وشنو دیوا نند کے مطابق قوت ارادی کی مشق انسان کے خیالات کو پاکیزہ اور طاقتور بناتی ہے، اور یہ آسنوں کی مشق کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ دیگر آسنوں کے برعکس جو آہستہ آہستہ کیے جاتے ہیں، شبھاسن ایک مضبوط اور طاقتور پٹھوں کے سکڑاؤ کے ذریعے کیا جاتا ہے بالکل ایسے جیسے کوئی ٹڈی (Locust) اچھلتی ہے۔ یہ عمل بیک وقت سوچ، سانس، حرکت اور زندگی کی توانائی کو یکجا کرتا ہے۔

9۔مچھلی کا پوز Fish

اس آسن کا نام ''متسیاسن'' یعنی مچھلی کی حالت اس لیے رکھا گیا ہے کہ اگر ہم اس حالت کو پانی میں اختیار کریں تو ہم آسانی سے تیر سکتے ہیں۔ جسمانی طور پر یہ آسن کندھوں کے جھکاؤ کو درست کرنے میں بہت مؤثر ہے اور گردن اور کمر کے اعصاب کو مضبوط اور متوازن بناتا ہے، ذہنی سطح پر، جب سینہ مکمل طور پر کھل جاتا ہے تو یہ آسن دل کو دنیا کے لیے کھولنے میں حیرت انگیز اثر رکھتا ہے۔

یوگا ہماری زندگی کا اہم حصہ ہے اگر اس کو ہم مسلسل کریں تو یہ ہمیں ذہنی اور روحانی سکون عطا کرتا ہے اور زندگی بڑی پرسکون گزرتی ہے جب ہم سست ہوتے ہیں تو ہمارا کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا اور ہم اوبنے لگتے ہیں تو یوگا ان چیزوں کو دور کرتا ہے اور ہماری زندگی میں نئی امنگیں اور بہار لاتا ہے اسی لیے ہم سب کو دن بھر میں ایک بار یوگا ضرور کرنا چاہیے۔

-plough10

ہلاسن جس کا سنسکرت میں مطلب ہل ہے (کھیتی باڑی کا آلہ)۔ یہ ریڑھ کی ہڈی کو جوان اور صحت مند رکھنے میں مدد دیتا ہے، یہ جسم کے پچھلے حصے کو مکمل طور پر کھینچتا ہے جس سے پوری ریڑھ کی ہڈی متحرک اور طاقتور بنتی ہے۔ یہ آسن سخت ہو جانے والے ہیم اسٹرنگر (ران کے پچھلے پٹھوں) کو بھی نرم اور لچکدار بناتا ہے، کہا جاتا ہے کہ جو شخص باقاعدگی سے ہلاسن کرتا ہے وہ چست، پھرتیلا اور توانائی سے بھرپور ہوتا ہے۔

-crow-11

کاکاسن یعنی کوے کی حالت توازن قائم کرنے والے آسنوں میں سے ایک نہایت مفید آسن ہے اگرچہ تمام آسن جسمانی اور ذہنی مشقوں کے طور پر اس لیے بنائے گئے ہیں کہ جسم اور ذہن کو مراقبے کے لیے تیار کیا جا سکے، لیکن توازن والے آسن سب سے زیادہ نمایاں بہتری فراہم کرتے ہیں۔ جسمانی اور ذہنی توازن بڑھانے کے علاوہ کاکاسن ذہنی توازن پیدا کرتا ہے اور بازوؤں، کلائیوں اور کندھوں کو مضبوط بناتا ہے اس کے ساتھ ساتھ انگلیوں، کلائیوں اور بازوؤں کے پٹھے بھی کھچاؤ حاصل کرتے ہیں۔

یوگا آسن جسم اور دماغ دونوں کو صحت مند بنانے کا ایک آسان اور مؤثر طریقہ ہیں روزانہ تھوڑی دیر یوگا کرنے سے زندگی بہتر اور متوازن ہو سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ یوگا ہماری زندگی کا اہم حصہ ہے اگر اس کو ہم مسلسل کریں تو یہ ہمیں ذہنی اور روحانی سکون عطا کرتا ہے اور زندگی بڑی پرسکون گزرتی ہے جب ہم سست ہوتے ہیں تو ہمارا کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا اور ہم اوبنے لگتے ہیں تو یوگا ان چیزوں کو دور کرتا ہے اور ہماری زندگی میں نئی امنگیں اور بہار لاتا ہے اسی لیے ہم سب کو دن بھر میں ایک بار یوگا ضرور کرنا چاہیے۔

■

Mohd. Talha
Research Scholar
Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia-110025
Mob. 8574080774
Email:mohdtalha964@gmail.com

یوگا کی عصری معنویت

عبدالحافظ فاروقی علیگ

اکیسویں صدی کا انسان بظاہر ترقی کی معراج پر فائز ہے، مگر اس کی داخلی دنیا ایک اضطراب، بے اطمینانی اور فکری انتشار کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی برق رفتار پیش رفت، شہری زندگی کی ہنگامہ خیزی، اور معاشی و سماجی تقاضوں کی پیچیدگی نے انسان کے ظاہر کو تو آسودہ کیا، مگر باطن کو ایک خاموش خلش میں مبتلا کر دیا۔ زندگی کی اس تیز رو میں سکونِ قلب، توازنِ فکر اور ہم آہنگیِ وجود جیسے قیمتی جوہر کہیں دھندلا سے گئے ہیں، اور انسان اپنی ہی بنائی ہوئی دنیا میں ایک انجانی تھکن کا مسافر بن گیا ہے۔

ایسے میں جب انسان اپنی ذات سے دور اور فطرت سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے، یوگا ایک روشن مینار کی مانند ابھرتا ہے، جو نہ صرف جسمانی صحت بلکہ ذہنی و روحانی سکون کا بھی ضامن ہے۔ یوگا محض چند جسمانی حرکات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر فلسفۂ حیات ہے جو انسان کو اپنے باطن کی گہرائیوں سے روشناس کراتا اور اسے کائنات کے وسیع تر نظام سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ گویا یوگا وہ خاموش زبان ہے جو انسان کو اس کے اندر کے شور سے نکال کر ایک ایسی داخلی خاموشی سے ہم کلام کرتی ہے جہاں سکون اپنی اصل صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

لفظ 'یوگا' سنسکرت کے 'یج' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں 'جوڑنا' یا 'ملانا'۔ یہ جوڑ محض جسم اور ذہن کا نہیں بلکہ انسان کے وجودِ کامل کا اس کے حقیقی جوہر سے اتصال ہے۔ یوگا انسان کو اس کے منتشر خیالات، بے قابو جذبات اور تھکی ہوئی روح کو یکجا کر کے ایک ایسی کیفیتِ توازن عطا کرتا ہے جہاں سکون، شعور اور آگہی ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اسی توازن کی تلاش دراصل جدید انسان کی سب سے بڑی ضرورت بن چکی ہے۔

یہی سبب ہے کہ دنیا بھر میں یوگا کو نہ صرف ایک صحت بخش عمل بلکہ ایک بامعنی طرزِ زندگی کے طور پر اختیار کیا جا رہا ہے، جہاں جسمانی تندرستی کے ساتھ ساتھ ذہنی آسودگی اور روحانی بالیدگی بھی حاصل ہوتی ہے۔

اسی عالمی اہمیت کے پیشِ نظر، اقوامِ متحدہ نے 21 جون کو 'عالمی یومِ یوگا' کے طور پر منانے کا اعلان کیا۔ یہ فیصلہ 11 دسمبر 2014 کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد (131/Resolution 69) کے تحت منظور کیا گیا، جسے دنیا کے 170 سے زائد ممالک کی غیر معمولی حمایت حاصل ہوئی۔ اس قرارداد کی پیشکش میں ہندوستان کے وزیرِ اعظم عزت مآب نریندر مودی کا کردار نمایاں رہا، جنھوں نے 27 ستمبر 2014 کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کے دوران یوگا کو انسانیت کے لیے ایک بیش بہا تحفہ قرار دیتے ہوئے اس کے عالمی دن کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ ان کے مطابق یوگا نہ صرف جسمانی صحت کا ذریعہ ہے بلکہ یہ انسان اور فطرت کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ بھی ہے۔

21 جون کو اس دن کے لیے منتخب کیے جانے کی ایک معنوی اہمیت بھی ہے۔ یہ سال کا طویل ترین دن (Summer Solstice) ہوتا ہے، جو روشنی، توانائی اور تجدیدِ حیات کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ قدیم روایات میں بھی اس دن کو روحانی بیداری اور فکری ارتقا سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے، اس لیے یوگا جیسے باطنی و روحانی عمل کے لیے اس تاریخ کا انتخاب نہایت بامعنی اور علامتی حیثیت رکھتا ہے۔

2015 میں پہلی بار عالمی یومِ یوگا منایا گیا، جس میں دنیا بھر کے کروڑوں افراد نے شرکت کی۔ بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں راج پتھ پر منعقد ہونے والی تقریب میں ہزاروں افراد نے اجتماعی طور پر یوگا کی مشق کر کے ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ اس کے بعد سے ہر سال دنیا کے مختلف ممالک امریکہ، برطانیہ، چین، جاپان، جرمنی اور دیگر ممالک میں یہ دن بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے، جہاں عوامی مقامات، تعلیمی اداروں، پارکوں اور کمیونٹی سینٹروں میں یوگا سیشنز، سیمینارز اور آگاہی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔

عالمی یومِ یوگا کا مقصد صرف ایک دن کی تقریبات تک محدود نہیں بلکہ یہ انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ صحت مند اور متوازن زندگی کے لیے یوگا کو مستقل بنیادوں پر اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ دن دراصل ایک علامت ہے، یاد دہانی کی کہ انسان اپنی مصروف زندگی میں کچھ لمحے اپنے لیے نکالے، اپنی سانسوں کی لے کو محسوس کرے، اور اپنے اندر کے سکون کو دریافت کرے۔

یوگا دراصل انسان کے اندر بکھری ہوئی کائنات کو سمیٹنے کا ہنر بھی ہے۔ یہ اس خاموش جستجو کا نام ہے جس کے ذریعے انسان اپنے باطن کی تہوں میں اتر کر اپنی اصل حقیقت سے آشنا ہوتا ہے۔ یوگا ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ حقیقی سکون باہر کی دنیا میں نہیں، بلکہ انسان کے اپنے اندر پوشیدہ ہے پس ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تک رسائی کا سلیقہ آ جائے۔

قدیم ہندوستانی حکمت میں یوگا کی بنیادیں ویدوں، اپنشدوں اور بھگوت گیتا جیسے مقدس متون میں پیوست ہیں، جب کہ مہارشی پتنجلی نے اپنے شہرۂ آفاق 'یوگ سوتروں' میں اس علم کو باقاعدہ ایک منظم شکل عطا کی۔ ان کے نزدیک یوگا 'چت کی ورتیوں کے نیرودھ' کا نام ہے، یعنی ذہن میں اٹھنے والے خیالات اور اضطرابات کو قابو میں لا کر ایک ایسی کیفیت پیدا کرنا جہاں سکون اور یکسوئی غالب آ جائے۔

یوگا کا فلسفہ انسان کو محض ظاہری اعمال تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے ایک تدریجی سفر پر لے جاتا ہے، جہاں ہر قدم خود شناسی کی ایک نئی منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پتنجلی کے بیان کردہ 'اشٹانگ یوگا' کے آٹھ مراحل — یام، نیام، آسن، پرانایام، پرتیہار، دھرنا، دھیان اور سمادھی — درحقیقت اسی روحانی ارتقا کی مختلف منازل ہیں۔ یہ مراحل انسان کو ضبطِ نفس، طہارتِ باطن، جسمانی توازن، سانس کی ہم آہنگی، حواس پر قابو، ذہنی

یکسوئی، مراقبہ اور بالآخر خودی کی معراج تک پہنچاتے ہیں۔

مزید برآں، یوگا کے مختلف راستے - راج یوگا، کرما یوگا، بھکتی یوگا اور گیان یوگا - انسانی مزاجوں کے تنوع کو مدنظر رکھتے ہوئے ترتیب دیے گئے ہیں، تاکہ ہر فرد اپنی فطرت کے مطابق اس راستے پر گامزن ہو سکے۔ کوئی مراقبے کے ذریعے سکون پاتا ہے، کوئی خدمتِ خلق میں اپنی تکمیل ڈھونڈتا ہے، کوئی محبت وعقیدت کے راستے پر چلتا ہے، اور کوئی علم وآگہی کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔ یوگا ان سب کو ایک ہی مرکز پر لا کر جمع کر دیتا ہے۔

یہی وہ جامعیت ہے جو یوگا کو زمان ومکان کی قید سے آزاد کر دیتی ہے۔ یہ نہ کسی خاص مذہب کی ملکیت ہے اور نہ کسی مخصوص تہذیب تک محدود، بلکہ ایک آفاقی صداقت ہے جو ہر اس انسان کے لیے ہے جو اپنی ذات میں سکون، توازن اور معنویت کی تلاش میں ہے۔

یوں یوگا کا فلسفہ ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ انسان اگر اپنے باطن سے جڑ جائے تو بیرونی دنیا کے تمام انتشار کے باوجود وہ ایک ایسی داخلی روشنی پا سکتا ہے جو اس کے وجود کو منور کر دے۔ یہی روشنی دراصل یوگا کا اصل جوہر ہے، اور یہی اس کی سب سے بڑی معنویت۔

یوگا کے فلسفیانہ پس منظر اور اس کی داخلی معنویت کو سمجھنے کے بعد یہ سوال فطری طور پر ابھرتا ہے کہ آیا یہ قدیم حکمت آج کے تیز رفتار اور پیچیدہ دور میں کس حد تک کارآمد ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یوگا محض ایک فکری یا روحانی تصور نہیں، بلکہ ایک عملی نظامِ حیات ہے جو جدید زندگی کے سلگتے ہوئے مسائل کا نہایت مؤثر اور دیرپا حل پیش کرتا ہے۔

عصرِ حاضر کا انسان بظاہر سہولتوں میں گھرا ہوا ہے، مگر اس کا باطن اضطراب، تھکن اور بے اطمینانی سے معمور ہے۔ طویل اوقاتِ کار، ڈیجیٹل دنیا کا غیر متوازن استعمال، سماجی رشتوں میں فاصلہ اور جسمانی سرگرمی کی کمی نے انسان کو ایک ایسے دائرے میں مقید کر دیا ہے جہاں ذہنی دباؤ، بے خوابی، موٹاپا، ذیابیطس اور قلبی امراض عام ہو چکے ہیں۔ ایسے میں یوگا ایک خاموش مگر طاقتور نسخۂ کیمیا بن کر سامنے آتا ہے، جو انسان کے وجود کے ہر پہلو کو چھو کر اسے توازن اور سکون کی نئی جہت عطا کرتا ہے۔

جسمانی سطح پر یوگا کے آسن نہ صرف جسم کو لچکدار اور مضبوط بناتے ہیں بلکہ نظامِ تنفس اور خون کی گردش کو بھی متوازن رکھتے ہیں۔ یہ مشقیں کسی شدید جسمانی دباؤ کے بغیر جسم کو فعال اور صحت مند بناتی ہیں، جس کے باعث ہر عمر کا فرد اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ پرانایام، یعنی سانس کی منظم مشقیں، پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہیں اور جسم میں توانائی کے بہاؤ کو متوازن کرتی ہیں، جس سے جسمانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ذہنی سطح پر یوگا ایک ایسی پناہ گاہ فراہم کرتا ہے جہاں انسان وقتی ہنگاموں سے نکل کر اپنے اندر کی خاموشی سے ہم کلام ہوتا ہے۔ مراقبہ، دھیان اور یکسوئی کی مشقیں ذہن کو منتشر خیالات سے نجات دلا کر اسے سکون اور وضاحت عطا کرتی ہیں۔ جدید سائنسی تحقیقات بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ یوگا ذہنی دباؤ کو کم کر کے دماغی کیمیائی توازن کو بہتر بناتا ہے، جس سے انسان میں برداشت، توجہ اور فیصلہ سازی کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

جذباتی سطح پر یوگا انسان کو اپنے اندر جھانکنے اور اپنے احساسات کو سمجھنے کا شعور دیتا ہے۔ یہ غصہ، خوف اور بے چینی جیسے منفی جذبات کو کم کر کے انسان میں صبر، شکر اور اطمینان جیسی مثبت کیفیات کو فروغ دیتا ہے۔ اس طرح انسان نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ دوسروں سے بھی بہتر تعلق قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

سماجی سطح پر یوگا کے اخلاقی اصول جیسے عدم تشدد، سچائی، ضبطِ نفس اور قناعت ایک مہذب اور ہم آہنگ معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب فرد اپنی ذات میں توازن پیدا کرتا ہے تو اس کا اثر لازماً اس کے اردگرد کے ماحول پر بھی پڑتا ہے، اور یوں ایک صحت مند اور مثبت معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

یوں دیکھا جائے تو یوگا جدید زندگی کے ہنگاموں میں ایک ایسا پُرسکون جزیرہ ہے جہاں انسان اپنے وجود کی بازیافت کر سکتا ہے۔ یہ نہ صرف بیماریوں کا علاج ہے بلکہ ایک ایسا طرزِ حیات ہے جو انسان کو جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے، ایسا سلیقہ جو توازن، شعور اور ہم آہنگی سے عبارت ہے۔

یوگا کی عملی افادیت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے بعد یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یوگا محض وقتی سکون یا جسمانی صحت کا وسیلہ نہیں، بلکہ ایک ایسا ہمہ گیر طرزِ حیات ہے جو انسان کے وجود کے ہر گوشے کو منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں یوگا اپنی اصل معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی ایک ایسا نظامِ زندگی جو نہ صرف فرد کو سنوارتا ہے بلکہ معاشرے کو بھی توازن اور ہم آہنگی کی راہ دکھاتا ہے۔

عصرِ حاضر کے ماحول میں، جہاں انسان مادّی ترقی کے باوجود داخلی خلا کا شکار ہے، یوگا ایک ایسی روشنی بن کر ابھرتا ہے جو اسے سادہ، متوازن اور بامقصد زندگی کی طرف رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ ہمیں محض آسن اور پرانایام تک محدود نہیں رکھتا بلکہ سچائی، ضبطِ نفس، قناعت اور شعوری طرزِ زندگی جیسے اوصاف اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ یوں یوگا ایک ایسی داخلی تربیت کا ذریعہ بن جاتا ہے جو انسان کے فکر وعمل دونوں پر یکساں انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔

مزید برآں، جدید سائنسی تحقیقات نے بھی یوگا کی افادیت کو مدلل انداز میں تسلیم کیا ہے۔ عالمی ادارے اور تحقیقی مراکز اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یوگا ذہنی دباؤ، اضطراب، ذیابیطس، قلبی امراض اور دیگر طرزِ زندگی سے وابستہ بیماریوں کے علاج اور تدارک میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں تعلیمی اداروں، اسپتالوں اور کارپوریٹ تنظیموں میں یوگا کو ایک باقاعدہ نظام کے طور پر اپنایا جا رہا ہے۔

اس تناظر میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم یوگا کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنائیں۔ اگر انسان روزانہ چند لمحے بھی اپنے لیے نکال کر یوگا کی مشق کرے تو وہ نہ صرف جسمانی طور پر توانا رہ سکتا ہے بلکہ ذہنی اور جذباتی سطح پر بھی ایک نئی تازگی محسوس کر سکتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں یوگا کو نصاب کا حصہ بنانا، عوامی سطح پر آگاہی اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے اس کی ترویج یہ تمام اقدامات یوگا کے فروغ میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ماخذ ومصادر

1. بھونانی، اے بی (2010)، یوگا کا مفہوم: ایک ہمہ گیر مطالعہ۔ یوگا میمانسا، 42(3)، 130-124۔
2. فیلڈ، ٹی۔ (2011)۔ یوگا پر طبی تحقیق کا جائزہ۔ کمپلیمنٹری تھیراپیز ان کلینیکل پریکٹس، 17(1)، 8-1۔
3. آئینگر، بی کے ایس (2001)، لائٹ آن یوگا، ہارپر کولنز۔
4. خالصہ، ایس بی ایس (2004)، یوگا بطور علاج: تحقیقی مطالعات کا تجزیہ، انڈین جرنل آف فزیالوجی اینڈ فارماکولوجی، 48(3)، 285-269۔
5. نیشنل سینٹر فار کمپلیمنٹری اینڈ انٹیگریٹو ہیلتھ (2022)۔ یوگا: بنیادی معلومات۔
6. راس، اے اور تھامس، ایس۔ (2010)۔ یوگا اور ورزش کے صحت پر اثرات کا تقابلی جائزہ۔

■

Abdul Hafiz Farooqui Alig,
230/7, Begam Ganj Rajabazar Chowk
Lucknow- 226003 (UP)
Mob.: 8738010996
abdulhafizfarooqui@gmail.com

محمد علی جوہر

ہندستانی تہذیب وثقافت اور اردو ادب

زبان وادب کا تعلق تہذیب وثقافت سے بہت گہرا ہوتا ہے، یہ گہرائی دونوں کو دوام بخشتی ہے۔اردو زبان و ادب کی تشکیل ہندستانی تہذیب و ثقافت کے خمیر سے ہوئی ہے۔ یہ ہندستان کی ایک ایسی جدید زبان ہے جس کی لسانی ساخت پر یوں تو اثرات عربی، فارسی، ترکی اور ہندستانی بولیوں کے ہیں مگر اس کی روح میں ہندستانی تہذیب وثقافت ہے۔ ہندستان کی تہذیب و ثقافت ایک ایسی رنگین اور متنوع تصویر ہے جو ہزاروں برسوں کے امتزاج، اختلاط اور ہم آہنگی سے بنی ہے۔ یہاں ویدک دور کی روحانی گہرائی، سندھ گھاٹی کی شہری تہذیب، بدھ اور جین مت کی اخلاقیات، صوفیانہ اور بھکتی روایات کا سنگم، اور پھر وسطی ایشیائی، ایرانی، ترکی اور مغلیہ اثرات نے ایک ایسی گنگا جمنی تہذیب تخلیق کی جو دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس مشترکہ تہذیب کا سب سے خوبصورت اور زندہ آئینہ اردو زبان اور ادب ہے۔ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ہندستان کی کثیر الثقافتی شناخت، بھائی چارے، رواداری اور مشترکہ ورثے کی ترجمان ہے۔اردو کی ابتدا ہندستان کی ہی مٹی سے ہوئی۔ یہ دہلی، لکھنؤ، دکن اور دیگر علاقوں کی بولیوں (کھڑی بولی، ہندوی، ریختہ، دکنی) سے پروان چڑھی۔ فارسی، عربی اور ترکی کے لفظوں نے اسے نئی وسعت بخشی مگر اس کی روح ہندستانی رہی۔ امیر خسرو سے لے کر ولی دکنی تک، یہ زبان ہندستان کی مشترکہ ثقافت کی پیداوار بنی۔ خسرو نے ہندی دوہے، پہیلیاں اور لوک گیتوں کو فارسی کے ساتھ ملا کر نئی راہیں کھولیں۔ قطب شاہ، وجہی اور دیگر دکنی شعرا نے اسے محلاتی اور عوامی دونوں سطحوں پر مقبول بنایا۔اردو ادب میں ہندستانی تہذیب کی عکاسی ہر صنف میں نظر آتی ہے۔ امیر خسرو سے لے کر دیگر صوفیائے کرام اور دور جدید میں کبیر، نانک اور دیگر کی روح اردو میں جھلکتی ہے۔ یہ شاعری محبت الٰہی، انسانیت اور اتحاد کی بات کرتی ہے جو ہندستان کی روح ہے۔ نثر میں بھی اردو نے ہندستانی تہذیب کو پورے کمال و جمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شاعری ہو یا نثر، غزل ہو یا نظم، ناول ہو یا افسانہ، ڈراما ہو یا طنز و مزاح یا پھر غیر افسانوی ادب کوئی بھی صنف ایسی نہیں ہے جو ہندستانی تہذیب وثقافت یعنی گنگا جمنی تہذیب کے عکس سے خالی ہو۔اس زبان نے اگر سب سے زیادہ کسی چیز کو فروغ دیا ہے تو وہ ہندستانی تہذیب وثقافت ہی ہے۔گزشتہ ایک ہزار سالہ اردو کی تاریخ میں تشکیل پائے ادبی متن کا اگر جائزہ لیا جائے تو غالب عنصر اسی تہذیب وثقافت کا ہوگا۔

کلاسیکی غزل میں میر تقی میر، سراج اورنگ آبادی، غالب، مومن اور ذوق نے عشق، ہستی، فلسفہ زندگی کے ساتھ ساتھ ہندستانی معاشرت، بازاروں کی رونق، محلوں کی شان وشوکت اور روزمرہ زندگی کی جھلکیاں پیش کیں۔ نظیر اکبر آبادی نے تو دیہی ہندستان کی مکمل تصویر کھینچی، ہولی، دیوالی، میلے ٹھیلے، کھیتوں کی سرسبزی، بازاروں کی چہل پہل، حتیٰ کہ عام آدمی کی خوشی غمی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ صوفیانہ شاعری میں ہندستانی تصوف اور بھکتی روایت کا خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔

قصیدہ ایک کلاسیکی صنف سخن ہے جس کا تعلق امرا و روسا سے رہا ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا اور ذوق اس کے سرخیل ہیں، جنھوں نے اپنے قصائد میں ہندستان کی سرزمین اور فطرت کو پیش کیا ہے۔ آب و ہوا، نہروں، باغوں، ندیوں اور موسموں کے ذریعے ہندستانی تہذیب وتمدن کو نمایاں کیا ہے۔ بعض قصائد میں ہندو مسلم اتحاد، تہواروں، ہولی دیوالی، عید اور بسنت کا ذکر کر کے یہاں کی سماجی ہم آہنگی کی جانب اشارے کیے ہیں۔ سودا نے اپنے قصائد میں یہاں کی تہذیب وثقافت، بازاروں کی رونق اور ہندستانی طرز زندگی کا عکس دکھایا ہے۔ ان کا مشہور قصیدہ ''تضحیک روزگار'' ہے، جس میں ہندستانی معاشرے کی تبدیلیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہندو موچی، کمہار اور دھوبی بھی ان کے فریم میں آ گئے ہیں۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

ہندو ہیں بت پرست، مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اس کسی کو جو ہو آشنا پرست

مصرع اول میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرز عبادت اور ان کے معبود کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ عام طور پر تہذیب وتمدن کی جڑیں عقائد اور رسوم میں پیوست ہوتی ہیں مگر مرزا محمد رفیع سودا مصرع ثانی میں ان دونوں کا انکار کر کے آشنا پرست کی عبادت کی بات کرتے ہیں یہ آشنا پرست دراصل صاحب دل انسان ہے اور ہندستانی تہذیب نے اسی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ذوق نے اپنے قصائد خاص طور پر ان کی تشبیب میں ہندستانی پھول، موسم اور ان سے متعلق تشبیہات و استعارات کا استعمال کر کے اسے زبان وادب کا حصہ بنایا ہے۔ چونکہ ان کی تشبیب عام طور پر بہاریہ ہوتی ہے اس لیے وہ بڑی جزئیات کے ساتھ یہاں کی آب و ہوا

اور موسم وغیرہ کا بیان کرتے ہیں۔

محسن کاکوروی نے نعتیہ قصیدہ ''مدیح خیر المرسلیں'' لکھا تو ہندستانی فضا، اس کی تہذیب وثقافت اور تاریخ و اسطور کو اس کی تشبیب کا حصہ بنا دیا۔ یہ اشعار دیکھیے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل
جاکے جمنا پہ نہانا بھی ہے ایک طول امل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
دیکھئے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن
سینہ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

اسی طرح منیر شکوہ آبادی اپنے قصائد میں ہندستانی تہذیب و ثقافت کے علائم بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ایک قصیدے میں وہ رامپور کی تعریف کرتے ہوئے یہاں کی بزم نشاط کی تعریف کرتے ہیں، اس میں یہ شعر دیکھیے۔

ادائیں کھینچیں جو مرلی بجانے کی تصویر
کرشن جاکے لے رادھا کی روح پرن
کدم کی چھاؤں بھی جمنا بھی سب یہیں دیکھیں
کبھی نہ گوپیوں کو یاد آئے بندرا بن

مندرجہ بالا اشعار میں کاشی، متھرا، گنگا جل، اشنان، گوکل، جمنا پر نہانا، کالی گھٹائیں، بت، سرکرشن، درشن، گوپی، تراکھی، برہمن، مرلی، رادھکا، کدم، برندابن وغیرہ ایسی لفظیات اور علامتیں ہیں جن کے توسط سے محسن کاکوروی نے ہندستانی تہذیب و ثقافت کو اردو زبان کا حصہ بنایا ہے۔

مثنوی بھی ایک قدیم صنف سخن ہے، جس میں واقعات ایک خاص انداز میں بیان کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر اس صنف میں بیان کیے جانے والے واقعات ہندستان کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں، مثنوی سحر البیان اور گلزار نسیم میں سیکڑوں اشعار مل جائیں گے جو ہندستانی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثنویوں میں ہندستانی تہذیب وثقافت سے متعلق گوپی چند نارنگ اپنی کتاب ''ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''اردو مثنویوں کی قدر و قیمت جاننے اور تاریخ ادب میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا جائزہ تاریخی و معاشرتی پس منظر کے ساتھ لیا جائے۔ اردو ادب نے فارسی سے بہت کچھ لیا ہے، اس میں ایرانی اور اسلامی روایات کا رنگ بھی گہرا ہے لیکن یہ ہندستان سے بیگانہ محض نہیں ہے۔ اس نے یہاں کے ماحول، معاشرت اور تہذیب وتمدن کے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ دوسری اصناف سخن کی طرح ہماری مثنویاں بھی اس اخذ وقبول، اختلاط اور اشتراک کا پتہ دیتی ہیں۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے سابقے کے بعد یہاں تہذیبی اور معاشرتی سطح پر کارفرما رہا۔ ہماری مثنویاں چونکہ مشترک تہذب اور ملی جلی معاشرت کے زیر اثر لکھی گئی ہیں اس لیے ان میں اسلامی قصے کہانیوں کے علاوہ ہندستانی لوک کتھاؤں اور عوامی روایتوں سے متاثر ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے۔'' (مقدمہ)

کدم راؤ پدم راؤ سے لے کر شوق لکھنوی کی مثنوی ''زہر عشق'' تک کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہندستانی معاشرت، اور اس کی تہذیب و ثقافت سے معمور ملیں گی۔ مثنویوں کے عام کرداروں کے اعمال و افعال کا اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو اس کا خمیر اسی ہندستان کی مٹی سے اٹھا ہوا معلوم ہوگا۔ اردو مثنویوں اور قصائد کی تشبیب میں ہماری ہندستانی تہذیب کے متعدد پہلوؤں کی تصویر کشی ملتی ہے، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ان دونوں اصناف سخن نے کس طرح سے اس تہذیب کو حرز جاں بنایا اور اسے پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مرثیہ کا تعلق حضرت حسینؓ کی شہادت سے ہے، یہ واقعہ کربلا میں پیش آیا تھا اس کے باوجود اردو کے مراثی کی اگر قرات کی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہیں آس پاس کوئی میدان واقع ہے جہاں یہ سب ہوا ہے، کیونکہ اس کے اکثر کرداروں کے اعمال وافعال اور ان سے مترشح ہونے والی تہذیب و ثقافت ہندستانی محسوس ہوتی ہے، جس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اردو کے مرثیہ نگاروں نے اس واقعہ کو ہندستانی فریم میں دیکھا اور بیان کیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں میر انیس ایک ایسے مرثیہ نگار ہیں جنھوں نے مرثیہ کو معراج تک پہنچایا، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے امام حسین کو لکھنؤ کا دولہا بنا دیا۔ بیگم صالحہ عابد حسین اپنے مضمون ''کلام انیس میں ہندستانی تہذیب'' میں لکھتی ہیں کہ ہندستانی تہذیب کو مرثیوں کا پس منظر بنانا محض انیس کا کارنامہ نہیں ہے، ان سے پہلے اور ان کے ہمعصر شاعروں نے بھی اس روایت کو اپنایا تھا اور اس کے درد واثر میں اضافہ کرنا چاہا تھا۔ آگے وہ لکھتی ہیں:

''اسی ہندستانی تہذیب کے ہزاروں جلوے انیس کے یہاں آپ دیکھ سکتے ہیں اگر آپ اس پر سرسری بھی نظر ڈالیں اور پورا کلام نہ سہی منتخب کلام ہی پڑھ لیں یا سن لیں تب بھی آپ پر انیس کے جلوے کھلتے جائیں گے۔ (اردو مشترکہ ہندستانی تہذیب۔ ڈاکٹر کامل قریشی۔ صفحہ 175)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اردو مرثیے نے واقعات کربلا کو ہندستانی تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں پیش کیا ہے، جس میں بلند حوصلگی کے ساتھ ہے گفتگو کا طریقہ، آمد و رفت، بہن کی بھائی سے محبت، شوہر اور بیوی کے مابین الفت سب کچھ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان مراثی کے قرات کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سبھی کردار جن کا پس منظر تو عرب ہے لیکن یہ سب یہیں کے رہنے والے ہیں۔

اردو نظم نے بھی ہندستانی تہذیب و ثقافت کو بہت خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی سے لے کر میراجی، اختر الایمان اور زبیر رضوی تک نے ہندستانی تہذیب کے ذریعے اپنے نظم کو گہرائی عطا کی ہے۔ نظم نگاروں میں اس حوالے سے سب سے اہم نظیر اکبر آبادی ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور اپنے مضمون ''اردو اور ہندستانی تہذیب'' میں لکھتے ہیں:

نظیر اکبر آبادی کو میں نے ہندستانی تہذیب کا عاشق کہا ہے۔ ان کی نظموں میں نہ صرف اس دور کی ساری تہذیبی زندگی کا عکس نظر آتا ہے بلکہ آدمی نامہ، ہنس نامہ اور بنجارہ نامہ جیسی نظموں میں اس تہذیب کی انسان دوستی، اخلاقی نقطہ نظر اور رواداری کا بھرپور عکس بھی۔ آدمی نامہ تو ایک طور پر انسان دوستی کی ایسی دستاویز ہے جو یورپی ہیومینزم کے چارٹر سے پہلے وجود میں آئی۔ لیکن قدرت کے ایک عجوبے کے مطابق انیسویں صدی کے آغاز سے ہی ہندستانی نشاۃ الثانیہ کی تحریک بھی شروع ہوئی جس کے نتیجے میں اپنی بنیادوں اپنی دھرتی، اپنی فضا اور ماحول، اپنی تاریخ اور تہذیب کا بھی احساس بڑھا۔ جدید اردو نظم نے حالی اور آزاد کی قیادت میں ارضیت، واقعیت، وطنیت کا رنگ گہرا کیا۔ اسماعیل میرٹھی، شاد عظیم آبادی، اکبر، چکبست، وحید الدین سلیم،

صفی لکھنوی، سرور جہان آبادی، محروم، اقبال، جوش، ساغر، اختر شیرانی، فراق ملا اور پھر ترقی پسند شعرا نے اس ہندستانی فضا اور تہذیب کی نقش گری کو آگے بڑھایا۔''

(اردو مشترکہ ہندستانی تہذیب۔ڈاکٹر کامل قریشی۔صفحہ 91)

مندرجہ بالا عبارت میں پروفیسر آل احمد سرور نے جدید اردو نظم میں ہندستانی تہذیب و ثقافت کے نقش گروں کا اجمالی ذکر کر کے اس کی ثروت مندی کی جانب اشارہ کیا ہے۔علامہ اقبال کی متعدد نظمیں ہندستانی تہذیب و ثقافت کی غماز ہیں۔جب وہ کہتے ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

تو وہ دراصل ہندستان کے تہذیبی و لسانی تنوع کی جانب ہی اشارہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہندستان کثیر مذہبی ملک ہے سب کو ایک ہی لڑی میں پروتا ہے ،اور یہ لڑی ہندستانی ہونے کی ہے۔

داستان گوئی کی روایت میں 'سب رس'، ہزار داستان اور طلسم ہوش ربا جیسی تخلیقات میں ہندستانی محلات، بازار، رسوم و رواج، طلسماتی کہانیاں، راجہ رانیوں کی داستانیں اور عوامی زندگی کی جھلکیاں بھری پڑی ہیں۔فسانہ آزاد تو ایک نگار خانہ ہے جس میں لکھنوی تہذیب چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''پھولوں سے لبریز گل چینوں کی جھولی ہے، باغبان کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے، حوض باغ آئینہ کی صورت صاف، پانی مثل بلور شفاف، روشیں صاف و پاک، پٹریاں بے خس و خاشاک، رنگیلے جوان نشہ گلگشت میں مخمور، بادۂ مسرت سے چور لکھنؤ میں ہر گلی کوچہ زعفران زار ہے۔کیوں نہ ہو آخر بسنت کی بہار ہے۔یوں تو ہر سمت طبلے پر تھاپ، سارنگی کی چھیڑ چھاڑ اور نغمہ سرائی کا انتظام ہے مگر شاہ مینا صاحب کی درگاہ سب میں انتخاب زیارت گاہ خاص و عام ہے۔اللہ اکبر گرد مزار کہیں تو جوانوں کی وہ دھوم دھام ہے کہ جس طرف دیکھیے اژدہام عام ہے۔'' (فسانہ آزاد حصہ اول (81))

مندرجہ بالا پیراگراف میں لکھنؤ میں بسنت کی بہار کے میلے کا ذکر ہے، جس میں شاہ مینا کا مزار مرکز ہے۔ ہندستانی تہذیب میں مذہبی رسوم و عقائد کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے مگر اردو زبان نے تعصب و نفرت کو کبھی راہ نہیں دی بلکہ اس نے ہمیشہ محبت کو عام کیا یہی وجہ ہے کہ یہاں مزارات مرجع خلائق ہوتے ہیں جن میں ہندو مسلم کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے اور مزاروں پر ہونے والا بسنت کا میلہ خالص ہندوانہ تہذیب و ثقافت کا عکاس ہے جس کا ذکر آزاد نے یہاں کیا ہے۔

**ناول کو زندگی کا رزم نامہ کہا جاتا ہے، اردو ناول نے ہندستانی تہذیب و ثقافت کو جزئیہ نگاری کے ساتھ خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں دیگر اصناف کے مقابلے تہذیب وثقافت کی جزئیات نمایاں نظر آتی ہیں، اس حوالے سے پریم چند کا نام بھی اہم ہے۔ ان کا ہر ناول ہندستانی تہذیب و ثقافت کا عکاس ہے، جس کے ہر کردار زندہ انسان معلوم ہوتے ہیں جو اسی سماج کا حصہ ہیں۔ انھوں نے دیہی ہندستان کی تہذیب و ثقافت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے ناول میدان عمل، گوشہ عافیت، اور گئودان کی ہر سطر اس کی گواہی دیتی ہے۔ اسی طرح ان کے افسانے بڑے گھر کی بیٹی، کفن اور ماں وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں ہندستانی تہذیب و ثقافت ہر لفظ سے ٹپکتی نظر آتی ہے۔لیکن اس تہذیب کو اس کی تبدیلیوں اور فلسفیانہ اساس کے ساتھ جس نے پیش کیا ہے وہ قرۃ العین حیدر ہیں۔ان کا ناول ''آگ کا دریا'' ہندستان کی تہذیب و ثقافت کی گہرائیوں کو کھول کر پیش کرتا ہے۔ یہ ناول محض ایک کہانی نہیں بلکہ ڈھائی ہزار سال (تقریباً 2500 سال) پر محیط ہندستانی تاریخ، فلسفہ، سماج اور مشترکہ ثقافت کا ایک زندہ آئینہ ہے۔ ناول گوتم بدھ کے دور سے شروع ہو کر تقسیم ہند (1947) اور اس کے بعد کے دور تک پہنچتا ہے، اور اس پورے سفر میں ہندستان کی گنگا-جمنی تہذیب (composite culture) کی خوبصورتی، تسلسل اور چیلنجز کو نمایاں کرتا ہے۔قدیم دور (ویدک/بدھ مت کا عہد) کا آغاز ناول میں گوتم بدھ کے زمانے سے ہوتا ہے۔ یہاں ہندستان کی فلسفیانہ گہرائی، ویدک روایات، بدھ مت کی اخلاقیات، جین مت اور قدیم شہری تہذیب (جیسے پاٹلی پتر، ایودھیا، کپل وستو وغیرہ) کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ کردار گوتم نیلمبر جیسے لوگ فلسفہ حیات، کرما، دکھ اور موکش کی تلاش میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دور ہندستانی تہذیب کی بنیادوں کو واضح کرتا ہے۔ترکوں اور مغلوں کی آمد کے ساتھ ہندستان میں نئی ثقافتی لہریں آتی ہیں۔ ناول میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ باہر سے آنے والے کلچر ہندستان کی رنگا رنگی میں اضافہ کرتے ہیں، نہ کہ اسے مٹاتے ہیں۔لکھنؤ اور اودھ کی ثقافت (جو گنگا-جمنی تہذیب کی علامت ہے) کو خاص طور پر خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔''آگ کا دریا'' ہندستان کی تہذیب کو ایک فلسفیانہ، تاریخی اور جذباتی سطح پر دریافت کرتا ہے۔قرۃ العین حیدر اس ناول کے ذریعے یہ پیغام دیتی ہیں کہ ہندستان کی اصل طاقت اس کی کثیر الثقافتی شناخت میں ہے۔

اس کے علاوہ اردو افسانہ نے بہت ہی خوبصورت انداز میں ہندستان کی تہذیب و ثقافت کو موضوع بنایا۔ پریم چند، کرشن چندر، علی عباس حسینی، اور غلام عباس وغیرہ نے شمالی ہند کی تہذیب و ثقافت کو، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی اور رتن سنگھ وغیرہ نے پنجابی تہذیب و ثقافت کو، الیاس احمد گدی اور غیاث احمد گدی نے بہار و جھارکھنڈ کی تہذیب کو اپنے متن کا حصہ بنایا۔اردو نے مشترکہ تہذیب و ثقافت کے فروغ میں زبان کے طور پر نمایاں خدمات انجام دی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اردو صرف ایک زبان نہیں ہے بلکہ وہ خود ایک تہذیب کا نام ہے اور یہ گنگا جمنی تہذیب ہے جسے مشترکہ تہذیب و ثقافت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب تک اردو زندہ ہے، ہندستان کی یہ خوبصورت مشترکہ شناخت زندہ رہے گی۔

■

Prof. Mohd Ali Jauhar
Ex. Chairman, Department of Urdu,
AMU Aligarh-202002
Mob. 9412501173
Email: majauhar786@gmail.com

محمد طیب

ہوٗ قبیلے کا لسانی اور تہذیبی جائزہ

خطہ جھارکھنڈ کا ایک قبیلہ 'ہوٗ' بھی ہے۔ جس کی آبادی جھارکھنڈ کی چوتھی سب سے بڑی آبادی ہے۔ یہاں سب سے بڑی آبادی سنتھال قبیلہ کی، دوسری اراوٗں قبیلہ کی تیسری منڈا قبیلہ کی اور چوتھی ہو قبیلہ کی ہے۔ ہو زبان کو ہوڑو بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عام بول چال کی زبان ہے۔ جھارکھنڈ، آسام، چھتیس گڑھ، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، بنگال وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ لوک کہانی کے تحت 'ہوٗ زبان لُوکو کوڑا اور لوکو کوڑی (زوجین) کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ یہی 'ہوٗ قبیلہ کے لوگوں کا ماننا ہے۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ اگر اس زمین میں یہ دونوں نہ ہوتے تو 'ہوٗ زبان بھی نہ ہوتی۔ لوگوں کے درمیان یہ رابطہ کی زبان ہے۔

ماہر لسانیات کے مطابق 'ہوٗ زبان آسٹرو ایشیا تک منڈا خاندانی زبان سے ہے۔ منڈا پریوار میں سنتھالی، ہو، منڈاری اور کھریا بھی ہے۔ سنتھالی، منڈاری اور 'ہوٗ' میں کافی مماثلت ہے۔ کوئی بہت خاص فرق نہیں ہے۔ یہ تینوں ایک ہی لسانی خاندان سے ہیں۔ اڑیسہ، کولہان، بنگال اور جھارکھنڈ میں اس کے بولنے والوں کی کافی بڑی تعداد ہے۔ آزادی سے پہلے تک یہ زبان صرف بولی جاتی تھی۔ عوامی بولی ہی تھی۔ 1947 سے 1960 کی بات ہے کہ آدیواسی، سنتھال لوگ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ زبان کی اہمیت نہیں جانتے تھے۔ قانونی شکل میں ملک کے سبھی ذات اور قبائل کے لوگوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنی مادری اور مقامی زبان کی حفاظت کا ان کو پورا حق ہے۔ بچوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں اور تعلیم بھی دی جائے۔ لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ اس زبان کا رسم الخط بھی ہو۔ جب تک کسی زبان کا رسم الخط نہ ہوگا تب تک اس زبان کا نہ ادب، خلق ہوگا اور نہ اس کے ذریعہ تعلیم ممکن ہوگی۔ اس وقت تک اس کا رسم الخط نہ ہونے کی وجہ سے اس کی کوئی پہچان نہ تھی۔

1950-1960 کے درمیان 'ہوٗ زبان کی پہچان، اس کے وجود اور رسم الخط کے لیے لاکو بودرا جی کی جدوجہد ناقابل فراموش ہے۔ اس کے رسم الخط کا نام 'وَرانگ چھتی' ہے۔ اس کے حروف تہجی 32 ہیں۔ لاکو بودرا جی کی فکر کا نتیجہ ہے کہ اس کا رسم الخط وجود میں آیا۔ 'ہوٗ قبیلہ کے گاؤں کے پردھان کو منڈا کہا جاتا ہے۔ اس کے نائب کو 'ڈکوا' کہا جاتا ہے۔ جب کبھی کوئی بیٹھک اور میٹنگ ہوتی ہے تو اس کے (ڈکوا) ذریعہ اطلاع پہنچائی جاتی۔ سات سے بارہ گاؤں مل کر جو مرکز بنتا ہے اس کو 'پَرہا' بولتے ہیں۔ اس بارہ گاؤں کے پردھان کو 'مانکی' کہا جاتا ہے۔

'ہوٗ زبان کا رسم الخط انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے۔ اس کا واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ 2012 میں امریکہ سے اوریگن یونیورسٹی کی ایک ریسرچ اسکالر جو Lingustic Science کے ڈپارٹمنٹ سے تھی وہ جھارکھنڈ آئی اور ایک مہینہ کے اندر 'ہوٗ زبان کا رسم الخط Dr.Dobro Buriuli. سے سیکھ کر دوبارہ امریکہ گئی اور مائکل ایورسن کے ساتھ مل کر وارنگ چھتی یعنی 'ہوٗ زبان کا رسم الخط تیار کر کے گوگل پر اپلوڈ کر دی۔ اب جھارکھنڈ ریاست کے مختلف امتحانات میں بھی یہ زبان شامل ہے اور اس کی طرف لوگوں کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔ جمشید پور ریلوے اسٹیشن، اڑیسہ ریلوے اسٹیشن، کیونجھر ریلوے اسٹیشن، چائباسہ ریلوے اسٹیشن اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے 'ہوٗ زبان میں بات چیت ہوتی ہے۔ اسکولوں کے علاوہ کولہان اور رانچی یونیورسٹی میں اس کی پڑھائی بھی ہوتی ہے۔

ایک موقع پر طلبا نے Dr. Dobro Buriuei سے اس زبان کے غیر مفید اور فرسودہ ہونے کی شکایت کی کہ اس دور میں جب کہ انگریزی اور ٹکنالوجی کا زمانہ ہے اس علاقائی زبان کے سیکھنے کا کیا فائدہ۔ اس میں نہ کوئی بڑی نوکری ملتی ہے نہ کوئی خاص اہمیت وغیرہ۔ تب ڈاکٹر صاحب نے زبان اور علاقائی زبان کی اہمیت پر یہ بات کہی تھی کہ:

'' انگریزی پڑھ کر آکاش تو چھولیں گے لیکن دھرتی چھوٹ جائے گی''

مطلب یہ تھا کہ انگریزی پڑھ لکھ کر بہت بڑا آدمی بن جائیں گے لیکن اپنی پرمپرا اور اپنی تہذیب وثقافت بھول جائیں گے اور ہم دوسروں کی تہذیب کو فروغ دیں گے۔

ہو زبان کے ساہتیہ کار۔ ڈاکٹر دمیانتی سینکو۔ کانو رام دیوگم جی، ستیش کمار بُڑاجی، گُسائی دیوگم جی، لاکھو بودرا جی، بلرام پاٹ، ڈاکٹر دُرگا پُرتی جی، ڈاکٹر سونیا کمار تیو جی، ڈنو سنگھ پُرتی جی، کمل لوچن کُڈا جی، باگُن بودرا جی، پروفیسر چندرامان، پردیپ بودرا جی، مورا جی

دیوگم، ڈاکٹر جنم سی سوئی جی، کچھ ادبی شخصیات جن کی لٹریچر پر خدمات دستیاب ہوئی ہیں ان کے اور ان کی کتابوں کے نام اس طرح سے ہیں۔ اے نوٹر وٹیٹ، گرامر آف دی کول۔ لیونل بارو، ہو گرامر، 1915۔ ڈبلو جی آرچر، ہولوک گیت۔ ستیش کوڑا اسنگل، رُملِ۔ یہ ایک کتاب ہے جو 'ہو' قبیلہ کے پہلے نوجوان نے لکھی تھی۔ جون ڈینی اور ایس جے، دونوں نے مل کر گرامر آف لغت اور 'ہو' انگریزی لغت تیار کی تھی۔ بُرج بہاری، ہندی 'ہو' ڈکشنری، 1982۔ کمل لوچن کوڑا، اِتا بکا لنا بُسا، جوار، بُرُوبُرُو۔ بونگا بُرُو۔ ماتگے مُوتُو جگر۔ مُہی پال بُڑوکی، دوش اوکائی، اوکا ما گینہ یہ نا تک پر ہے۔

ان کے یہاں تین طرح کی زمینیں ہوتی ہیں اور تینوں کے نام کچھ اس طرح سے ہیں (ویڑو، وادی اور گوڑا) ویڑو اس زمین یا کھیت کو کہتے ہیں جہاں فصلیں خوب اُگتی ہیں۔ وادی پتھریلی زمین کو کہا جاتا ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہاں موٹا موٹا اناج اُگتا ہے جیسے باجرا، جوار اور مکئی وغیرہ۔ گوڑا اس زمین سے اُگنے والی فصل کو گوڑا دھان بولتے ہیں۔ جب نیا اناج ہوتا ہے۔ ڈھیکی (لکڑی کی مشین) میں کوٹ کر اس کا پکوان تیار کرتے ہیں جس میں دہی کی ملاوٹ بھی ہوتی ہے اور آنے والے تمام مہمانوں کو یہ کھانا ضرور کھلاتے ہیں۔ اس کھانے کو 'ہو' زبان میں جوم نوا بولتے ہیں۔ والدان کے گھر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ سنگل فیملی (شوہر، بیوی اور بچے) میں رہتے ہیں۔ جوائن فیملی کا رواج ان کے یہاں نہیں ہے۔ ان کے یہاں پریوار کی گنتی چولہے کے حساب سے ہوتی ہے۔ بچوں کی شادی کے بعد والدین کا چولہا الگ ہوتا ہے۔ جتنے چولہے ہوں اتنے پریوار شمار کیے جاتے ہیں۔ اسی کے مطابق انھیں سماجی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ مطبخ کے سامنے ایک خاص جگہ ہوتی ہے جسے اُڈِن کہتے ہیں۔ اس جگہ وہ لوگ اپنے پرکھوں کے نام سے پوجا کرتے ہیں۔ ان کی روح کو سکون دیتے ہیں۔ اس سے وہ نیک بختی کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورحکومت میں جس جگہ 'ہو' قبیلہ کے لوگ رہتے تھے اس جگہ کو 'ہو دِشُم' کہا جاتا تھا۔ دِشُم دیس کو کہتے ہیں اور 'ہو' ایک قبیلہ کو کہا جاتا ہے یعنی 'ہو' لوگوں کا دیس ان کے رہنے اور بسنے کی جگہ۔ ان کے یہاں جہاں پنچایت ہوتی ہے اور فیصلہ کی بیٹھک ہوتی ہے اُسے 'اِسٹے ترُترُ' کہتے ہیں۔

ان کے یہاں عورتوں کو گھر کی چھپّر پر جانے نہیں دیا جاتا ان کے لیے میوزک کے آلات چھونا منع ہے۔ عام طور پر تیر و کمان چلانا منع ہے لیکن کسی خاص اور اہم موقع پر اس کی اجازت ہے۔ بچے کی پیدائش کے چار پانچ دن کے بعد 'نُر تاسنکار' منایا جاتا ہے۔ یعنی بچے کی پیدائش کے چار پانچ روز کے بعد اس بچے کو 'ہڑیا' چکھایا جاتا ہے۔ ہڑیا ایک دیسی شراب ہوتی ہے۔ ان کے یہاں محبوب غذا مانی جاتی ہے۔ اس ہڑیا (مشروب) کو ان کی زبان میں اِلی کہتے ہیں۔ اس مشروب کی اہمیت

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورحکومت میں جس جگہ 'ہو' قبیلہ کے لوگ رہتے تھے اس جگہ کو 'ہودِشُم' کہا جاتا تھا۔ دِشُم دیس کو کہتے ہیں اور 'ہو' ایک قبیلہ کو کہا جاتا ہے یعنی 'ہو' لوگوں کا دیس ان کے رہنے اور بسنے کی جگہ۔ ان کے یہاں جہاں پنچایت ہوتی ہے اور فیصلہ کی بیٹھک ہوتی ہے اُسے 'اِسٹے ترُترُ' کہتے ہیں۔

اس لیے وہ مانتے ہیں کہ اس کے بنانے کا طریقہ خود ان کے دیوتا (ناگے ارا) نے سکھایا ہے۔

یہ اس بات کو مانتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جاتا ہے لیکن اگر کسی کی طبعی موت نہیں بلکہ کسی حادثہ، خودکشی، ایکسیڈنٹ، قتل، ڈوب کر، جل کر ہوئی تو جب تک اس کی زندگی کا مقررہ وقت پورا نہ ہوجائے تب تک اس کی روح بھوت پریت بن کر بھٹکتی رہتی ہے۔ ان کے یہاں سب سے بڑا دیوتا سنگ بونگا ہے اسی کو وہ خالق مانتے ہیں اور ان کی اہلیہ کے روپ میں چاند بونگا کو مانتے ہیں اور یہ رحم و کرم کی دیوی ہوتی ہے۔ دیشاؤلی یہ برسات کی دیوی ہے۔ مَنیتا بونگا یہ امن و امان قائم رکھتا ہے۔ اس کے پجاری کو دِیُوری کہتے ہیں۔ بَنیتا بونگا یہ سزا دینے والا دیوتا ہے۔ یہ غصے والا دیوتا ہے اس کو منانے کے لیے پوجا کے وقت ہڑیا پیش کیا جاتا ہے۔ گاؤں کی حفاظت کرنے والے دیوتا کو پاہُوئی دیوتا کہتے ہیں۔

دھرتی ماتا کو اوری بوڑوم، پہاڑ دیوتا کو مارنگ بُرُو اور ناگ دیوتا کو ناگے دیوتا کہا جاتا ہے۔ ان کے یہاں کئی دیوتا ہوتے ہیں۔ سب الگ الگ مسائل کے حل کے لیے ہوتے ہیں۔ سب کی پوجا کرتے ہیں سب کے نام سے الگ الگ قربانی دیتے ہیں۔ اپنے اجداد کے نام سے پوجا پاٹ کرتے ہیں اور نذر و نیاز بھی دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اس طرح پوجا پاٹ اور نذر و نیاز سے بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ گاؤں اور گھر میں سکون کا ماحول رہتا ہے۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو ان کی روحیں ناراض ہوں گی اور ہم طرح طرح کی بیماریوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ بیماری سے شفایابی کے لیے پہلے چھوٹے جانور کی قربانی دیتے ہیں اگر اس سے فائدہ نہیں ہوا تو اس سے بڑے جانور کی قربانی دیتے ہیں۔ اس طرح سے وہ پہلے مرغ کی قربانی دیتے ہیں۔ پھر بکرے کی، پھر بھیڑ کی، بچھڑے کی، گائے کی پھر بھی شفا نہیں ملی تو آخر میں بھینس کی قربانی دیتے ہیں۔ ہو سماج کے لوگ نظم و نسق کو 'منڈا مانکی' کہتے ہیں۔ مکتب یا آنگن باڑی جہاں زندگی کے بنیادی آداب و اطوار، رہن سہن، سلیقہ، بڑوں کی عزت اور اچھے برے کی تمیز سے متعلق تعلیم دی جاتی ہے اس جگہ کو دھم کُڑیا بولتے ہیں۔

ہر سماج میں شادی ایک اہم سماجی اور مذہبی رسم بھی ہوتی ہے۔ اس سے دو خاندان کے درمیان مضبوط رشتہ قائم ہوتا ہے۔ 'ہو' سماج میں شادی کو 'اندِی' کہتے ہیں۔ ایک شادی کی اجازت ہے۔ شادی میں لڑکے والے لڑکی والے کو پیسہ دیتے ہیں اور پورا خرچ اٹھاتے ہیں اور شادی میں دلہن کو دی جانے والی رقم کو 'گولونگ' کہتے ہیں۔ ان کے یہاں آندِی ویواہ زیادہ مشہور ہے۔ یہ والدین کی رضامندی سے ہوتی ہے اور اس شادی میں جو کھانا کھلایا جاتا ہے اس کو 'جوم اسین' کہتے ہیں۔

ان کے یہاں شادی کے کچھ اقسام ہیں۔ مثال کے طور پر:

آندِی (Andi)

دِیکُو ی آندی (Deku Anadi)

اوپورتِپی (Marriage by Aportipi Capture)

راضی خوشی

آنادیر (Anader)

(آدیباسی تہذیب وثقافت، عبدالباری ایم اے، مرکزی

مکتبہ اسلامی، دہلی۔ جنوری 1992، ص:85)

اس کو آسانی کے ساتھ اس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ آبدِی اس شادی کو کہتے ہیں جس میں لڑکے والے لڑکی کے گھر رشتہ کے لیے جاتے ہیں۔ پھر دونوں کے گھر والوں کی منظوری اور پسند سے شادی ہو جاتی ہے اس کو آبدِی وواہ کہتے ہیں۔ دیکّو اس شادی کو کہا جاتا ہے جس میں 'ہوٗ ذاتی کے لوگ کسی دوسری ذات میں شادی کرتے ہیں اس کو دیکّو آبدِی کہتے ہیں۔ جب کسی میلہ یا گاؤں سے لڑکی کو لاتے ہیں پھر شادی کرتے ہیں اس کو 'اوپورتی' کہتے ہیں۔ راضی خوشی یعنی محبت کی شادی کو راضی خوشی کہتے ہیں۔ جب لڑکی کسی لڑکے کے گھر میں اپنی مرضی سے گھس کر اور زبردستی رہتی ہے اس کو اَنادیر، اَناہُت وواہ، ڈھکو چولکی وواہ بھی کہتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں دو طرح کی شادی کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک 'اورایرا ابدِی' دوسرا 'نیر ابدِی'۔ اس کی ادائیگی کی رسمیں بھی مختلف ہیں۔ اورایرا ابدِی میں کچھ رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ جس کی ادائیگی کے بعد شادی مکمل ہوتی ہے۔ وہ رسومات اس طرح سے ہیں اور اس کے نام یہ ہیں۔ پہلا 'اواڈیر نیل'، دوسرا 'بالا'، تیسرا 'ارے بونگ'، چوتھا 'شادی'۔ ان کی مختصر تشریح اس طرح سے بتائی جاتی ہے۔ اواڈیر نیل یہ وہ رسم ہے جب لڑکے والے رشتہ کے لیے لڑکی کے گھر جاتے ہیں اور یہ لڑکے والے پہل کرتے ہیں۔ لڑکی والے بھی ان کا مان سمّان کرتے ہیں۔ اس شروعاتی پہل کو جو دونوں طرف کے گھر والوں کی ملاقات ہوتی ہے اس کو 'دُوتیم' کہتے ہیں۔ لڑکے والے جب لڑکی والے کے گھر جاتے ہیں۔ جس میں کچھ قریبی رشتہ دار لوگ شامل ہوتے ہیں۔ اس میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لڑکے سفید لنگی، سفید بنیان اور کچھ لڑکے کمر یا سر پہ گمچھہ بھی لیے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں اور عورتیں اس وقت پیلے رنگ کی ساڑی، سرخ رنگ کا بلاؤز پہنی ہوتی ہیں۔ دونوں گھرانے کی ملاقات کے بعد جب شادی کا پیغام دیا جاتا ہے تو اس کے بعد لڑکی والے لڑکے کے گھر آتے ہیں۔ اس دیکھنے اور دکھانے کی رسم کو 'اواڈیر نیل' کہا جاتا ہے۔

پرانے زمانے میں لوگ رشتہ جوڑتے وقت کھیت کھلیان، گائے بیل، زمین دیکھ کر رشتہ طے کرتے تھے۔ بلکہ بڑے بوڑھے تو ان کے گھر میں موجود پُوال دیکھ کر ہی ان کی مالی حالت کا پتہ لگا لیتے تھے۔ یہ سب کچھ پہلی ملاقات اور بات چیت کے دوران ہی پتہ لگا لیتے تھے۔ دُوتیم کی رسم بہت ہی زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی میں شادی سے متعلق ساری کارروائی اور آگے کے لیے راستہ آسان ہوتا ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شادی کی بات چیت سے لے کر رخصتی ہونے تک کی تمام باتیں کسی نہ کسی طرح سامنے آجاتی ہیں۔ اس میں اہم فیصلے لیے جاتے ہیں اس لیے اس رسم کے لیے کسی قریب اور بزرگ کو شامل کرتے ہیں۔ لڑکی کی طرف سے لڑکی کے ماما کو جانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

ہر سماج کی طرح ان کے یہاں بھی مختلف طرح کے تہوار ہوتے ہیں۔ اس میں پورے گاؤں والوں کی شرکت اور تعاون ہوتا ہے۔ دیوی دیوتاؤں اور پُرکھوں کی پوجا ہوتی ہے۔ ان کے تہوار کسی نہ کسی طرح فطرت اور کھیتی باڑی سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان کے کچھ تہواروں کے نام اس طرح سے ہیں۔

(1) گئومارا تیوہار (Gaomara Festival)

(2) اتیلی تیوہار (Oteilee Festival) (3) ماگھی پَرب (Maghe) (4) بَہا پَرب (Baha Parab) (5) ہیرنگا پَرب (Herangh Festival)

(6) بورا بلنجی پَرب (Bora Balunji Festival)

(7) ہیروانگا پَرب (Hero Anga Festival)

(8) بٹاوالی اور جومناوا (Bataoli & Jomnawa)

اس طرح سے ہر ایک تہوار کو مختصر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ گئومارا تہوار جانوروں کی حفاظت کے لیے مناتے ہیں۔ جنوری کے شروع میں ہوتا ہے اور کائنات میں سب سے بڑی چیز سورج کو مانتے ہیں اس موقع پر سنگ بونگا (سورج دیوتا) اور حاطو بونگا (گاؤں کے دیوتا) کی پوجا کرتے ہیں اس سے ان کا یہی ماننا ہے کہ دیوتا خوش رہے اور سال بھر تک جانور صحیح سلامت رہے۔ اتیلی تہوار زمین کی پیداوار کے لیے منایا جاتا ہے۔ کیونکہ کھیتی باڑی اور اناج پر ہی زندگی کا گزر بسر ہوتا ہے۔ اس کی پوجا ہوتی ہے اس میں چڑھاوے کے طور پر زمین کو ہڑیا (علاقائی شراب) پیش کرتے ہیں۔ اور یہ نیک خواہشات رکھتے ہیں کہ جس طرح اس سال ہڑیا ملا اور پیداوار اچھی ہوئی آئندہ سال بھی اچھی رہے۔ ماگھے پَرب سب سے بڑا تہوار مانا گیا ہے۔ اس تہوار کو تقریباً ایک مہینہ تک خوب اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں۔ یہ فصل کی کٹائی کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔ ایک طرح سے خوب فراوانی ہوتی ہے۔ شادی بیاہ بھی رچاتے ہیں۔ ناچ، گیت اور شراب سے مست ہو کر زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ بَہا پرب موسم بہار کے موقع پر مارچ کے مہینے میں مناتے ہیں۔ زمیندار اپنے مزدوروں سے سال بھر کے کام کے لیے معاہدہ کرتے ہیں۔ آلات مزدوروں کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ مزدور خوش ہو کر اپنے مالکوں کو کھلاتے پلاتے ہیں اور ہڑیا پلانے کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ ہیرنگا پَرب کھیت میں بیج ڈالنے سے پہلے یہ تہوار مناتے ہیں۔ پہلے پنڈت پوجا کرتا ہے۔ اچھی فصل، اس کی نگرانی، آسمانی اور زمینی بلاؤں سے حفاظت کے لیے زمینی دیوتاؤں سے پرارتھنا کرتا ہے۔ بُورا بلنجی پرب تہوار میں یہ لوگ پہلے گاؤں کی صفائی کرتے ہیں۔ بدشگونی سمجھتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے پرانے برتن اور چیزوں کو گھر سے باہر پھینک آتے ہیں۔ گھر کی صفائی کے ساتھ گوبر لیپتے ہیں۔ اس دن گھر کے باہر ہی کھانا بنا کر کھاتے پیتے ہیں۔ شام کے وقت گھر لوٹتے ہیں اور اگلے دن کھیت بوائی کا کام کرتے ہیں۔ ہیروانگا تہوار میں بکرے کی قربانی دی جاتی ہے۔ کھیت بوائی کے ایک مہینہ بعد یہ تہوار مناتے ہیں اور کھیتی کے کام میں کسی طرح پریشانی نہ ہو اس کے لیے وہ اپنے دیوتا کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ بٹاولی اور جومناوا یہ تہوار اس وقت منایا جاتا ہے جب کھیتی کی کٹائی ہو جاتی ہے۔ سب کچھ اچھا سے اچھا ہوا ہوتا ہے تو پورے گاؤں والے جمع ہوتے ہیں اور شکریہ کے طور پر مناتے ہیں۔ (جھارکھنڈ کی پَرمکھ جَن جاتی، لوک کتھائیں، ناشر کلپ پرکاشن، سونیا وہار، دہلی، ڈاکٹر آدتیہ پرساد سنہا، 2024، ص:34)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'ہوٗ' جھارکھنڈ کی بڑی تعداد میں بولی جانے والی ایک زبان ہے۔ ریاستی سطح پر اس کے لسانی اور تہذیبی فروغ کے لیے ممکنہ طور پر کوشش کی جا رہی ہے۔ ہو ادب کے گیتوں، کہاوتوں، لوک کہانیوں اور ان کی تہذیبوں سے ہم (بالخصوص اردو داں طبقہ) نا آشنا ہیں اس لیے ان کو منظر عام پر لانے کی کوشش ایک بہترین کوشش ہوگی اور علاقائی تہذیب سے شناسائی کا اہم ذریعہ بھی ہوگی۔

■

Mohd Taiyib
Research Scholar, Center for Urdu Culture Studies
Room No. 07- Boys Hostel 04
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad, Telengana- 500032
Mobile: 9567246590
Email: taiyib333@gmail.com

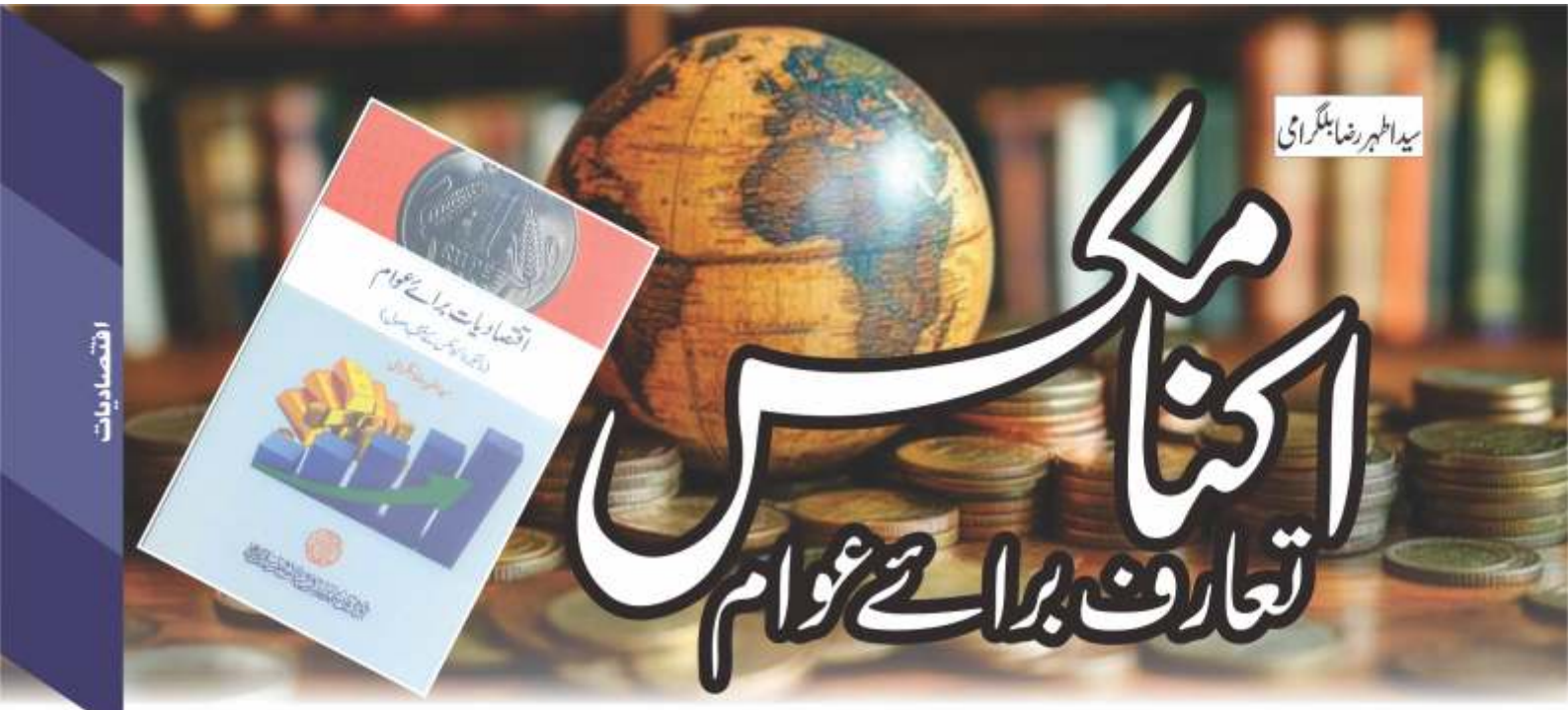

اکنامکس
تعارف برائے عوام

سید اطہر رضا بلگرامی

سماجی علوم میں اکنامکس (اقتصادیات یا معاشیات) واحد ایسا مضمون ہے جو زبان، طرز بیان، انداز تشخیص وتشریح اور اصطلاحات کے استعمال کے اعتبار سے دیگر مضامین سے مختلف ہے۔ آپ کسی موضوع کی کتاب کا مطالعہ کیجیے پہلا تصور یہی ابھرے گا کہ موضوع سے وابستہ تمام وضاحتیں، تشریحات اور انداز بیان نامانوس، غیر دلچسپ، روکھے اور اجنبی سے ہیں۔ ان میں ایسی کشش نہیں ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس سے وابستہ رہے۔

اصولوں و نظریوں کے بیان میں اصطلاحات سے لدے، پھندے بھاری بھرکم جملے وتشریحات میں طرز بیان کی اجنبیت، قدم قدم پر مفروضات کے سہارے، جگہ جگہ قیاسی اعداد و شمار پر مبنی مختلف النوع چارٹس، ڈائیگرامس اور خاکے اور پھر ریاضی، الجبرا کے پر پیچ فارمولے اور جیومیٹری کی پیچیدہ شکلیں معنی ومطلب کو سمجھنے اور ذہن نشین کرنے میں ذہن کو نہ جانے کتنے جھٹکے دیتے ہیں۔ پڑھنے میں قدم قدم پر عبارت کے مفہوم اور ذہن کا ربط ٹوٹتا ہے اور بالآخر پڑھنے والا الجھ کر یہ کہتے ہوئے کتاب بند کر دیتا ہے۔

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خم دار کی نمائش! مریض و کجدار کی نمائش

(اقبال: ضرب کلیم)

تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ سماجی علوم کا ایسا مضمون جو انسانی معاشرے کے اہم پہلو جس کا تعلق مادیت سے ہے، کا احاطہ کر رہا ہو، اتنا اہم و بنیادی پہلو کہ جس پر معاشی و سماجی زندگی کا کاروبار ٹکا ہو اور اس کی تمام تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی قدروں کو نہ صرف متاثر کرتا ہو بلکہ بنا اور بگاڑ بھی رہا ہو، ان کی پاسبانی بھی کر رہا ہو وہ اپنے بیان انداز تشریح اور زبان کے اعتبار سے عوامی ذہنوں سے اس قدر دور کیوں ہے۔ اس قدر غیر آشنا سا کیوں ہے اور عوام کے لیے غیر پرکشش سا کیوں ہے؟

دراصل یہ مضمون انسانی معاشرے کے جس پہلو کا احاطہ کرتا ہے وہ بظاہر جتنا واضح، روشن اور زندگی کی سرگرمیوں کے قریب لگتا ہے اتنا ہی پیچیدہ، وسیع اور گہرا ہے۔ اقتصادیات نے اس کو چار طرح کے عمل میں تقسیم کیا ہے:

اول: سادہ عمل، دوم: پیداوار کا عمل، سوم: عمل تبادلہ اور چہارم: عمل تقسیم

یہ تمام عمل مربوط ہیں۔ ہم کو کسی شے کی ضرورت ہے تو عمل پیداوار وجود میں آتا ہے۔ عمل پیداوار تبادلہ پر منحصر ہے اور جو پیداوار ہوتی ہے وہ تقسیم ہو کر ہماری تسکین کا باعث بنتی ہے۔ اقتصادیات میں مخصوص قوانین واصولوں کے تحت ہر عمل کی تشریح کی گئی ہے۔ مفکرین ومفسرین نے انسانی معاشرے کی مادی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سلجھانے کے لیے سائنسی طرز فکر اپنایا اور پھر جیسے جیسے یہ پیچیدگیاں بڑھیں، تشخیص بھی اسی قدر سافسٹی کیٹیڈ (Sophisticated) بنتی گئی۔ اب قیاس وحقیقی اعداد و شمار اور ان پر مبنی متعدد اقسام کے ٹیبلس (Tables) یا جدولوں، نقشوں (Charts)، تصویروں (Diagrams)، ریاضی والجبرا کے فارمولوں، ٹرگنامیٹری کی مشقوں اور جیومیٹری کی پر پیچ شکلوں کی مدد سے اصول و نظریات کی تشریح کی جانے لگی۔ ماہرین نے معاشرے کے اقتصادی (مادی) پہلوؤں کو گہرائی سے واضح کرنے کے لیے جس قدر سائنسی رخ اختیار کیا اسی قدر ان کے قوانین واصول کی تشریح لفظوں وجملوں سے نکل کر اعداد و شمار اور ریاضی والجبرا کے فارمولوں اور جیومیٹری کی شکلوں میں گم ہوتی گئی اور معاشرے کے عام انسان کی فہم سے دور ہوتی گئی۔ اس مضمون کے ساتھ عوام کی غیر دلچسپی کا بنیادی سبب یہی ہے۔

چلیے ہم اس مضمون کی اجنبیت و غیر مانوسیت کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ اصول معاشیات کی کوئی مستند کتاب کھولیں تو سب سے پہلے ایک تعارفی باب ملے گا جس میں اقتصادیات کی تعریف، اس موضوع کا اسکوپ (دائرہ اثر) دیگر مضامین سے اس کی نسبت، سائنس ہے یا آرٹ اور آخر میں ابواب کی تنظیم ملے گی۔ اصول معاشیات کے مواد کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصہ متعدد ابواب پر مشتمل ہے۔ انسانی معاشرے کے چار بنیادی مادی افعال ہیں۔ اس کی مادی ضرورتیں ہیں جن کی تکمیل کے لیے وہ جدوجہد اور کاوشیں کرتا ہے۔ یہ جدوجہد، کاوشیں پیداوار و خدمات کی شکل میں رونما ہوتی ہیں۔ وہ اپنی کاوشوں کے انعام کو تقسیم کرتا ہے کیونکہ وہ دوسروں کے تعاون کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔ تقسیم صَرف یعنی خرچ کے لیے ہوتی ہے اور یہی صرف آخری تسکین کا باعث بنتا ہے۔ یہ مختلف النوع مادی افعال طلب (مانگ)، پیداوار، تبادلہ (پیداوار اور خدمتوں کا) اور تقسیم میں منقسم ہو کر متعدد اصولوں اور نظریوں کے ذریعہ واضح کیے جاتے ہیں۔ آیئے پہلے صرف سے متعلق نظریہ طلب کی بات کریں۔

اصول معاشیات میں نظریہ طلب (یعنی اشیا وخدمات

کی مانگ) نظریہ صارفین (یعنی صرف کرنے والے) کا ابتدائی باب ہے۔ نظریہ صارفین (Consumers Theory) کے تحت جن اصولوں کی وضاحتیں اور تشریحات ملتی ہیں ان میں نظریہ طلب و رسد (Theory of Demand & Supply)، طلب و رسد کی لچک (Elasticity of Demand & Supply)، صارفین کا نقطۂ توازن (Comsumer's Equilibrium)، نظریہ افادہ (Utility Theory)، خط بے نیازی (Indifference Curve) اور اضافہ صارفین (Consumer's Surplus) خصوصی توجہ کے حامل ہیں۔

سب سے پہلے اس پر غور کیجیے کہ اقتصادیات میں تمام بنی نوع انسان کو ان کے عمل صرف کو نگاہ میں رکھتے ہوئے صارفین کا نام دیا گیا ہے۔ انسان نوزائیدہ بچہ ہو یا بوڑھا عمر کے کسی دور سے گزر رہا ہو، کسی پیشہ کو اختیار کیے ہو، راجہ ہو یا پرجا، صاحب اختیار ہو یا محتاج، تنہائی پسند ہو یا مجلسی، گھر میں ہو یا گھر کے باہر، وطن میں ہو یا وطن سے دور، صحت مند ہو یا بیمار، خوشحال و مطمئن ہو یا پریشان و افسردہ، اس کے افکار و خیالات اور عقائد کچھ بھی ہوں ہر حال میں اگر سانس لے کر زندگی کا ثبوت دے رہا ہے تو صارف ہے، وہ صرف کے عمل سے نہ گریز کر سکتا ہے اور نہ انحراف۔ اگر کوئی انسان یا گروہ خود اختیاری طور پر ارادتاً یا جبراً صرف کے عمل سے گریز کرتا ہے تو وہ اقتصادیات کے دائرے سے باہر ہے کیونکہ اس کا یہ فعل معقولیت کے خلاف ہوگا اور بڑی حد تک اس کی فطرت کے بھی۔

انسان کے اس عمل صرف کو ابھارنے، اکسانے اور بڑھانے والے عوامل خواہشات، ضرورتیں اور طلب ہیں۔ یہی جذبے متحرک ہو کر عمل صرف کو سرگرم رکھتے ہیں۔ اقتصادیات انسان کے ان تمام جذبوں کو قبول کرتا ہے، احترام کرتا ہے لیکن اپنی فکر و نظر طلب پر مرکوز رکھتا ہے۔ وہ اس کی منطقی دلیل و تشریح پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان آرزوؤں و خواہشوں کا پتلا ہے۔ ویسے بھی ہم جانتے ہیں کہ ہر آدمی کے عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی مدعا ہوتا ہے۔ دل بے مدعا ہونا تو قریب قریب ناممکن بات ہے۔ پھر بھی بیشتر آرزوئیں و خواہشات محض آرزوئیں ہوتی ہیں جن کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ ان کی کوئی حد کوئی ڈسپلن کوئی طریق کار بھی معین نہیں ہوتا۔ وہ مطلق آزاد ہوتی ہیں۔ اس لیے انسان چاہے جتنا صاحب اختیار کیوں نہ ہو، ہر آرزو، ہر خواہش کو پورا کرنے پر قادر بھی نہیں ہو سکتا۔ اقتصادیات انسان کے ہر اس عمل کو اپنی فکر میں باندھتا ہے جس کے پیچھے سعی و کاوش ہو اور کاوش کرنے والا اس کا مادی شکل میں، کوئی معاوضہ بھی چاہتا ہو۔ اس لیے وہ محض ان خواہشات اور آرزوؤں کو قابل توجہ سمجھتا ہے جن کو پورا کرنے کے لیے انسان حسب اہلیت اور حسب استعداد کوشش کرتا ہے۔

اقتصادیات نے اپنی تشخیص کو اور آگے بڑھایا۔ اس نے واضح کیا کہ ہر انسان کے وسائل، ان پر اس کی قدرت، طبیعت، مزاج، ترجیحات یکساں نہیں ہوتیں۔ اس لیے ہر انسان اپنی ضرورتوں کو اپنی پسند، استعداد و ترجیحات کے بموجب پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب اقتصادیات انسانی ذہن کو زیادہ جامع اور حقیقت پسندانہ فکر کی طرف موڑتا ہے۔ غور کیجیے انہی آرزوؤں و خواہشات کے کبھی نہ ٹوٹنے والے تسلسل کے درمیان چند ایسی قوی خواہشات ضرور ہوتی ہیں جو بار بار ابھرتی ہیں اور جن کا ٹالنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ جس وقت ابھرتی ہیں دیگر تمام خواہشات پیچھے ہو جاتی ہیں۔ پیاس، بھوک، انتہائی سردی میں فوری طور پر گرمی اور انتہائی گرمی میں کسی سائے یا ٹھنڈک حاصل کرنے کی خواہش اس کی چند مثالیں ہیں۔ اگر انسان کسی عادت کا اسیر ہے مثلاً چائے کوفی، شراب سگریٹ وغیرہ وہ بھی اسی ضمن کی خواہشات ہیں۔ ایسی قوی خواہشات کی تسکین کے لیے ہر انسان اپنی استعداد کے بموجب سعی و کاوش کرتا ہے۔ اقتصادیات میں ایسی قوی خواہشات کو 'ضرورت' (Wants) کہا گیا۔ انسان کی لامتناہی خواہشات و آرزوؤں کے انبوہ میں سے چھانٹ پھٹک کر ان قوی خواہشات کو الگ کرنا جو انسان کو بار بار مجبور کرتی رہیں کہ ان کو پورا کیا جائے اور انسان بھی وقتی طور پر ہی سہی، ان کو پورا کرنے کی کاوش میں سرگرداں نظر آئے، اقتصادیات میں قابل توجہ مطالعہ کا میدان بنا اور 'ضرورتوں' کا عنوان دے کر خواہشات کے انبار سے ان کو الگ کر لیا۔

اقتصادیات نے اپنی تشخیص کو اور آگے بڑھایا۔ اس نے واضح کیا کہ ہر انسان کے وسائل، ان پر اس کی قدرت، طبیعت، مزاج، ترجیحات یکساں نہیں ہوتیں۔ اس لیے ہر انسان اپنی ضرورتوں کو اپنی پسند، استعداد و ترجیحات کے بموجب پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر چند دوستوں کو ایک قلم کی ضرورت ہے تو ضروری نہیں کہ سبھی ایک جیسا، ایک ہی قیمت کا قلم خریدیں، کوئی قیمتی اور کوئی معمولی قلم خرید سکتا۔ یہاں جو شرط تمام دوستوں میں مشترک ہے وہ قلم کی ضرورت ہے۔ اب ہر دوست اس ضرورت کو اپنی استعداد و پسند کے مطابق پورا کرے گا۔ بس جہاں ضرورت کو استعداد، ترجیح و پسند سے منسلک کر کے پورا کیا وہیں ضرورت (Want) طلب (Demand) میں منتقل ہو گئی۔ اقتصادیات کی تمام تر توجہ اسی طلب کی طرف ہے۔

آپ نے دیکھا کہ اکنامکس نے کس طرح آرزوؤں و خواہشات کے بکھراؤ کو سمیٹا اور ایک با مقصد فعل کی طرف منتقل کر دیا۔ آپ خواہشات سے طلب کی منزل تک آتے آتے مکمل معاشی انسان بن گئے۔ انہی معاشی انسانوں کو صارفین (Consumers) کہا گیا ہے یعنی ایک فعال انسان۔ ایک معقول انسان میں آرزوئیں و خواہشات ہوتی ہیں۔ ان کو پورا کرنے کا جذبہ ہوتا ہے، خواہشات کے انبوہ میں چند قوی خواہشات ایسی ہوتی ہیں جن کو پورا کیے بغیر اس کو سکون نہیں ملتا۔ ان کو پورا کرنے کی وہ سعی و کاوش کرتا ہے اور پھر اپنی استعداد و ترجیح کے بموجب وہ ان کو پورا کرتا ہے۔ پس یہی کاوشیں کسی شے کے حصول کا باعث بنتی ہیں اور جب اس حاصل شدہ شے کا استعمال ضرورت کی تسکین کا ذریعہ بنتی ہے تو انسان کو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے۔ یہی تسکین صارف کا مقصد آخر ہے اور یہیں پر انسان کی معاشی شخصیت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

بالعموم ہر انسان اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے آمدنی و دولت کو وسیلہ بناتا ہے۔ یعنی کسی ضرورت کی شے یا خدمت کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی آمدنی یا دولت کا ایک حصہ بطور معاوضہ یا قیمت ادا کرتا ہے۔ یہی آمدنی و دولت گویا اس کی استعداد کا تعین کرتی ہے۔ یعنی کسی شے یا خدمت کے حصول میں آپ جو قیمت ادا

کرتے ہیں وہ آپ کی استعداد کو ناپتی ہے۔ آپ ایک جنس کو کسی دوسری جنس سے بھی بدل کر ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں۔ آپ یہ عمل اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب بدلی جانے والی اشیا یا چیزیں ایک دوسرے کی ضرورت کی تکمیل کر رہی ہوں۔ پھر اس تبادلہ میں کسی فریق کو نقصان کا احساس بھی نہ ہو۔ تہذیب کے ابتدائی دور میں اور عصر حاضر میں دور دراز کے دیہی علاقوں میں یہ رواج جاری ہے لیکن آج کے مہذب سماج کا چلن یہی ہے کہ اشیا و خدمات کا حصول قیمت ادا کر کے کیا جائے۔ یہ ہمارے سب کے تجربے کی بات ہے کہ جب کسی شے یا خدمت کی قیمت زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کو کم طلب کیا جاتا ہے اور جب قیمت گری ہوئی ہوتی ہے تو طلب کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔

نظریہ طلب اس حقیقت کی وضاحت و تشریح کرتا ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اگر دیگر باتیں یکساں رہیں تو قیمت اور طلب کے درمیان مخالف رشتہ پایا جاتا ہے۔ یعنی قیمت بڑھنے پر طلب کم اور قیمت گرنے پر طلب زیادہ ہوتی ہے۔ یہ اصول بہت سے گوشوں کی وضاحتیں کرتا ہے۔ قیمت کے اونچے ہونے پر طلب کرنے والوں کی تعداد کم اور گرنے پر زیادہ اس لیے ہو سکتی ہے کہ اونچی قیمت کی ادائیگی کی استعداد تھوڑے لوگوں میں ہوگی اور جیسے جیسے قیمت گرے گی صارفین کی استعداد کا دائرہ وسیع ہوگا اور زیادہ سے زیادہ صارفین کا گروہ اس شے کو حاصل کرنے کے قابل ہوگا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ اصول یوں تو ہر شے یا خدمت سے وابستہ ہے لیکن چند اشیا کی طلب پر یہ اصول منطبق نہیں ہوتا بلکہ ان اشیا کے ساتھ اصول الٹا ہے۔ یعنی ان اشیا کی طلب قیمت کے بڑھنے پر بڑھتی ہے اور گھٹنے پر گھٹتی ہے۔ تاریخی نوادرات کی طلب کی یہی نوعیت ہے قیمتی تاریخی اور نادر ڈاک ٹکٹ، تاریخی عجوبے نگینے، جواہرات بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ چونکہ بیشتر عوام سے ان اشیا کا تعلق نہیں ہے بلکہ سماج کے مخصوص افراد سے ان کا تعلق ہے اس لیے عام طلب کے اصول کے دائرے میں ان کو نہیں رکھا جاتا۔ تیسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس اصول کے ابتدا میں ''اگر دیگر باتیں یکساں ہیں'' کا فقرہ معنی خیز ہے۔ یہ جملہ اس اصول کے پورا ہونے کی شرائط بتلاتا ہے۔ ''اگر دیگر باتیں یکساں ہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی طلب نارمل ہو یعنی کسی ہنگامی صورت حال کا نتیجہ نہ ہو۔ آپ کی آمدنی کی سطح میں کوئی تبدیلی نہیں ہو۔ اگر آمدنی اچانک بڑھ یا گھٹ جاتی ہے تو وہ مروجہ قیمتوں پر طلب کو متاثر کر سکتی ہے۔ آپ کی پسند، مذاق اور ترجیحات میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں آنا چاہیے۔ اشیا کی پیکنگ، کوالٹی، سائز اور رسدی خدمات بھی نارمل رہیں گی۔ اس شے کا مطلق متبادل بازار میں موجود نہیں ہوگا۔ افراد خاندان میں اچانک تخفیف یا اضافہ نہیں ہوگا۔ کوئی اچانک جغرافیائی یا سیاسی حالات میں تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ اس شے کی پیداوار، دستیابی اور قیمتوں کے سلسلے میں حکومت کی پالیسیوں میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام مفروضات ہیں جن کو سمیٹ کر یہ کہہ دیا گیا ''اگر دیگر باتیں یکساں ہیں'' تو اشیا کی قیمت اور اس کی طلب میں مخالف رشتہ پایا جاتا ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت اور ملتی ہے۔ طلب تین نوعیتوں کی بتلائی گئی ہے۔ اول طلب برائے اشیا ضروری یا مقدم (Primary)۔ دوم طلب برائے اشیا راحت و آرام یعنی (Comfort) اور سوم طلب برائے اشیا عیش و عشرت (Luxuries)۔ قیمتوں کے ساتھ ہر ایک کا رشتہ جداگانہ ہے، جس کو طلب کی حساسیت کے بطور واضح کیا گیا ہے۔ تکنیکی اصطلاح میں Price Elasticity of Demand یا Price Responsiveness کہا گیا۔ اشیا ضروری یا مقدم جیسے نمک یا لائف سیونگ ڈرگس، غذا کی بنیادی اشیا وغیرہ قیمتوں کے سلسلے میں بہت حساس نہیں ہوتیں یعنی اگر ان کی قیمتیں بڑھتی یا گھٹتی ہیں تو طلب کی سطح پر کوئی نمایاں فرق نہیں پڑتا۔ ایسی اشیا کی طلب بے لوچ کہلاتی ہے۔ آرام و آسائش کی تمام اشیا کی طلب لوچ دار ہوتی ہے۔ یعنی قیمتوں کے بڑھنے پر طلب گرتی ہے اور گرنے پر بڑھتی ہے۔ ان میں بھی حساسیت کے نقطہ نظر سے مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ بالعموم وہ اشیا جو پائدار ہوتی ہیں کم حساس ہوتی ہے، یعنی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا اثر نسبتاً کم ہوتا ہے۔ لیکن ناپائدار اشیا کی طلب بہت حساس ہوتی ہیں۔ قیمتوں کے چڑھنے پر طلب بہت کم اور گرنے پر بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ گھر کا تمام ساز و سامان الکٹرانک سامان، فرنیچر، قیمتی ملبوسات، کاریں، موٹر سائکلیں، سجاوٹی سامان وغیرہ اسی ضمن کی اشیا ہیں۔ عیش و عشرت کے ساز و سامان کی طلب بالعموم بہت حساس ہوتی ہے۔ تھوڑی سی قیمتوں میں گراوٹ طلب کو بہت بڑھا دیتی ہے اور قیمتوں میں معمولی سا اٹھان طلب کو بہت گرا دیتی ہے۔ قیمتی قالین، جھاڑ فانوس، قیمتی کاریں، ائیر کنڈیشنر، قیمتی ظروف، کپڑے اور قیمتی الکٹرانک سامان اسی ضمن میں آتے ہیں۔

ان تمام تفصیلات کو زیادہ ذی فہم حقیقت کے قریب اور سائنٹفک طور پر زیادہ واضح بنانے کے لیے مفکرین نے قیاسی اعداد و شمار پر مبنی مختلف ٹیبلس اور جیومیٹری کی شکلوں کا سہارا لیا۔ قانون طلب اور خط طلب کی حساسیت برائے تغیر قیمت کو ان ٹیبلس اور شکلوں کے ذریعہ واضح کیا گیا۔ اب اگر یہ وضاحتیں ان اعداد و شمار اور شکلوں کی مدد سے زیادہ آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہیں تو تشریح کا یہ انداز زیادہ موثر ہوگا۔ مزید انہی تشریحات کو ریاضی و الجبرا کے فارمولوں میں ڈھال لیا گیا اور ان کو زیادہ سائنٹفک بنا لیا گیا۔ مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ کسی شے کی طلب اس کی قیمت سے وابستہ ہوتی ہے یا کسی شے کی طلب کا فعل اس شے کی قیمت سے وابستہ ہے تو آپ کہیں گے D=f(p) یعنی طلب Demand عمل ہے قیمت یعنی 'p' کا۔ یہ انتہائی چھوٹی اور ابتدائی مثال ہے جو مخصوص فکر کی سمت کا تعین کرتی ہے۔ آپ کو اصول معاشیات کی تمام وضاحتیں اس انداز سے ملیں گی۔ یہ سب تشریحات کے طریق کار ہیں، انداز ہیں، ذرائع ہیں جو وضاحتوں کو پھیلانے کے بجائے سمیٹتے ہیں اور اختصار میں سب کچھ واضح کر دیتے ہیں۔ اس اختصار کی روش کو اپنانے سے قبل اصول و نظریوں کی وضاحتیں انسانی معاشرے کے قریب رہ کر کرنا ضروری ہے تاکہ پڑھنے والا ذہنی طور پر منسلک رہے اور اگر اس کو مزید سائنٹفک طور پر سمجھنا ہو اور جس کے لیے اس کا ذہن تیار ہو تو پھر ریاضی، جیومیٹری اور ٹرگنا میٹری کی پر پیچ وادیوں کی سیر کرے اور انہی اصولوں و نظریوں کو انہی کے فریم میں سمجھے۔ اگر آپ غور کریں گے تو اکنامکس کا کوئی اصول، کوئی نظریہ آپ کی عملی زندگی سے زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ کوئی اصول، کوئی نظریہ پڑھیے اور معاشرے کی عملی زندگی کو دیکھیے، کہیں نہ کہیں وہ جگمگاتا ہوا نظر آ جائے گا۔

■

ماخذ: اقتصادیات برائے عوام (مائیکرو اکنامکس کے منتخب اصول)، **مصنف:** سید اطہر رضا بلگرامی، **پہلی اشاعت:** 2014، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ہمدردانہ حیوانی تحقیق

حکیم فخر عالم

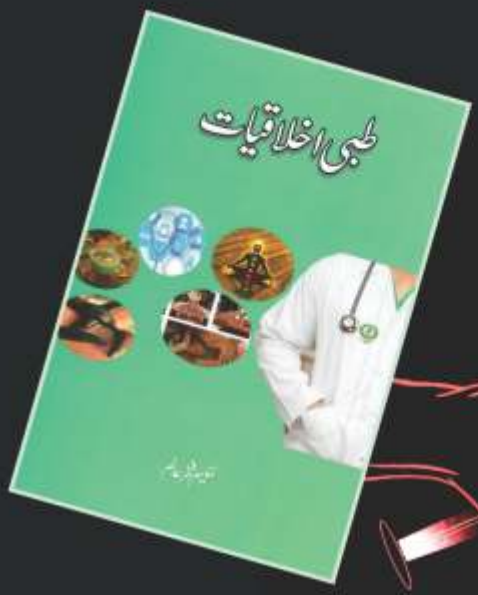

طبی تحقیق میں تجربہ کے لیے حیوانات کے استعمال کی روایت دوسری صدی عیسوی سے ملتی ہے، لیکن اس کا باقاعدہ رواج پچھلے ڈیڑھ سو برس سے ہے اور بتدریج اس میں وسعت آتی جارہی ہے۔ اخلاقیات کے حوالہ سے بیداری شعور کی یہ بڑی علامت ہے کہ اب زیر تحقیق حیوانوں کے باب میں ہمدردانہ سوچ کا جذبہ پایا جانے لگا ہے، لیکن اس سلسلے میں ماضی اور حال کے رویوں میں دو انتہا رہی ہیں، چنانچہ پہلے تحقیق کے نام پر حیوانوں کا بے دریغ استعمال ہورہا تھا، اب اسے اتنا مشروط کردیا گیا ہے کہ تحقیق کے ضروری کام بھی متاثر ہونے لگے ہیں۔

اس وقت کئی ایسے ادارے ہیں جو تجربے میں حیوانی استعمال کے بجائے، ان کے متبادل کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ہیڈوین ٹرسٹ (Dr. hadven trust) اس سلسلے کا ایک اہم نام ہے۔ ہمدردانہ تحقیق کے فروغ کے لیے یہ ادارہ نہ صرف خود مصروف عمل ہے، بلکہ اس باب میں ذہن سازی کر کے محققین کے درمیان رائے بھی ہموار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

1895 میں (the new england anti vivisection (neavs society قائم ہوئی تھی، یہ تنظیم ہر طرح کے حیوانی تجربوں کے خلاف تھی۔ اس کے مطابق جب 1966 میں طبی اور سائنسی تحقیق میں استعمال ہونے والے حیوانات کے فلاحی ضابطے (animal welfare(act awa وضع ہورہے تھے، اس وقت چوہوں کو اس دائرے سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا، نتیجۃً کاران کا بے تحاشا استعمال شروع ہوگیا اور انھیں disposable living organism سمجھا جانے لگا، حالانکہ بہت سی مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ تشریحی ساخت اور منافع الاعضائی حالت میں یہ انسانوں سے بے حد اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ کئی ایسے تجربے جو چوہوں میں مفید اور مثبت نتائج کے حامل رہے، لیکن انسانوں پر تجربہ کے وقت ان کے بے حد نقصان دہ اثرات سامنے آئے۔ مثلاً وجع المفاصل کی دوا flosint انسانوں کے لیے مہلک ہے، اسی طرح ڈپریشن دور کرنے والی دوا zimid انسانوں میں neurological damage کا سبب ہوتی ہے اور clioquinol جو اسہال کی دوا ہے، انسانوں میں blindness اور paralysis کا باعث ہوتی ہے، جب کہ یہ سبھی دوائیں حیوانی تجربہ کے مرحلے سے گزرنے کے بعد انسانوں میں استعمال کی گئی ہیں۔ یہ ساری مثالیں حیوانی تجربوں سے حاصل تمام معلومات کی حتمی افادیت کی توثیق نہیں کرتی ہیں، لہٰذا ان سے حاصل ہونے والی ایسی غیر یقینی معلومات کے لیے ان پر تجربہ کی مشق کی سفارش نہیں کی جاسکتی ہے۔

انیسویں صدی کا ربع آخر حیوانات کے تعلق سے بیداری کا بڑا اہم زمانہ ہے۔ اس عہد میں عالمی سطح پر عوامی اور سیاسی حلقوں میں animal experimentation کے سلسلے میں اولاً گفتگو کا آغاز اس طرح ہوا کہ 1874 برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن (bma) کی سالانہ میٹنگ میں فرانسیسی سائنسداں Dr. eugene magnan الکوحل کے منافع الاعضائی اثرات پر لکچر کے لیے مدعو تھے۔ لکچر کے بعد انھوں نے ایک کتے میں absinthe کے درون وریدی انجکشن کے ذریعہ experimental epilepsy کا demonstration کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ether اور chloroform جیسی general anaesthesia کی دوائیں معرض وجود میں نہیں آئی تھیں، اس وقت یورپ میں physiological research کے لیے animal experimentation کا عام رواج تھا، جب کہ برطانیہ میں یہ شاذ و نادر ہوتا تھا اور محض چند سائنسداں ایسے تھے جو conscious animal پر invasive experiments کے بارے میں سوچتے تھے۔ چنانچہ Dr. magnan کے واقعہ پر برطانیہ میں شدید احتجاج ہوئے، وہاں کے مشہور اخبارات اور رسائل و جرائد نے بھی اس معاملہ میں بے حد دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ بحث و مباحثہ کا یہ سلسلہ تقریباً دو برس رہا، اسی دوران پہلی antivivisection سوسائٹی کی تشکیل ہوئی، جس نے اس کے خلاف بل تک پیش کیا۔ دفاع میں ڈاکٹروں نے بھی مورچہ سنبھالا، نتیجتاً حکومت نے اس کیس کی تفتیش کے لیے رائل کمیشن بنایا، جس نے مفاہمت کے لیے درمیانی راہ نکالنے کی تدبیر کی۔

برطانیہ کے ساتھ امریکہ میں بھی اسی زمانہ میں اس بحث نے جنم لیا اور ہنری برگ نے american society for the prevention of cruelty to animals (aspca) کے تحت زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ کے خلاف تحریک کا آغاز کیا۔ اس نے نیویارک لیجسلیچر میں vivisection کو جرم قرار دینے کا بل پیش کیا، مگر وہاں کی

میڈکل سوسائیٹیز کی مخالفت کی وجہ سے اس بل کو سیاسی حمایت نہیں ملی۔1883 میں caroline earle white نےamerican anti vivisection society قائم کی تھی، یہ امریکہ میں اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی، جو تحقیق میں حیوانی تجربوں کی روک تھام کے لیے بنائی گئی تھی۔

جنگ عظیم اول کے آغاز کے بعد یورپ اور امریکہ دونوں جگہوں پر حیوانات پر تجربوں سے متعلق بحث عملاً ختم ہوگئی، پھر اس کا احیا 1970 کے عشرے میں ہوا۔اس بارزندہ جانوروں کی چیر پھاڑ کی مخالفت کرنے والی اور حیوانات کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں کوشاں تنظیموں نے مشترکہ محاذ بنا کر حیوانی تحقیق و تجربہ سے متعلق قانون سازی کی تحریک شروع کی۔1980 کے عشرے میں امریکہ کے اندر اس تحریک نے پر تشدد شکل اختیار کر لی۔مظاہرین کے ذریعہ Dr.edward taubs کے institute of behavioural research کی لیبوریٹری پر حملہ اسی کا ایک نمونہ تھا۔

انگلینڈ میں اس وقت بھی اس مباحثہ کی گرم بازاری محسوس کی جا رہی ہے۔ antivivisection کی کچھ حمایتی تنظیمیں جو انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہوئی تھیں، اب بھی سرگرم عمل نظر آتی ہیں۔یہاں حیوانی تجربوں کی مخالفت کرنے والے لوگ تین حصوں میں بٹے دکھائی دیتے ہیں۔royal society for the prevention of cruelty to animals (rspca) جیسی جماعتیں کسی قدر عملی نقطہ نظر رکھتی ہیں۔یہ اس کو طویل مدتی سمجھتی ہیں اور مانتی ہیں کہ مستقبل قریب میں اس سلسلے کا موقوف ہونا ممکن نہیں ہے، لہٰذا جب تک تجربہ کے لیے غیر حیوانی (non-animal) طریقے متبادل کی صورت میں سامنے نہیں آجاتے سائنسدانوں کے ساتھ مل کرlaboratory animals کی بہتری کے لیے کوشش کی جائے۔

antivivisection اور animal-right کی mainstream سے تعلق رکھنے والے گروپ اپنے اہداف کے سلسلے میں بے حد متحرک نظر آتے ہیں، لیکن ان کے یہاں حزم واحتیاط اور قانونی پاسداری بھی محسوس ہوتی ہے۔اس زمرہ کی بعض تنظیمیں سخت موقف رکھتی ہیں، ان کی دلیل ہے کہ سائنسی لحاظ سے حیوانی تجربوں کی معلومات غیر اہم اور طبی افادیت سے خالی ہوتی ہیں اور حیوانی تحقیق سے برآمد ہونے والے نتائج غیر تسلی بخش ہونے کے ساتھ ہمیشہ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

گذشتہ کچھ دہائیوں سے حیوانی حقوق کی نظریاتی سوچ کو بڑھاوا ملا ہے اور یہ بنیاد پرستی کی طرف گامزن نظر آرہی ہے اور اپنے مطالبہ کے سلسلے میں ان کے حاملین کے مظاہرے پر تشدد ہوتے جارہے ہیں۔

اس تاریخی منظر نامہ سے حیوانی تجربوں کی بابت عوامی رجحانات کے عوامل اور محرکات سے آگاہی ہوتی ہے۔انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں احتجاج کا سبب لیب میں استعمال ہونے والے جانوروں کے ساتھ بے رحمانہ اور ظالمانہ برتاؤ تھا اور اب مباحثہ اس سوال پر مرکوز ہے کہ کیا حیوانی تحقیق ضروری ہے؟ اور اس سے کیا طبی پیش رفت ہوئی ہے؟ اور کیا اس کی جگہ کسی متبادل کا استعمال ہوسکتا ہے؟

اس تحریک کے خلاف ردعمل کے طور پر سائنٹفک کمیونٹی نے تنظیمی محاذ کے ذریعہ اپنا موقف رکھنے کا فیصلہ کیا۔ physiological society اس قسم کی پہلی تنظیم ہے، اس کا قیام برطانیہ میں 1876 میں عمل میں آیا تھا۔

گذشتہ ڈیڑھ صدی سے جاری حیوانی حقوق کی تحریک سے تجربہ میں استعمال ہونے والے حیوانات کے حقوق کی پاس داری کا جو شعور پیدا ہوا ہے، اسے ان تحریکوں کی ایک بڑی کامیابی قرار دینا چاہیے۔حالانکہ یہ سوال اپنی جگہ اب بھی قائم ہے کہ طبی تحقیق میں جانوروں کے استعمال کے علاوہ اور کیا کیا متبادل ہوسکتے ہیں؟ لیکن جب تک اس کے متبادل کی مناسب صورتیں سامنے نہیں آتیں، حیوانی تجربوں کی ناگزیریت بہرحال رہے گی، گرچہ تحفظات کے ساتھ۔

منسٹری آف سوشل جسٹس اینڈ امپاورمنٹ نے 1960 animal act کے تحت حیوانی کاشت اور نگہداشت سے متعلق 15 دسمبر 1998 کو جو گزٹ نوٹیفیکیشن کیا ہے اس میں تجربہ کے لیے استعمال ہونے والے animals کے رکھ رکھاؤ سے متعلق درج ذیل رہنما ضابطے دیے ہیں:

گذشتہ کچھ دہائیوں سے حیوانی حقوق کی نظریاتی سوچ کو بڑھاوا ملا ہے اور یہ بنیاد پرستی کی طرف گامزن نظر آرہی ہے اور اپنے مطالبہ کے سلسلے میں ان کے حاملین کے مظاہرے پر تشدد ہوتے جارہے ہیں۔

1 animal house ایسے پرسکون مقام پر ہو کہ ٹریفک سے ماحول میں خلل نہ پڑے، جگہ صاف ستھری اور ہائجینک ہو، خشک سالی اور موسمی شدت سے محفوظ ہو۔

2،3 چھوٹے جانوروں کے پنجرے اور بڑے جانوروں کے باڑے ایسے ہوں، جہاں یہ آرام سے رہ سکیں، زیادہ بھیڑ اور کھچ پچ نہ ہو، یہ مقامات متعینہ معیار کے مطابق ہوں۔

4 جانوروں کی خدمت پر مامور شخص آزمودہ کار اور تجربہ کار ہونا چاہیے۔

5 تجربہ سے پہلے اور تجربہ کے بعد ماہر اور تجربہ کار اٹنڈنٹ کے ذریعہ جانوروں کی دیکھ بھال کی جائے۔

6 چھٹی کے اوقات میں بھی جانوروں کی دیکھ بھال کا معقول نظم ہو۔

7 جانوروں پر تجربہ سے پہلے کمیٹی سے پیشگی اجازت ضروری ہے۔اس کے حصول اور جانوروں پر کسی تجربہ سے پہلے منظور شدہ animal ethics committee سے باضابطہ اجازت لے لی جائے اور متعلقہ کمیٹی جانچ پڑتال کر کے، اگر مطمئن ہو تو، کس نوع کا جانور اور کتنی تعداد میں مطلوب ہے؟، اس تحدید کے ساتھ اجازت عطا کرے اور یہ مشروط کرے کہ جانوروں کو کسی بھی مرحلہ میں بلاوجہ درد اور تکلیف نہ ہونے پائے۔

تجربہ کے سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ یہ عمل انجام دینے والا شخص یا جس کی نگرانی میں انجام دیا جائے وہ باضابطہ کوالیفائڈ ہو۔وہ Veterinary science یا laboratory animal science کی ڈگری یا ڈپلومہ رکھتا ہو۔

تجربہ کے وقت مناسب احتیاط برتی جائے اور انسانی اقدار کا پاس و لحاظ رکھا جائے۔

جن جانوروں پر تجربہ مقصود ہو انھیں تجربہ سے پہلے اور تجربہ کے بعد مناسب دیکھ بھال میں رکھا جائے۔

8 اگر تجربہ میں ایسا operative procedure شامل ہو جو ٹیکہ کاری اور superficial Venesection سے بڑا ہو تو بہر صورت anaesthetic کے زیر اثر ہونا چاہیے تا کہ جانور کو تکلیف نہ ہونے پائے اور anaesthesia دینے والا شخص اس عمل میں ماہر ہو اور تجربہ کے دوران وہاں موجود رہے۔ جانور، جو ابھی anaesthesia کے زیر اثر تجربہ کے مرحلہ میں ہو، لیکن اس قدر زخمی ہو چکا ہو کہ اس کی بحالی دردناک اور تکلیف دہ ہو سکتی ہو تو مزید تجربہ کے بجائے اسے پُرسکون صورت میں ختم کر دیا جائے۔ ایسے حیوانی تجربے ممنوع ہیں جو محض دستی مہارت کے لیے کیے جاتے ہیں، تاہم اسکول، کالجز اور منظور شدہ ادارے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ محض تمثیل کے لیے یا عوامی نمائش کے لیے حیوانی تجربے نہیں کیے جا سکتے۔

جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے مامور شخص یا veterinarian کی ذمہ داری ہے کہ ان کا مناسب خیال رکھے اور daily observation کے لیے ایک شخص الگ سے مقرر ہو۔ ایسا میکانیہ اختیار کیا جائے کہ اگر جانوروں کو کوئی صحتی عارضہ پیش آجائے، ان کے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی محسوس ہو یا ان کی well-being سے متعلق کوئی مسئلہ ہو تو ان کی خدمت پر مامور veterinarian کو فوری اطلاع دی جا سکے۔

9 curari، urari اور اس طرح کے دوسرے paralysin حیوانی تجربہ کے لیے استعمال نہیں کیے جا سکتے، اگر کیے جائیں تو اس کے ہمراہ اس قدر anaesthesia دیا جائے جو consciousness ختم کر دے۔ جانور کی آنکھ پر طبقۂ ملتحمہ یا طبقۂ قرنیہ سے انجذاب کے تجربہ کے لیے کوئی کیمیاوی مادہ استعمال نہ کیا جائے۔ وہ کتے جو تجربہ کے لیے رکھے گئے ہوں، آزاد نہ چھوڑے جائیں۔

10 اگر حیوانی تجربہ کسی ادارہ میں انجام دیا جا رہا ہو تو اس کے سربراہ پر ذمہ داری عائد ہوگی، بصورتِ دیگر فردِ متعلق ذمہ دار ہوگا۔ تجربہ کے جانوروں کی کاشت کرنے والا شخص (breeder) انھیں کسی ایسے ادارہ کو نہ دے، جو منظور شدہ نہ ہوں۔ کوئی ادارہ صرف منظور شدہ بریڈر یا ادارہ سے ہی جانور خریدے یا حاصل کرے۔ کوئی ادارہ جانور لینے کے بعد اسے کسی ایسے ادارہ یا فرد کو فروخت کرنے یا دینے کا مجاز نہیں، جو منظور شدہ نہ ہو۔ پروڈکشن یا بریڈ امپرومنٹ پروگرام کے تجربہ کے جانور گھریلو استعمال کے لیے بھی دیے جا سکتے ہیں۔ ملک میں دستیاب جانور بریڈر یا اداروں کے ذریعہ درآمد نہیں کیے جا سکتے۔ بریڈر اور اداروں کے لیے ضروری ہے کہ حیوانی تجربوں کے لیے مقرر نگراں کمیٹی کی ہدایات پر عمل درآمد کریں۔

11 ادارہ جاتی animals ethics committee کو چاہیے کہ اپنے زیر تصرف اور تحویل کے جانوروں کے ریکارڈ کو مقررہ فارمیٹ میں محفوظ رکھے تا کہ بوقتِ ضرورت یہ اطلاعات مہیا کرا سکے۔ یہ لیبوریٹریز کی ذمہ داری ہے کہ کمیٹی کے ممبر سکریٹری یا اس کے ذریعہ مقرر کردہ آفیسر کو متعینہ فارمیٹ میں جانوروں کی تعداد اور ان کی انواع کی تفصیل فراہم کریں۔

12 کوئی ادارہ دوسرے ادارہ کے لیے معاہدہ کی بنیاد پر تحقیق و تجربہ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ collaborative research کے زمرہ میں نہیں آتا۔

13 ادارہ جاتی animals ethics committee ایک بائیلوجیکل سائنٹسٹ، دو ایسے مزید سائنٹسٹ جو مختلف بائیلوجیکل ڈسپلن سے تعلق رکھتے ہوں، ایک veterinarian جو جانوروں کی دیکھ ریکھ کرتا ہو، جانوروں کی سہولیات کے لیے مامور ادارہ کا سائنٹسٹ انچارج، ایک سائنٹسٹ جو ادارہ سے باہر کا ہو، ایک سماجی شعور رکھنے والا غیر سائنسی رکن، ایک ایسا شخص جسے کمیٹی نے نامزد کیا ہو، ان افراد کے علاوہ خاص پروجیکٹ جن میں مضر صحت ایجنٹ جیسے radio-active substances اور مہلک خورد بینی اجسام کا استعمال ہو، ان کے ریویو کے وقت اس فیلڈ کا اسپیشلسٹ بھی ہونا چاہیے۔

منسٹری آف سوشل جسٹس اینڈ امپاورمنٹ کے animal act 1960 کی طرح لیبوریٹری میں استعمال ہونے والے جانوروں کی بہتر سہولیات کے لیے CPCSEA گائڈ لائن وضع کی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جانوروں پر good laboratory practices کے اہتمام کے ذریعہ ان کی quality maintenance اور safety کو یقینی بنایا جائے اور ان کے ساتھ ہمدردانہ انسانی برتاؤ کیا جائے۔ CPCSEA گائڈ لائن کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے مامور شخص یا veterinarian کی ذمہ داری ہے کہ ان کا مناسب خیال رکھے اور daily observation کے لیے ایک شخص الگ سے مقرر ہو۔ ایسا میکانیہ اختیار کیا جائے کہ اگر جانوروں کو کوئی صحتی عارضہ پیش آجائے، ان کے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی محسوس ہو یا ان کی well-being سے متعلق کوئی مسئلہ ہو تو ان کی خدمت پر مامور veterinarian کو فوری اطلاع دی جا سکے۔

جانوروں کے حصول کے لیے CPCSEA گائڈ لائن کے مقررہ ضوابط کی پاسداری کی جائے۔ نئے آنے والے جانوروں کے معیار کے جائزہ کے لیے صحتی نگہداشت کے اصول اختیار کیے جائیں۔ جانوروں کے نقل و حمل میں متعینہ معیار کا خیال رکھا جائے اور مناسب طریقے سے ان کو quarantine اور stabilize کیا جائے۔ quarantine کا مطلب یہ ہے کہ نئے آنے والے جانوروں کو پہلے سے موجود جانوروں سے علاحدہ رکھا جائے تا آنکہ ان کی صحت اور ممکنہ حد تک ان کے microbial status کا پتہ چل جائے۔ چھوٹے جانوروں کی ایک ہفتہ اور بڑے جانوروں (کتے، بلی، بندر) کی چھ ہفتہ کے لیے quarantine کرتے ہیں، اس سے موجودہ جانوروں میں pathogens کی منتقلی کے امکانات کافی حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ quarantine کی مدت سے قطع نظر نئے آنے والے جانوروں کو استعمال سے پہلے ایک وقفہ دینا چاہیے تا کہ وہ physiologic، psychologic اور nutritional لحاظ سے stabilize ہو جائیں۔

الگ الگ نوع کے جانوروں کو علاحدہ رکھا جائے تاکہ انھیں ایک دوسرے کی بیماریاں نہ لگنے پائیں اور باہمی تنازعہ سے ان میں physiological & behavioral changes اور anxiety پیدا نہ ہو۔ علاحدگی کی شکل یہ ہو کہ انھیں ایسے الگ کمروں میں رکھا جائے، جن کے cubicles، laminar flow units اور cages کے لیے علاحدہ ventilation کا نظم ہو۔ استثنائی صورتوں میں الگ الگ نوع کے جانوروں کو ایک کمرے میں بھی رکھا جا سکتا ہے، مثلاً دو الگ نوع کے جانور کا pathogen status یکساں ہو یا ان کے مزاجی رویوں میں ہم آہنگی پائی جا رہی ہو۔

animal house پر متعینہ اسٹاف تمام جانوروں پر نظر رکھے کہ ان میں کوئی بیماری کی علامت یا ان کے رویوں میں کسی قسم کی غیر طبعی تبدیلی تو نہیں ہو رہی ہے؟ یہ عمل روز ہونا چاہیے، لیکن جانوروں کے بیمار ہونے اور postoperative recovery کی صورت میں اور زیادہ نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بوقتِ ضرورت بیمار جانور کی دیکھ بھال اور بیماری کی تشخیص کے لیے مناسب طریقے اختیار کیے جائیں۔ غیر متوقع موت واقع ہونے، جانوروں میں بیماری کی علامات ظاہر ہونے یا کوئی غیر طبعی کیفیت محسوس ہونے پر فوراً اس کی رپورٹ کی جائے تاکہ بروقت طبی امداد پہنچائی جا سکے۔ اگر جانور میں کسی متعدی بیماری کی علامتیں دکھائی دیں تو اسے دوسرے صحت مند جانوروں سے الگ کر دیا جائے۔ اگر ایک کمرہ کے سارے جانور کسی تعدیہ کا شکار ہو جائیں تو انھیں الگ رکھ کر طبی سہولت فراہم کی جائے۔

animal care programs کے لیے ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس سلسلے میں تکنیکی اور پیشہ ورانہ مہارت رکھتے ہوں۔ جانوروں کی نگہداشت پر مامور اشخاص کو چاہیے کہ وہ اپنی صفائی ستھرائی کا ہر لحاظ سے مکمل خیال رکھیں اور اس کے لیے انھیں مطلوب ضروری اشیا فراہم کی جائیں۔ یہ ڈیوٹی کے وقت masks, gloves, head cover, coats, shoes cover کا استعمال کریں۔ دھیان رکھیں کہ جانوروں کے رہائشی کمرہ میں بروئے کار لائی گئی چیزیں باہر استعمال میں نہ لائیں۔ ان کے لیے washing اور showering سے متعلق سہولیات کا نظم کیا جائے۔ جانوروں کے کمرہ میں خورد و نوش، سگریٹ نوشی اور امور زینت کا استعمال نہ کیا جائے۔

تحقیقی اداروں کو چاہیے کہ مضر اور خطرناک اشیا (hazardous agents) کے تجربوں کی نگرانی کے لیے موثر نظام اختیار کریں۔ biosafety committee ایسے تحقیقی منصوبوں کو امعانِ نظر سے دیکھے۔ ان تحقیقی مطالعوں میں جانوروں کے استعمال کے سلسلے میں خاص احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا ادارہ کی biosafety committee اور animal ethics committee دونوں بروئے کار لائے جانے والے procedures اور دستیاب سہولیات کا review کریں۔

تجربہ و تحقیق کے دوران ایک ہی جانور پر متعدد surgical procedures کے استعمال سے احتراز کیا جائے، الّا آنکہ پروٹوکال میں اس کی وضاحت ہو اور ادارہ کی animal ethics committee نے اس کی منظوری دے رکھی ہو۔ ساتھ ہی ایک جانور کا استعمال معقول جواز کے بغیر تین سال سے زیادہ نہ کیا جائے۔

لیب میں استعمال ہونے والے جانوروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے وقت mode of transport, container اور cage میں ان کی تعداد جیسے معاملات کو خاص طور پر دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال بھی ضروری ہے کہ اس دوران ان کے کھانے پینے کا معقول بندوبست ہو، انھیں کوئی تعدیہ، چوٹ اور stress لاحق نہ ہو۔ mode of transport کے انتخاب کے وقت راستے کی مسافت، موسمی اور ماحولیاتی حالات کو پیش نظر رکھا جائے اور کوشش کی جائے کہ انھیں کسی قسم کا کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ container اتنا بڑا ہو کہ جانور اس میں آرام سے رہ سکیں، انھیں کوئی گزند لاحق نہ ہو اور cage میں متعینہ تعداد سے زیادہ جانور نہ رکھے جائیں۔ ایک cage میں mouse, rat اور hamster پچیس، guinea pig بارہ، rabbit دو، کتے اور بلی ایک سے دو اور بندر ایک سے زیادہ نہ رکھے جائیں۔ mouse اور hamster کی cage height بارہ سنٹی میٹر، rat کی چودہ سنٹی میٹر، guinea pig کی اٹھارہ سنٹی میٹر، rabbit کی چھتیس سنٹی میٹر، بندر کی بہتر سنٹی میٹر اور لنگور کی نوّے سنٹی میٹر سے کم نہ ہو۔ اسی طرح ایک mouse کے لیے 65-100 sq.cm، rat کے لیے 100-150sq.cm، hamster کے لیے 90-120sq.cm، guinea pig کے لیے 300-600sq.cm، rabbit کے لیے 3700-4600sq.cm، بلی کے لیے 2500-3500sq.cm، کتے کے لیے 7000-12000sq,cm، بندر کے لیے 4000-6000sq.cm اور لنگور کے لیے 6000-9000sq.cm فلور ایریا کی ضرورت ہوتی ہے۔

painful procedure والے حیوانی تجربوں کو مناسب anaesthesia کے زیر اثر کیا جائے اور یقینی بنایا جائے کہ اس پورے عمل کے دوران یہ اثرات قائم رہیں اور جانور ہوش میں نہ آنے پائے تاکہ اسے تکلیف کا احساس نہ ہو۔ اگر تجربہ کے کسی مرحلہ میں investigator کو لگے کہ اسے یہ عمل روک دینا چاہیے یا یہ کہ جانور کو ناقابلِ علاج زخم ہو گیا ہو تو euthanasia کے مناسب طریقے سے اسے sacrifice کر دے اور اس کے disposal سے پہلے تیقن حاصل کر لے کہ اس کی clinical death ہو چکی ہے۔ euthanized کیے گئے large animal کے data کو محفوظ رکھے۔

euthanasia کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب experiment پورا ہو جانے کے بعد یا کسی ethical reason سے جانور کو sacrifice کرتے ہیں۔ یہ procedure بہ سرعت تمام اس طرح انجام دیا جائے کہ جانور کو تکلیف نہ ہو، اسے خوف و ہراس سے آزاد ماحول میں اور animal room سے الگ کسی اور جگہ کیا جائے۔ euthanasia کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو مرکزی نظامِ اعصاب (cns) کو افسردہ اور سست کر کے درد کے احساس کو ختم کر دے۔ euthanasia کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ یہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ کس نوع کا جانور ہے؟ اور study کا nature کیا ہے؟۔ دھیان رہے کہ اسے کرتے وقت جانور کو کم سے کم ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچے۔ اس مقصد کے لیے بندر، کتے اور بلی جیسے جانور کو ایوتھینز یا سے پہلے tranquilizer دے دیتے ہیں۔

بسا اوقات جینیاتی مطالعہ کی غرض سے تجربہ کے جانور میں کسی دوسرے جانور کا gene داخل کر دیتے ہیں (transgenic animals) یا اس کے کچھ مخصوص gene کو مختل کر دیتے ہیں (knockout animals)، ان کی دیکھ بھال کے لیے زیادہ اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے کہ جینیاتی تبدیلی اور اختلال کے نتیجہ میں ان کے اندر بیماری کی استعداد بڑھ جاتی ہے، جب کہ ان کی نگہداشت سے متعلق امور جیسے

routine اور l ighting,sanitation ventilation, feeding, housing, management کا معاملہ دوسرے جانوروں جیسا ہی ہے۔

laboratory animals کے euthanasia کے لیے مختلف طریقے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر انھیں تین زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

physical method

inhalation of gases

drug administration

physical method میں exsanguination, lectrocution, cervical dislocation decapitation، اسی طرح euthanasia کے لیے کاربن مونو آکسائڈ، کاربن ڈائی آکسائڈ، کلوروفارم، ہیلوتھین جیسی گیسوں کے inhalation کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ دوائیں دے کر euthanise کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ barbiturate, chloral hydrate, ketamine اور sodium pentothol کو زیادہ مقدار (overdose) میں دے دیا جاتا ہے۔

چھوٹے جانوروں پر تجربہ سے متعلق تمام اعمال ایسی جگہ انجام دیے جائیں جو عام جانوروں کی رہائش سے ہٹ کر ہو، جب کہ بڑے جانوروں کے experiment کے functional areas ایسا ہو جس میں ضرورت کے تمام اسباب مہیا ہوں۔ وہاں prepration، operation، intensive care اور supportive treatmen کی معقول گنجائش ہو۔

laboratory animals کے لیے سازگار رہائشی ماحول ضروری ہے۔ اس سلسلے میں درجۂ حرارت اور فضائی نمی کی تنظیم کے لیے air conditioning سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اس سے موسمی تبدیلیوں اور تغیرات کے تدارک میں مدد ملتی ہے۔ mouse، rat، hamster، g.pig، rabbit کے رہائشی کمرہ کا درجۂ حرارت بائس سے چوبیس ڈگری سیلسیس، جب کہ کتے، بلی، بندر اور لنگور کے لیے air dried ماحول سازگار خیال کیا جاتا ہے۔

laboratory animals کی رہائشی جگہوں پر ventilation کا معقول انتظام ہو، اس کی ڈیزائننگ اس طرح کی جائے کہ human occupancy کے لیے جانوروں سے علاحدہ ventilation کا نظم ہو۔ جانوروں کے رہائشی کمرہ میں بہتر ماحول کے قیام کے لیے ventilation، heating اور air conditioning کے متبادل ذرائع کا بندوبست رہے تاکہ بلا انقطاع یہ سہولیات مہیا رہیں۔ جانوروں کی رہائش گاہ میں بجلی اور روشنی کی مناسب سہولت بہم پہنچائی جائے اور ایسا بندوبست ہو کہ animal room میں کام کرنے والے بآسانی اپنا کام کر سکیں اور روشنی کی شدت جانوروں پر گراں بھی نہ ہو۔ fluorescent light اس مقصد کے لیے مناسب ہوتی ہے۔ time controlled lighting system کا استعمال کر کے ضرورت کے لحاظ سے روشنی کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ ایسا نظم ہو کہ power failure کی ہنگامی صورت میں بھی بجلی اور روشنی کی فراہمی میں خلل واقع نہ ہو۔

جانوروں کی سہولت کے نقطہ سے شور و شغف سے آزاد ماحول کی کافی اہمیت ہے۔ اس ضمن میں کنکریٹ سے بنی دیواریں بڑا موثر کردار رکھتی ہیں، اس لیے کہ ان کی density، sound transmission کو کم کر دیتی ہے۔

طبی سائنس کی دستیاب سہولتوں کو مزید موثر اور محفوظ بناکر اسے بہتر اور اعلیٰ کارکردگی سے متصف کرنے اور نت نئے صحتی مسائل کے تناظر میں اس کے افادی دائرے کو وسیع کر کے عصری مسائل سے نمٹنے کا اہل بنانے کا عمل ہمیشہ تحقیق سے مشروط رہے گا۔ اس کی ایک اہم کڑی حیوانی تجربہ ہے۔ ڈرگ ڈیولپمنٹ اور بائیو میڈیکل ریسرچ جیسے مختلف تحقیقی مطالعوں میں حیوانی تجربوں کی کلیدی اہمیت ہے۔ اب تک ایسے in-vitro altrenate method سامنے نہیں آسکے ہیں جو حیوانی تجربوں سے دستبردار کر کے ان کا متبادل بن سکیں، لیکن بہتر یہی ہوگا کہ اس کے امکانات پر غور کیا جائے۔

تحقیق کے جانوروں کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے جس میں انھیں جسمانی آسائش کے ساتھ سماجی ماحول کا احساس بھی ہو۔ well being کے تقاضے کے ساتھ اس سے تحقیق کی ضرورتیں بھی جڑی ہوئی ہیں، اس لیے کہ اس سے experimental variable کم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کا caging اور housing system ایسا ہو کہ اس میں جانور کو آزادانہ نقل و حرکت میں دقت نہ ہو، ماحول آرام دہ ہو، کھانے پینے اور دیگر حوائج کے لیے ضروری سہولیات موجود ہوں۔

سطور بالا میں جانوروں کی رہائشی اور ماحولیاتی آسائش، نگہداشت، رکھ رکھاؤ، خورد و نوش اور تحقیقی تجربوں میں ان کے استعمال کے سلسلے میں حزم و احتیاط کی بابت جو قانونی اور اخلاقی ہدایات مذکور ہیں، یہ اعلیٰ انسانی اقدار پر مبنی ہیں، یہ زیر تحقیق جانوروں کے ساتھ بہتر سلوک اور ہمدردانہ رویے کو لازمی بناتی ہیں اور تجربہ سے لاحق ہونے والی اذیت کو کم سے کم کرتی ہیں۔

طبی سائنس کی دستیاب سہولتوں کو مزید موثر اور محفوظ بنا کر اسے بہتر اور اعلیٰ کارکردگی سے متصف کرنے اور نت نئے صحتی مسائل کے تناظر میں اس کے افادی دائرے کو وسیع کر کے عصری مسائل سے نمٹنے کا اہل بنانے کا عمل ہمیشہ تحقیق سے مشروط رہے گا۔ اس کی ایک اہم کڑی حیوانی تجربہ ہے۔ ڈرگ ڈیولپمنٹ اور بائیو میڈیکل ریسرچ جیسے مختلف تحقیقی مطالعوں میں حیوانی تجربوں کی کلیدی اہمیت ہے۔ اب تک ایسے in-vitro altrenate method سامنے نہیں آسکے ہیں جو حیوانی تجربوں سے دستبردار کر کے ان کا متبادل بن سکیں، لیکن بہتر یہی ہوگا کہ اس کے امکانات پر غور کیا جائے۔ تاہم جب تک یہ ممکن نہیں ہو پا رہا ہے انسانی مفاد کے لیے طبی سائنس کے تحقیقی تجربوں میں حیوانی استعمال کی ناگزیریت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ مگر طب کی پیشہ ورانہ شرافت اور عمدہ اخلاقی احترام کی روایت حیوانات کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کا درس دیتی ہے اور تجربہ کے جانوروں کے سلسلے میں اصولی ضابطوں اور اخلاقی قدروں کا پابند بناتی ہے، لہٰذا ان کی پاسداری کا بہر صورت التزام ہونا چاہیے۔

■

ماخذ: طبی اخلاقیات، **مصنف:** حکیم فخر عالم، **پہلی اشاعت:** 2023، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے۔ یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ قدیم رسائل ومجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ رسالے میں اردو زبان و ادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

ادبیات شناسی

مصنف: محمد حسن

صفحات: 192، قیمت: 120 روپے، دوسرا ایڈیشن: 2026

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ابوہریرہ، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب معروف نقاد اور دانشور محمد حسن کی مشہور ومقبول تصنیف ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر بی اے اور ایم اے میں اردو تدریس کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو بیسوی صدی میں ادب کی تعلیم کے دو بنیادی مقاصد 'ادب کی پرکھ کا شعور اور ادب کے ذریعے سے اظہار و ترسیل کی تعلیم' کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب محض ادبی اصناف کی فنی توضیح تک محدود نہیں رہتی بلکہ ادب کے مطالعے، اس کی تفہیم، تدریس اور قاری کے ذہنی و جمالیاتی ارتقا سے متعلق کئی بنیادی سوالات کو بھی اپنے دائرۂ بحث میں شامل کرتی ہے۔

مصنف نے اس کتاب کو کل دس ابواب میں تقسیم کیا ہے جن کے عنوانات بالترتیب باب اول تا باب دہم کچھ اس طرح ہیں- نصاب، تدریس اردو: مقاصد اور طریق کار، جمالیات کا پہلا سبق، نظم کی تدریس، غزل کی تدریس، افسانوی ادب کی تدریس، ڈرامے کی تدریس، نثر کی تدریس، تنقید کی تدریس اور تاریخ ادب کی تدریس۔

محمد حسن نے اس کتاب میں تدریس کے نئے طریقوں اور تجربوں سے آگاہ کرتے ہوئے پرانے طرز تدریس پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ نئے راستے بھی بیان کیے ہیں۔ چونکہ محمد حسن کی نگاہ تعلیم کے اصول وضوابط اور ان اصولوں کے نفسیاتی پہلوؤں پر ہے، اس لیے انھیں مروجہ نصاب کی خامیوں کا بخوبی اندازہ ہے، کتاب کے پہلے باب 'نصاب' میں وہ اردو ادب کی تعلیم میں اصناف وار تقسیم اور اس کی قدیم سے جدید تاریخی ترتیب کو رد کرتے ہوئے جدید سے قدیم تاریخی ترتیب کی وکالت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ابھی تک اردو ادب کی تعلیم میں اصناف وار تقسیم کو ضرورت سے کہیں زیادہ اہمیت دی جاتی رہی ہے اور پھر اس تقسیم کی تاریخی ترتیب پر بھی اصرار کیا گیا ہے یعنی نثر کا سلسلہ معراج العاشقین (جس کی تاریخی قدامت اب باطل ثابت ہو چکی ہے) سے لے کر رشید احمد صدیقی تک یعنی قدیم سے جدید تک آتا ہے جو تعلیمی نقطۂ نظر سے غلط ہے اور تعلیم ہمیشہ مانوس سے غیر مانوس کی طرف اور آسان سے مشکل کی طرف سفر کرتی ہے اور نصاب میں یہی اصول ترتیب مدنظر رہنا چاہیے، متعارف اور عصری ادب سے قدیم تر ادب کی طرف بڑھنا تعلیمی نقطۂ نظر سے سودمند بھی ہوگا اور دلچسپ بھی، اس لحاظ سے تاریخی ترتیب سے قطع نظر کر کے ہمیں نثر و نظم کو تعلیمی ضرورت کے مطابق نئی ترتیب سے داخل نصاب کرنا ہوگا۔''

زبان وادب کی تدریس پر آج کے زمانے میں عموماً یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ زمانہ سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کرنے اور اس کی نت نئی ایجادات سے واقفیت رکھنے کا ہے، ایسے میں زبان و ادب کی تعلیم غیر ضروری اور دور از کار شے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض زبان وادب کے شعبوں میں داخلہ لینے والے ہر طالب علم کے لیے نفسیاتی طور پر بہت منفی اثر ڈالتا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا باب 'مقاصد اور طریق کار' ہے جس میں محمد حسن اعتراض اور سوال کا جواب یوں دیتے ہیں:

''تجارت اور ٹیکنالوجی کی ضرورتوں کی بنا پر ہر شخص کو اپنی مادری زبان کے علاوہ متعدد دوسری زبانیں سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور کم سے کم مدت میں وہ ان زبانوں کو سیکھنا چاہتا ہے یہی صورت ادبی ذوق وشعور کی بھی ہے جس کے بغیر انسان زندگی کا صحیح شعور اور لطف حاصل نہیں کر سکتا اور خود کو مہذب اور متمدن نہیں کہہ سکتا۔''

کلاسیکی شاعری کی تفہیم اردو ادب کی تفہیم کا بنیادی عنصر ہے۔ یہ مرحلہ بہت نازک اور دشوار گزار ہوتا ہے۔ خاص طور سے بی اے سال اول کے طلبہ کے لیے، جب ان کو اصناف کا تعارف پڑھایا جاتا ہے تو ان کا ذہن صنف، شاعر، مواد اور زبان کے حوالے سے کئی پیچیدگیوں کا شکار ہوتا ہے۔ قصیدہ جیسی صنف کے ان مسائل بطور خاص قصیدہ نگار کے گریز سے مدح کی طرف منتقل ہوتے وقت طلبہ کو پیش آنے والی الجھن سے نجات کے لیے اس میں کارآمد باتیں بتائی گئی ہیں۔

محمد حسن کا خیال ہے کہ یہ کتاب اردو کی تدریس پر حرفِ آخر نہیں بلکہ ایک رائے، ایک راستہ اور ایک خاکہ ہے جس سے اختلاف کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ وہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ادب کی مختلف اصناف ہیں اور جمالیاتی کیفیت مشترک ہونے کے باوجود سب کے آئین اور آداب، رنگ اور ڈھنگ مختلف ہیں، اس لیے اس کتاب میں ہر ادبی صنف کو اپنے طور پر سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوشش سکہ بند اور بندھے ٹکے انداز میں نہیں کی جا سکتی۔ ادب کی اپنی جمہوریت ہے اور اس جمہوریت کے اندر رہ کر ہر استاد کو اپنے طور پر نہ صرف ادب کی تفہیم کے نئے تجربے کرنے کا حق حاصل ہے بلکہ ادب کی تعلیم میں بھی نئی راہیں نکالنے کا بھی حق ہے۔''

مجموعی طور پر 'ادبیات شناسی' اردو ادب کی تدریس اور تنقید سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت اہم کتاب ہے۔ محمد حسن نے اپنی اس تصنیف میں ادب، قاری اور معلم کے باہمی رشتے کو جس گہرائی اور توازن کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ آج بھی ہمارے تعلیمی اور ادبی ماحول میں پوری معنویت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

قیامِ امن: ایک جستجو

مرتب: ڈاکٹر زینت شوکت علی

صفحات: 586، قیمت: 115 روپے، پہلی اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ 25

مبصر: شاہ عمران حسن: اے 22، شاہ ہاؤس، مکی مسجد کالونی

مدن پور کھادر ایکسٹینشن، پارٹ: 3 نالہ روڈ، سریتا وہار، نئی دہلی۔ 110076

'قیامِ امن: ایک جستجو' کو ڈاکٹر زینت شوکت علی نے مرتب کیا ہے، جب کہ نسیم احمد نے سلیس، شستہ اور رواں زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے امن، رواداری، بقائے باہمی اور انسانی اخوت کے مباحث میں ایک قابلِ قدر اور وقیع اضافہ ہے۔ اس تصنیف کی اشاعت ایسے دور میں ہوئی ہے جب دنیا کو امن کے سنجیدہ اور عملی مباحث کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

یہ کتاب نہ صرف ماضی کی علمی روایت سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے بلکہ عصرِ حاضر کے عالمی تناظر میں امن کے نئے سوالات، پیچیدہ مسائل اور ابھرتے ہوئے چیلنجز کو بھی نہایت سنجیدگی سے زیرِ بحث لاتی ہے، جس سے اس کی معنویت اور افادیت دو چند ہو جاتی ہے۔

اس مجموعے میں 28 ممتاز مصنفین کی تحریریں شامل کی گئی ہیں، جنھوں نے امن کے مختلف فکری، سماجی، مذہبی اور سیاسی پہلوؤں پر اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان اہلِ قلم میں سابق وزیرِ خارجہ سلمان خورشید، تشارائے گاندھی، اصغر علی انجینئر، کملہ بھسین، امت پانڈیا، محمد وجیہ الدین، ڈاکٹر ایس بالا کرشن، مولانا سید اطہر علی، محمد عارف عمری، مولانا مستقیم احسن اعظمی اور دیگر اہلِ علم شامل ہیں۔ ان کی تحریریں نہ صرف فکری تنوع کی آئینہ دار ہیں بلکہ اسلوبیاتی رنگارنگی اور موضوعاتی وسعت کا حسین امتزاج بھی پیش کرتی ہیں، جو قاری کو ایک ہمہ جہت فکری سفر پر لے جاتا ہے۔

کتاب اصلاً 495 صفحات پر محیط ہے، جب کہ مزید 86 صفحات میں مقالہ نگاروں کے سوانحی کوائف نہایت ترتیب، سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ یہ حصہ محض تعارفی نوعیت کا نہیں بلکہ قاری کو مصنفین کے علمی، فکری اور سماجی پس منظر سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں قاری ان کے مضامین کو زیادہ گہرائی اور سیاق و سباق کے ساتھ سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ساخت کے اعتبار سے کتاب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں عالمی امن، بین الاقوامی تعلقات، تہذیبی تصادم اور انسانی بقا کے تناظر میں امن کی اہمیت پر مفصل اور مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ اس حصے میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کے تصورِ امن اور فلسفہ عدم تشدد کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عدم تشدد محض ایک نظریہ نہیں بلکہ ایک عملی طرزِ حیات ہے۔ اسی کے ساتھ اسلام میں امن کے تصور کو بھی نہایت جامع، متوازن اور مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے، جو مذہبی تعلیمات کی روشنی میں انسانی بھائی چارے، عدل و انصاف اور رواداری کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ڈاکٹر اصغر علی انجینئر کا مضمون 'اسلام میں امن' صفحہ نمبر 101 سے 111 تک پھیلا ہوا ہے جس میں وہ امن اور اسلام کے موضوع پر مفصل گفتگو کرتے ہیں۔

کتاب کے مضامین میں بعض تحریریں اپنی معنوی گہرائی، فکری تازگی اور موضوع کی ندرت کے باعث خاص طور پر توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ مثلاً کملہ بھسین کا مضمون 'خواتین اور امن' نہایت اہمیت کا حامل ہے، جس میں محترمہ کملہ نے خواتین کے کردار کو قیامِ امن کے تناظر میں اجاگر کیا ہے۔ اس مضمون میں یہ حقیقت نہایت خوبصورتی سے بیان کی گئی ہے کہ خواتین نہ صرف خاندانی اور معاشرتی استحکام کی بنیاد ہیں بلکہ وہ امن کے فروغ، مکالمے کے قیام اور تنازعات کے حل میں بھی ایک کلیدی اور مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

اسی طرح مولانا مستقیم احسن اعظمی کا مضمون 'اسلام خودکش بمباری کی سخت مذمت کرتا ہے' نہایت فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے، جس میں وہ واضح اور دوٹوک انداز میں بیان کرتے ہیں کہ 'اسلام دوسرے لوگوں پر کسی بھی قسم کے تسلط، استبداد یا غلبے کی اجازت نہیں دیتا ہے، دوسرے پر کسی بھی قسم کے تشدد کا استعمال ایک جرم ہے (ص 391)۔ یہ موقف نہ صرف مذہبی تعلیمات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے بلکہ موجودہ دور میں پائے جانے والے غلط تصورات کی بھی مؤثر تردید کرتا ہے۔

اسی طرح مولانا محمد شعیب کوٹی کا مضمون 'اسلام میں دہشت گردی قابلِ مذمت' بھی اس موضوع پر ایک اہم، سنجیدہ اور مدلل تحریر ہے۔

عصرِ حاضر کے تناظر میں یہ حقیقت بھی نہایت اہم ہے کہ اگرچہ دنیا تکنیکی اور سائنسی اعتبار سے بے حد ترقی یافتہ ہو چکی ہے، لیکن انسانی رویّوں، سیاسی مفادات اور عالمی طاقتوں کی پالیسیوں کا جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ترقی کے ساتھ ساتھ تباہی کے اسباب بھی بڑھتے گئے ہیں۔ جدید اسلحہ، ایٹمی قوت اور مہلک ہتھیاروں کی موجودگی نے انسانیت کو مستقل خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک بظاہر امن کی بات کرتے ہیں اور تشدد کی مذمت کرتے ہیں، مگر بعض حساس عالمی مسائل، خصوصاً فلسطین کے معاملے میں ان کی خاموشی ایک بڑا سوالیہ نشان بن کر سامنے آتی ہے، جو عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔

مجموعی طور پر کتاب 'قیامِ امن: ایک جستجو' ایک ایسی جامع، فکر انگیز اور بصیرت افروز علمی و ادبی کاوش ہے جو نہ صرف امن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے بلکہ قاری کو موجودہ عالمی حالات، جنگ کے منڈلاتے خطرات اور انسانی بقا کے تقاضوں پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے پر آمادہ بھی کرتی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع، اسلوب، مواد اور فکری وسعت کے اعتبار سے مطالعہ امن کے موضوع پر بلاشبہ ایک نمایاں اضافہ ہے اور اہلِ علم، طلبہ، محققین اور عام قارئین کے لیے یکساں طور پر ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہوسکتی ہے۔

امراض اطفال

صفحات: 566، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2026
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: وسیم اقبال
E-29، شاہین باغ، لین نمبر 6، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اپنے قیام کے آغاز سے ہی علم طب کے فروغ کے لیے کوشاں ہے اور یہاں باضابطہ علم طب کا پینل موجود ہے جن میں ماہرین علم طب کے مشوروں سے مختلف موضوعات پر صحت سے متعلق جدید و قدیم تحقیق کو جانچ پرکھ کر اعلیٰ اور معیاری کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔

پیش نظر کتاب 'امراض اطفال' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی مراحل سے تکمیل تک جن ماہرین علم طب نے اپنی خدمات پیش کی ہیں ان میں ڈاکٹر محمد خالد صدیقی، ڈاکٹر آسیہ سلطانہ، ڈاکٹر شگفتہ نکہت، ڈاکٹر سہیل فاطمہ، ڈاکٹر عظمیٰ بانو، ڈاکٹر جاوید احمد خان، ڈاکٹر ناصر علی خان، ڈاکٹر حمیدہ عقیل، ڈاکٹر افشاں خاں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

گذشتہ چند دہائیوں میں صحت کے تئیں بیداری نے زور پکڑا ہے اور صحت کو انسان کا بنیادی حق قرار دیا جانے لگا ہے، عالمی سطح پر اس کو سماجی ہدف کے طور پر لیا جارہا ہے تاکہ عوام کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جائے اور ان کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکے۔

'امراضِ اطفال' میں بچوں کی بیماریوں سے متعلق بنیادی اور اہم معلومات فراہم کی گئی ہے۔ بچے کی طبعی نشو ونما اور بالیدگی کے لیے صاف ستھرا اور خوشگوار ماحول خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ بچے کی صحت پر بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اسی طرح بچے کی طبعی پرورش میں سماجی اور معاشی حالت کا بھی بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ خط افلاس یا اس سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کے بچوں میں اکثر و بیشتر نقص تغذیہ کی شکایت پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کے مطابق بچے کا اصلی مزاج گرم ہوتا ہے، اس لیے اس کی تندرستی کا تحفظ اور اس کی بقا ہلکی لطیف گرم اور تر چیزوں ہی سے ممکن ہے، گرم خشک چیزیں اس کو راس نہیں آسکتیں، کیونکہ بچہ اپنی تکلیف خود تو بتا نہیں سکتا اس لیے والدین کو اس کی مختلف کیفیات مثلاً پیشاب یا پاخانہ کا رنگ بدل جانا، پیٹ کا پھول جانا، تالو کا بیٹھ جانا وغیرہ علامات دیکھ کر خود ہی بچے کی صحت کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔

اٹھارہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں باب اوّل 'امتحان اطفال' کے تحت نشو و نما اور بالیدگی، نمو کے درجات، طبعی نشو ونما معلوم کرنے کا طریقہ اور بالیدگی کی جانچ وغیرہ سے متعلق ہے۔ باب دوم 'معالجات اطفال کے متعلق ہدایات' پر مبنی ہے۔ باب سوم 'امراض دماغ و اعصاب' ماء الراس، سرسام، ام الصبیان، تشنج اطفال، کزاز اطفال، فالج اطفال، استرخا اور عطاش سے متعلق بنیادی اور اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ باب چہارم 'باب امراض عین' میں سلاق، شعیرہ، بردہ، آشوب چشم، ودقہ، سبل، جرب الاجفان اور حول وغیرہ کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ باب پنجم 'امراض اذن، انف وحلق' میں التہاب اذن، خارجی، التہاب اذن وسطی، سیلان الاذن، انشقاق طبلی، قذی الاذن، وجع الاذن، نزلہ وزکام، رعاف، قذی الانف، خناق و بائی، التہاب حنجرہ اور ورم لوزتین سے متعلق اہم معلومات پر مبنی ہے۔ باب ششم 'امراض دہن' میں ورم لسان، عظم لسان، قلاع اور قروح دہن سے متعلق ہے۔ باب ہفتم 'امراض تنفس' میں سرفہ اطفال، شہیقہ، ضیق النفس، ذات الریہ، ذات الجنب اور تدرن ریوی سے متعلق اہم معلومات پیش کی گئی ہے۔ باب ہشتم 'امراض قلب' میں حدادی امراض قلب اور خلقی امراض قلب پر مبنی ہے۔ باب نہم 'امراض کبد' میں ورم کبد، تلیف کبد اور یرقان نوزائیدہ سے متعلق اہم معلومات پیش کرتا ہے۔ باب دہم 'امراض معدہ وامعا' سے متعلق ہے جس میں فواق، قے، تشنج بطن، حموضت معدی، قبض، دیدان امعا، تدرن معوی، اسہال اطفال، قلت ماء اور تلافی ماء پر اہم معلومات سے متعلق ہے۔ باب یازدہم 'امراض مقعد' میں ورم مقعد، خروج مقعد، حکہ مقعد اور قروح مقعد سے متعلق مفید معلومات موجود ہے۔ باب دوازدہم 'امراض بول وتناسلیہ' میں ورم کلیہ، تعدیہ مجرای بول، متلازمہ کلیہ، التہاب احلیل، ضیق غلفہ، ورم حشفہ، ورم خصیہ، قیلہ مائیہ، حکہ فرج اور فتق وغیرہ پر اہم معلومات پیش کی گئی ہے۔ باب سیزدہم میں 'امراضِ متعدیہ' میں جدری، خسرہ، حمیقا، حمی قرمزیہ، حمی دنج چکن گنیا، سرخبادہ، جرب، حکہ، ورم اصلی الاذن، علت قلت مناعت مکسوبہ اور آتشک خلقی وغیرہ پر اہم معلومات موجود ہے۔ باب چہاردہم 'امراضِ نقص تغذیہ' میں حیاتین کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماریاں 'سوالقنیہ، قوت لحمیہ کا نقص تغذیہ، کساح، فرہبی، تھیلیسیمیا اور مزاج نزفی سے متعلق اہم معلومات موجود ہے۔ باب پانزدہم 'نقائص نمو' میں فروجہ لبی اور فرجہ حنکی، مبرزی و سقیمی نقائص اور نقص انبوبہ عصبی پر اہم جانکاری موجود ہے۔ باب شانزدہم میں رضاعت اور فطام پر قیمتی معلومات پیش کی گئی ہے۔ باب ہفدہم 'تدابیر اطفال و نومولود' میں دلک، حجامہ، قے، حقنہ، نطول، آبزن، پاشویہ، تکمید، انکباب، شمومہ اور ضماد وغیرہ جیسے امراض کی تشخیص اور ان کا علاج پیش کرتا ہے۔ باب ہجدہم 'خلقی اور جینیاتی نقائص' میں ڈاؤن کا علامیہ، ڈچنی مسکولر ڈسٹروفی اور خلیوں میں خون کی کمی وغیرہ جیسی بیماریوں کے حوالے سے اہم باب ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب امراض اطفال کے حوالے سے اہم ہے، جس میں بیماریوں کی تشخیص کے ساتھ علاج کے حل پر بھی زور ہے، یہی وجہ ہے کہ قومی اردو کونسل کے ذریعے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے جس کے لیے کونسل مبارکباد کی مستحق ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب علم طب کے شعبے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی نیز تصنیف و تالیف سے دلچسپی رکھنے والے اطبا و طلبا کے لیے نئی راہیں بھی پیدا کرے گی۔

تحقیق و تنقید

قرآنی استعاروں کی فنی عظمت

مصنف: پروفیسر مظفر علی شہ میری
صفحات: 592، قیمت: 750 روپے، سنہ اشاعت: 2026
ناشر: الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد تلنگانہ
مبصر: محمد امین اللہ
شعبہ اردو سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی، آندھرا پردیش

پروفیسر مظفر علی شہ میری، سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبد الحق اردو یونیورسٹی، کرنول (آندھرا پردیش) اردو زبان وادب کی ایک معتبر شخصیت کا نام ہے۔ وہ شاعر، ادیب، ناقد، محقق اور مترجم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ایک اُستاد کی حیثیت سے بھی ان کی مقبولیت مسلم ہے۔ اب تک ان کی 14 تصانیف منظر عام پر آکر اہل علم وادب سے داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔

'قرآنی استعاروں کی فنی عظمت' ان کی تازہ اور اہم تصنیف ہے جو تقریباً پچیس برس کی مسلسل تحقیقی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ انھوں نے نہایت خلوص، صبر، انہماک اور عرق ریزی کے ساتھ اس تصنیفی عمل کو انجام دیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ خود اس بات کی روشن دلیل ہے۔ یہ تصنیف قرآنی استعاروں میں مضمر ادبی حسن، معنوی لطافت اور فکری عمق کی بازیافت ہے۔

قرآن کریم 'کتاب اللہ' ہے۔ جس کا اسلوب بیان، فصاحت اور بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ استعارہ قرآنی اُسلوب بیان کا ایک اہم عنصر ہے۔ سیکڑوں برسوں سے مفسرین اور علمائے علم وادب نے قرآنی استعاروں کی فنی عظمت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ پروفیسر مظفر علی شہ میری کی پی ایچ ڈی کا موضوع 'اردو غزل کا استعاراتی نظام' رہا ہے، اس لیے ان کو اس موضوع سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس طرح انھوں نے قرآنی استعاروں کو سمجھنے کی بہترین کوشش کی ہے اور اُس کا حق ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔

پروفیسر مظفر علی شہ میری نے قرآنی استعاروں کو 13 قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں قابل ستائش پہلو یہ ہے کہ مصنف نے ہر قسم کے استعارہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ قرآن میں کہاں اور کتنی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ پروفیسر موصوف کے نزدیک قرآنی استعاروں کا مطالعہ محض ایک علمی مشق نہیں بلکہ قرآن کی عظمت کو سمجھنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ یہ مطالعہ نہ صرف قاری کے فہم کو وسعت عطا کرتا ہے بلکہ متن کے ساتھ گہرا اور بامعنی تعلق قائم کرنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری کے بقول قرآنی استعارے گہری معنویت سے لبریز موثر انداز بیان کی عمدہ مثال ہیں۔ یہ استعارے قاری کے دل ودماغ کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں اور اس کے سامنے فکر وتدبر کے نئے گوشے وا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں 156 مختلف استعاروں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جو اب تک تحقیق کیے گئے قرآنی استعاروں کی سب سے بڑی تعداد قرار دی جاسکتی ہے۔ ان استعاروں کی عظمت یہ ہے کہ دنیوی ادب کے استعاروں کے برعکس قرآنی استعارے آفاقی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ کسی خاص جغرافیہ، ثقافت یا نسل تک محدود نہیں رہتے بلکہ اپنی معنویت اور اثر پذیری کے اعتبار سے پوری انسانیت کو مخاطب کرتے ہیں۔ اسی لیے دنیا کے کسی خطے کا انسان انھیں سمجھنے اور ان سے معنوی فیض حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مصنف کا طویل مقدمہ جو اس کتاب کے مباحث کی وضاحت کرتا ہے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں استعارہ کے معنی ومفہوم قرآنی استعاروں کا پس منظر ان کی انفرادیت اور ان کی معنوی جہات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے مطالب کی صحیح تفہیم کے لیے مقدمہ کا بغور مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ اردو کے معروف ادیب وشاعر اور عربی فارسی اور دینیات کے معلم مولانا ڈاکٹر ظہیر احمد راہی فدائی نے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے مصنف کے خلوص، محنت اور تحقیقی کاوشوں کو سراہتے ہوئے استعاروں کے سلسلے میں مصنف کا اختیار کردہ طریقہ کار پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور اس علمی خدمت کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں قرآنی استعاروں پر لکھے گئے دو انگریزی مضامین اور مصنف کا تفصیلی تعارف بھی موجود ہے، جس سے قاری کو مصنف کی علمی وادبی شخصیت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس ضخیم کتاب کی جلد اور جلی حروف کی دلکشی اس کے عنوان کے شایان شان ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ 'قرآنی استعاروں کی فنی عظمت' ایک اہم وقیع اور تحقیقی تصنیف ہے جو مصنف کی قرآن سے وابستگی، علمی صلاحیت، تحقیقی ذوق اور ادبی بصیرت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ یہ کتاب ان قارئین کے لیے خاص طور پر مفید ثابت ہوگی جو قرآن کریم کے گہرے معانی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ مزید برآں یہ زبان وادب کے محققین کے لیے بھی نئے فکری وتحقیقی امکانات کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ کتاب کی طباعت واشاعت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ نہایت خوبصورت سرورق کے ساتھ مضبوط جلد سازی کتاب کی پہچان میں اضافہ کرتی ہے۔

ترتیب

معروف شعرا کی نظم نگاری

مرتبین: سیما گوہر اور ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں
صفحات: 324، قیمت: 700 روپے
رابطہ: سیما گوہر رامپوری، نزد گاندھی مال، رام پور، اتر پردیش
مبصرہ: سمیہ محمدی، A-33/2، گلی نمبر 6، جوہری فارم، نئی دہلی۔25

اردو میں نظم نگاری کی ایک بہترین روایت رہی ہے جس میں شعرا نے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے ساتھ مشترکہ تہذیب اور دیگر مسائل کو موضوع بنایا۔

زیر تبصرہ کتاب 'معروف شعرا کی نظم نگاری' مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں ان کل اکیس مضامین شامل ہیں، جن میں علامہ اقبال، سرور جہاں آبادی، جوش ملیح آبادی، مجاز، جذبی، شکیل بدایونی، اختر الایمان، کیفی اعظمی اور دیگر شعرا کی نظم نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ سیما گوہر اور ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے نہایت اہم شعرا اور ان پر لکھی گئی تحریروں کو جمع کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے قارئین نہ صرف مذکورہ شعرا کے فن سے واقف ہوتے ہیں بلکہ اردو نظمیہ شاعری کی تاریخ، موضوعات اور مسائل سے بھی روبرو ہوتے ہیں۔ جن اہم قلمکاروں کی تحریریں اس کتاب میں شامل ہیں ان میں محمد حسن، عابد سہیل مناظر عاشق ہرگانوی، حمید سہروردی، علی احمد فاطمی، نیلم فرزانہ، راشد انور راشد اور غضنفر اقبال کے نام اہمیت کے حامل

ہیں۔اس کتاب کا پیش لفظ سیما گوہر نے تحریر کیا ہے جب کہ مقدمہ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے لکھا ہے۔ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے اپنے مقدمے میں اردو نظم کی تاریخ کے علاوہ چند اہم نظم گو شعرا کے موضوعات پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔نظیر اکبر آبادی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ نظیر کے یہاں جس قدر تنوع ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں،ان کی نظم میں تسلسل،ربط اور سادگی موجود ہے۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون الف ناظم کا 'اردو میں انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کی روایت اور سرور جہاں آبادی' کے عنوان سے ہے۔سرور جہاں آبادی اردو نظمیہ شاعری کا ایک اہم نام ہے،مگر انھوں نے انگریزی زبان سے براہ راست نظموں کے جو تراجم کیے ہیں وہ بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔سرور جہاں آبادی سے قبل بھی اردو میں تراجم کی روایت ملتی ہے مگر اس کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔حالی، اسماعیل میرٹھی اور محمد حسین آزاد وغیرہ کے جو تراجم ملتے ہیں وہ دراصل انگریزی نظموں یا حکایتوں سے ماخوذ ہیں،انھیں ہم باضابطہ ترجمہ تو نہیں کہہ سکتے مگر سرور جہاں آبادی نے انگریزی نظموں اور حکایت کا باضابطہ ترجمہ بھی کیا ہے اور اس کے مرکزی خیال کی روشنی میں نظمیں بھی تخلیق کی ہیں۔الف ناظم نے اپنے مضمون میں سرور جہاں آبادی کی پچاس نظموں کا ذکر کیا ہے،ان کے تراجم اور نظموں کے موضوعات پر بھی گفتگو کی ہے۔

'اردو نظم: سمت و رفتار' پروفیسر حمید سہروردی نے تحریر کیا ہے۔ان کے مضمون کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے''اردو نظم کی ابتدا حالی اور آزاد کی ترجمہ شدہ اور طبع زاد نظموں سے ہوئی۔'' پروفیسر سہروردی نے نظیر اکبر آبادی کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے،انھوں نے اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی ہے۔پروفیسر سہروردی نے اردو نظم کی تاریخ کا عہد بہ عہد جائزہ لینے کی کوشش ضرور کی ہے مگر حالی،آزاد،اسماعیل میرٹھی اور عبدالحلیم شرر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون انھوں نے ترقی پسند،حلقہ ارباب ذوق اور جدیدیت کے ذیل میں لکھی گئی نظموں کے جائزہ لینے کے لیے تحریر کیا ہے۔اس لیے کہ انھوں نے ترقی پسند اور حلقہ ارباب سے وابستہ شعرا کی نظم نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے مگر دیگر شعرا کے حوالے سے سرسری گفتگو ملتی ہے۔

'اردو نظم کا زوال' بھی اہم مضمون ہے۔اس میں انھوں نے نظم نگاری کے زوال کی جانب اشارہ کیا ہے۔محمد حسن نے لکھا ہے کہ چند شعرا کی پیروی ہی نظم کے زوال کا سبب بنی۔انھوں نے اردو نظم میں پانچ اسالیب (جوش کا خطیبانہ طرز،فیض کا غزل کی روایتی سج دھج کے ساتھ نظم کا زیور پہنانا،راشد کی عصری حسیت والی نظمیں، میراجی کی علامت زدہ ابہامی نظمیں اور اختر الایمان کے نظموں کا تسلسل اور ارتقا) کی نشاندہی کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ''ان پانچوں اسالیب کی بنیاد کسی نہ کسی حد تک فکر پر تھی یہ فکر کتنی ہی ناقص یا ادھ کچری کیوں نہ ہو اور فکر وفن کے تناسب کی تلاش میں بہت سے نقہ گروں کی آواز پھٹ گئی اور شاعری محض نعرہ یا محض چیخ و پکار بن کر رہ گئی۔'' محمد حسن نے مذکورہ پانچ شعرا یا ان اسالیب پر گفتگو کرتے ہوئے صرف اختر الایمان کی نظموں کو زندہ قوت کی حیثیت سے باقی رہنے والا بتایا ہے۔گویا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اختر الایمان کے علاوہ جن چار نظم گو شعرا کا ذکر اوپر آیا ان کی پیروی کو ہی محمد حسن نظم کے زوال کے اسباب کے طور پر دیکھتے ہیں۔محمد حسن کا یہ مضمون کافی تفصیلی ہے جس میں نظم کے زوال کے اسباب ہی نہیں غزلیہ شاعری کے مزاج پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر خان فاروق (بگل اتساہی کی نظم اور حب وطن)، ڈاکٹر راشد انور راشد (جذبی کی نظم 'میری شاعری اور نقاد')، ڈاکٹر رضیہ پروین (جوش ملیح آبادی کی فطری شاعری: نظم کے تناظر میں)، ڈاکٹر شاذیہ عمیر (محبت کا توانا لہجہ- پروین شاکر: نظم کے حوالے سے)، عابد سہیل (کیفی اعظمی کی نظم گوئی: آخر شب' اور' آوارہ سجدے' کی روشنی میں) پروفیسر علی احمد فاطمی (شکیل بدایونی: بحیثیت نظم نگار) وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ان مضامین کے علاوہ سیما گوہر کی 24 آزاد نظمیں بھی شامل ہیں۔مجموعی طور پر اردو نظم کی تاریخ سے یہ ایک اچھی کتاب ہے،جس میں اہم ناقدین اور مضمون نگار کی تحریریں شامل ہیں۔ان مضامین کو پڑھتے ہوئے ہم ایک جانب نظم کے عروج و زوال کے اسباب کو سمجھتے ہیں تو دوسری جانب چند اہم نظم گو شعرا کے فکر وفن کو تفصیلی طور پر پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔کتاب میں جن شعرا کے فکر وفن کا جائزہ لیا گیا ہے اس کی مناسبت سے ان کی تصویر سرورق پر لگائی گئی ہے جس سے سرورق دیدہ زیب ہو گیا ہے۔

شاعری

خواب مت پڑھا کرو

شاعر: معید رشیدی

قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2026

ناشر: بازگشت بکس، نئی دہلی

مبصر: ممتاز اقبال، محلہ ککرا، خورد، نزد قاضی محمد افضل ہاؤس، شاہجہانپور، یوپی

معید رشیدی کا شمار اُن ممتاز معاصر شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے بالخصوص غزل کے دائرے میں اپنی فکری بالیدگی اور فنی مہارت کے ذریعے نئے اور تازہ مضامین داخل کیے ہیں۔اُن کا دوسرا شعری مجموعہ 'خواب مت پڑھا کرو' ہے جس میں 99 غزلیں شامل ہیں،ان کے ساتھ پیش لفظ 'تعبیر سے الگ' بھی شامل ہے۔

یہ پیش لفظ قاری کو شاعر کی فکری اور شعری دنیا کے اسرار سے روشناس کراتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ شاعر اپنے عہد سے کس طرح وابستہ ہے اور ساتھ ہی اس سے کتنے فاصلے پر کھڑا ہے۔ شناخت اور یادداشت جیسے موضوعات — جو شاعری میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں،معید رشیدی کی غزلوں میں نئے زاویوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔خوابوں کے حوالے سے بھی معاصر منظر نامہ سامنے آتا ہے،اور اس سے زیادہ معنی خیز بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ غزل کے قالب میں ڈھلتا ہے۔انھوں نے ذاتی نوعیت کے شاعرانہ اظہار سے نہ صرف شعوری اجتناب برتا ہے بلکہ انھیں فنکارانہ گرفت میں لے کر شعر کا حصہ بنایا ہے۔یہ رویہ اُن کی غزل کو محض شخصی واردات سے بلند کر کے اجتماعی اور فکری سطح پر لے آتا ہے۔زندگی اور شاعری کے ناقابلِ بیان دکھوں کو تخلیق کے ذریعے بیان کرنا نہایت پیچیدہ کام ہے،مگر اس مجموعے کے خالق نے اسے کمالِ مہارت سے حل کر دکھایا ہے۔'خواب مت پڑھا کرو' معید رشیدی کے شعری سفر کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔

'آخری کنارے پر' معید رشیدی کا اولین شعری مجموعہ ہے۔زیرِ نظر مجموعہ محض غزلوں کا سلسلہ نہیں بلکہ خواب دیکھنے اور خوابوں کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا ایک مسلسل عمل ہے۔شاعر تمام رات آسمانِ فکر پر سفر کرتا ہے اور معراجِ سخن کی جستجو میں خوابوں کو پڑھنے کے بجائے انھیں ایک تخلیقی واردات میں بدل دیتا ہے۔یہی خواب نہ پڑھنے کا راز ہے۔شاعر خواب کو محض بصری یا نفسیاتی تجربہ نہیں رہنے دیتا، بلکہ اسے شعری اظہار کی نئی جہت میں منتقل کر دیتا ہے۔اس عمل میں شاعر کی فنکارانہ

کارفرمائیاں قاری کو اس بات کے لیے غور کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ خواب اور حقیقت کے درمیان فاصلے کو کس طرح غزل کے قالب میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ خوابوں کو پڑھنے کے بجائے انھیں تخلیق کے عمل میں برتنے کی ایک شعری حکمتِ عملی ہے، اور یہی حکمتِ عملی معید رشیدی کو معاصر اردو غزل میں ایک منفرد اور نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔

جتنے تھے قافیے وہ ردیفوں میں آ گئے　　ہم شعر کہتے کہتے لطیفوں میں آ گئے
جتنے شریف لوگ تھے سب ہو گئے خراب　　سارے خراب لوگ شریفوں میں آ گئے

ان اشعار کے پس پردہ جو کرب اپنی پوری شدت کے ساتھ آمیز ہے، وہ محض قرأت کا حصہ نہیں رہتا بلکہ ایک کاری ضرب ہے۔ یہ ضرب ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہم نے شاعری کے ساتھ اپنا فرض کہاں تک نبھایا اور کہاں اسے نظر انداز کر دیا۔ اب غور کیجیے کہ شعر کہنے، سننے اور سمجھنے کی روایت میں جو تبدیلی در آئی ہے، وہ محض ایک فنی تغیر نہیں بلکہ ایک تہذیبی اور فکری بحران کی علامت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس تبدیلی کو قبول کیسے کیا جائے؟ کیا ہم اسے روایت کے انہدام کے طور پر دیکھیں یا نئے شعری امکانات کے دروازے کے طور پر؟ اسی کشمکش میں اس کتاب کے بہت سے اشعار اپنی فکر، اپنی مشکلات اور اپنے نوحے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یہ نوحہ محض دکھ کا اظہار نہیں بلکہ قاری کو جھنجھوڑنے والا سوال ہے کہ کیا ہم نے شعر کو اس کی اصل معنویت کے ساتھ برتا یا اسے محض لذتِ قرأت تک محدود کر دیا۔ یوں یہ مجموعہ ہمیں نہ صرف شعری کرب کا تجربہ کراتا ہے بلکہ ہماری ادبی ذمہ داریوں پر بھی سوال قائم کرتا ہے۔ یہی اس کی تخلیقی قوت اور تنقیدی معنویت ہے۔

مسئلے اور بھی حائل ہیں غم دل کے سوا　　عشق میں روز پریشان تو ہونے سے رہا

یہ وہی اضطراب ہے جسے عبوری دور کے غزل گو شعرا نے شدت سے محسوس کیا۔ مضمون کی خوبی یہ ہے کہ روایت اور کلاسیک سے رشتہ کس طرح بحال رکھا جاتا ہے، اور ساتھ ہی نئے عہد کے تقاضوں کو کس طرح برتا جاتا ہے، یہ سب کچھ قاری کے سامنے ایک فکری سوال کی صورت میں آتا ہے۔ انسانی مسائل، مقتدرہ پر طنز کے تباہ کن اثرات، غمِ دوراں کی ضرب کاری، روزگار کی دوڑ دھوپ اور ہر لمحہ ذات میں ہونے والی خورد برد.... یہ سب عناصر شاعر کے کلام میں محض ذاتی واردات نہیں رہتے بلکہ عوام و خواص کی زندگیوں پر حاوی اجتماعی تجربات بن جاتے ہیں۔

اس قدر سخت شرائط پہ فرشتوں کی طرح　　آدمی صاحب ایمان تو ہونے سے رہا
اک شخص کی یادوں پہ گزارا نہیں ہوتا　　یہ کس نے کہا عشق دوبارہ نہیں ہوتا

بانی کا ٹوٹتے ہوئے رشتوں کے حوالے سے بہت عمدہ اور حوالہ بن جانے والا شعر ہے، جہاں چپ یعنی خاموشی کو مضمون بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اب معید رشیدی کا یہ شعر دیکھیے۔

عجب طرح کی خامشی دلوں کے درمیان تھی　　زبان بھی کھلی نہیں، کلام کر دیا گیا

عشق غزل کی شاعری کا مرکزی مضمون ہے اور معید رشیدی نے اس مضمون سے کیسے کیسے بلا کے اشعار کی تخلیق کی ہے۔ اصل معاملہ ہے شعر میں آسانی پیدا کرنا اور معید رشیدی نے اپنے پہلے مجموعے کے بعد اس فن میں مزید یکتائی حاصل کر لی ہے۔ جہاں تک میں اس خوبصورت شاعری میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ اور سمجھ پایا ہوں، وہ چیز طرز اظہار کی تبدیلی ہے۔ عشق کی بدلتی ہوئی صورتوں کو آسان زبان اور طرز اظہار کے مختلف پیرائے میں کیسے بیان کیا جاتا ہے، ان اشعار میں دیکھیے۔

اس دشت میں اک آہوئے رم خوردہ کی مانند　　لگتا ہے کہ ہم عشق کے مارے ہی رہیں گے
عشق نے چھوڑ دیا سخت اذیت کے لیے　　اب تلک جان نہیں لی تو رعایت کی ہے
معلوم ہے کہ عشق میں نقصان چاہیے　　یہ مسئلہ بھی آپ کو آسان چاہیے
عشق میں فائدہ کیسا ہے خسارہ کیا ہے　　جان لے کر بھی وہ کہتے ہیں تمہارا کیا ہے

معید رشیدی نے اپنے تبدیل شدہ لہجے بلکہ طرز اظہار کے لیے ایک خاص فضا پیدا کی ہے۔ اس فضا میں مختلف قسم کے شعری منظر ناموں، داخلی اور خارجی موسموں کی صورتوں سے رمز شناس ہونے کا اپنا لطف ہے۔ متعدد غزلوں کو پڑھتے وقت یہ احساس اور ادراک ہوتا ہے کہ جیسے غزل اپنی اصل صورت میں، اپنی ماہیت میں ہمارے عصر کی ترجمانی ایسے ہی کر سکتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کوئی قیس نہیں جاتا اب ویرانے کی اور　　مجنوں سارے شہر میں آج کمانے آتے ہیں
حاکم وقت سے بیعت میں خلل پڑتا ہے　　دل ہو خاموش تو نسبت میں خلل پڑتا ہے
دل سے جب آہ نکلتی ہے تو جھکتا ہے فلک　　آنسوؤں سے بھی حکومت میں خلل پڑتا ہے

اب ذرا غور کیجیے کہ ان اشعار کی زبان ایک ہی غزل کے فرد شعروں کی مضمون کاری اور فصاحت و بلاغت سے کس سطح پر گفتگو کر رہی ہے۔ خالص غزل کی زبان اور خالص تخلیقی بیان۔ کہیں کوئی اعلان نہیں لیکن ایک وجدان کہ شاعر اور شاعری اس مقام پر کیسے آپس میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ 'خواب مت پڑھا کرو' کے بارے میں اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اردو غزل کے ہر قاری کو یہ خواب پڑھنے چاہئیں اور اردو شاعری کی اس تازہ ترین کتاب کو اپنی شیلف کا حصہ بھی ضرور بنانا چاہیے۔

رسائل و جرائد

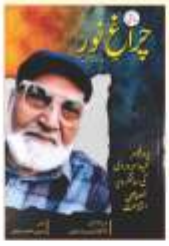

سہ ماہی چراغ نور (خصوصی شمارہ)

مدیران: مبین احمد زخم، محمد کیف حیدری
صفحات: 240، قیمت: 200، سنہ اشاعت: یکم جون، 2025
ناشر: 3/851-7، عقب مسجد مقبرہ
خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، درگاہ روڈ، گلبرگہ
مبصر: جہاں گیر حسن، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، کوشامی (یوپی) 212213

گلبرگہ، کرناٹک کا ایک مشہور مردم خیز شہر ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اس شہر کو دکنی تہذیب و ثقافت اور ادب و سیاست میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بلکہ یہ شہر آج بھی تاریخ و ثقافت، علم و ادب اور تصوف و روحانیت کے حسین امتزاج کی وجہ سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ جناب حمید سہروردی اُسی عظیم شہر سے تعلق رکھتے ہیں اور گلبرگہ ہی کی طرح علم و ادب، تہذیب و ثقافت اور تصوف و روحانیت کا منبع و مرکز کی حیثیت سے متعارف و مشہور ہیں۔ 'سہ ماہی چراغ نور' کا یہ خصوصی شمارہ اُن ہی کی شخصیت و فن پر مبنی ہے۔ یہ ایک دستاویزی مرقع ہے جو محض اُن کی علمی و ادبی خدمات اور اُن کے فکر و فن کو نمایاں نہیں کرتا بلکہ اُن کی شخصی و ادبی انفرادیت کو بھی اُجاگر کرتا ہے۔

زیرِ نظر رسالہ مختلف گوشوں پر مشتمل ہے اور ہر گوشہ اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے، مثلاً 'گل جرس' کے تحت ایک اداریتی تحریر 'خاموشی کا صدا کار' ہے جو بالا جمال حمید سہروردی کا تعارف پیش کرتی ہے۔ 'گل تر' کے تحت 'زندگی نامہ' ہے جو بشکل توقیت اُن کے اوراقِ زندگی سے پردہ اٹھاتا ہے، جب کہ 'گل سخن' میں اُنھیں منظوم خراج پیش کیا گیا ہے۔ 'گل دوستی' کے تحت اُن کے مختلف انٹرویوز ہیں۔ یہ گوشہ اُن

کے افکار وخیالات جاننے کا عمدہ ذریعہ ہے کہ ادب، معاشرے کا آئینہ بھی ہوتا ہے اور اُس کی تعمیر وتشکیل کا ایک مؤثر ذریعہ بھی۔ بس ضرورت اِس بات کی ہے کہ ادب کی اہمیت کو سمجھا جائے، تخلیق کاروں کی قدر کی جائے اور اُردو زبان کے فروغ کے لیے سنجیدہ کوششیں ہوں۔ ایک اہم انٹرویو 'جوگندر پال کا فکشن زندگی کا رمزنامہ' ہے۔ یہ انٹرویو، جہاں جوگندر پال سے متعلق حمید سہروردی کے نظریات کو اُجاگر کرتا ہے وہیں یہ بتاتا ہے کہ جوگندر پال کا ادب، انسانی نفسیات اور وجودی سوالات کا عکاس ہے اور اُن کی کہانیاں محض واقعات کا بیان نہیں بلکہ زندگی کے پیچیدہ رموز کا انکشاف ہیں۔

'گل رو' کے تحت شامل مضامین کے بموجب: حمید سہروردی نے محض انسان کی باطنی پیچیدگیوں کو اُجاگر نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کے فکری، تہذیبی اور روحانی بحران کو بھی نمایاں کیا۔ اُن کی تحریروں میں ایک خاص گہرائی، رمزیت، معنویت، ثقافتی تنوع اور روحانیت کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کی سخن دانی محض الفاظ کا زیر وبم نہیں بلکہ ایک فکری جہان کی حامل ہے۔ وہ نثر ونظم دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں اور اُن کی تخلیقات نے علاقائی اور قومی دونوں سطحوں پر اُردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ 'گل آگہی' کے ذیل میں شامل مضامین حمید سہروردی کی افسانہ نگاری اور اُن کی فنکاری پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اُنھوں نے کس طرح قدامت وجدت کے درمیان ایک متوازن راستہ اختیار کیا۔ اُن کا اسلوب علامتی، استعاراتی اور تہہ داری کا حامل ہے۔ وہ سادہ بیانیہ سے گریز کرتے ہوئے معنی کی کئی سطحیں قائم کرتے ہیں۔ زبان میں شعریت، جملوں میں روانی اور بیان میں تصوف کی آمیزش اُن کی بنیادی شناخت ہے۔

'گل رنگیں' کے تحت شامل مضامین سے پتا چلتا ہے اُن کی نظمیں اُن کی تخلیقی بصیرت کا آئینہ دار ہیں۔ یہ نظمیں محض لفظوں کا کتر بیونت نہیں بلکہ ایک تصویری اور روحانی تجربات ہیں۔ اُن کی نظمیں قاری کو ایک ایسے جہان میں لے جاتی ہیں جہاں خیال، رنگ، صوت اور سکوت سب ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک نئی معنویت واحساس پیدا کرتے ہیں۔ 'پینٹنگ نظمیں' اُن کا ایک نمایاں وصف ہے جس میں پینٹنگ نما انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ اُن کی نظمیں موضوعاتی طور پر بھی کافی وسیع ہیں۔ وہ داخلی کرب، روحانی جستجو، وجودی سوالات اور کائناتی اسرار کو اپنی نظم کا حصہ بناتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں نہ تو محض رومانویت ہے اور نہ ہی خشک فلسفہ، بلکہ ایک متوازن اور گہرا فنی شعور دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظمیں حرکت وشعور عطا کرنے کے ساتھ اپنے قاری کو جھنجھوڑتی ہیں کہ وہ اپنے وجود اور مقصد پر غور کرے۔ گویا اُن کی نظمیں محض ذہن کو متحرک نہیں رکھتیں بلکہ روح کو بھی ایک نئی آگہی عطا کرتی ہیں۔

'گل مہتاب' کے تحت دو تحریریں ہیں جو حمید سہروردی کی تصنیف 'جوگندر پال: دیدونادید' پر لکھے گئے تبصرے ہیں۔ اول الذکر کے بموجب: یہ تصنیف، جوگندر پال کے ادبی وفکری مقام کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے جس میں 'دیدونادید' کی خوب صورت ترکیب کی مدد سے ظاہر و باطن (دیدونادید) تک رسائی کی گئی ہے کہ جوگندر پال کا فن محض افسانہ نگاری تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک فکری وروحانی تجربہ کے قالب میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔ ثانی الذکر کے بموجب: اِس تصنیف میں جوگندر پال کو ایک رہنما اور فکری چراغ کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ اُن کی تحریریں صرف ادبی لطف نہیں دیتیں بلکہ قاری کو غور وخوض کرنے اور نئے زاویوں سے زندگی کو دیکھنے کی ترغیب بھی دیتی ہیں۔ بہرحال بات اِس پر تمام کردی گئی ہے کہ 'دیدونادید' ایک طرف جوگندر پال کے فن کی گہرائیوں کا اعتراف ہے، تو دوسری طرف اُس کی رہنمائی اور اثر انگیزی کا اقرار۔ یہی امتزاج جوگندر پال کو اُردو ادب میں ایک منفرد اور دیرپا مقام عطا کرتا ہے اور مصنف نے اِس کو بخوبی ملحوظ بھی رکھا ہے۔ 'گل مضمون' کے ذیل میں 'حمید سہروردی اور بچوں کی کہانیاں' اور 'حمید سہروردی کی غیر افسانوی تحریریں' ہیں۔ جو اِس بات کا پتا دیتی ہیں کہ حمید سہروردی نے بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھی ہیں، وہ محض تفریح کا سامان نہیں بلکہ اخلاقی تربیت، ذہنی نشوونما اور تخلیقی شعور کو بیدار کرنے کا اہم ذریعہ ہیں، جب کہ غیر اَفسانوی تحریروں میں اُن کی تنقیدی تحریریں اور فکری نوشتے سرفہرست ہیں اور اِن تحریروں میں اُن کی فکری گہرائی، شگفتہ بیانی، تجزیاتی بصیرت اور اصلاحی پہلو بالخصوص نمایاں ہیں۔

'گل رُخاں' کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں حمید سہروردی کے افسانے 'کالے گلاب'، 'سفید پرندے'، 'گم'، 'فرض شناس' اور 'نواب مرزا' ہیں، تو دوسرے حصے میں اُن کی نظمیں۔ افسانوں میں 'کالے گلاب' علامت اور اِستعارے کا خوب صورت نمونہ ہے۔ 'سفید پرندے' پاکیزگی، آزادی اور خوابوں کی علامت ہے۔ 'گم' وجودی نوعیت پر مبنی ہے۔ 'نواب مرزا' ایک طنزیہ اور کردار نگاری پر مرکوز ہے۔ گویا یہ افسانے علامتی اُسلوب، نفسیاتی تجزیے اور فکری پختگی کے حامل ہیں۔ 'میں کہ ایک لفظ' وجود اور ذاتی شناخت پر دال ہے۔ شاعر خود کو ایک 'لفظ' کے پردے میں اُجاگر کرتا ہے۔ 'پرندہ دکھ کا نام نہیں' اِس نظم میں دکھ اور آزادی کے تصور کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے، جہاں پرندہ محض غم کی علامت نہیں بلکہ وہ قوت پرواز بھی رکھتا ہے۔ 'وہ اکیلا کس طرف جائے' یہ نظم تنہائی اور راستہ کھو دینے کا احساس دلاتی ہے، جب کہ 'الوداع' جدائی، رخصتی اور آخری لمحات کے احساسات کو نہایت سادگی مگر گہرائی سے بیان کرتی ہے۔ مزید تین مختصر اور تین شخصی نظمیں بھی ہیں: پہلی 'نئے منظروں کا نقیب'، یہ جوگندر پال پر مرکوز ہے۔ دوسری 'صداقتوں میں'، یہ شاہ حسین نہری پر مبنی ہے جن کی تحریریں معاشرتی اور فکری پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہیں اور اردو ادب میں وہ ایک منفرد لب ولہجے کے بطور جانے جاتے ہیں، اور تیسری 'روح کے آس پاس' جذباتی نظم ہے۔ یہ اپنی نسلوں سے ازحد محبت واُٹوٹ تعلق پر مشتمل ہے۔ چونکہ اِن نظموں میں فرد کے باطنی تجربات، یادیں اور ذاتی احساسات کو بیان کیا گیا ہے، اِس لیے یہ نظمیں بھی خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ حمید سہروردی نثر ونظم ہر دو صنف میں کمال وجمال کے ساتھ اپنے مالہ وماعلیہ کا اظہار کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہم یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ یہ پہلی ایسی کتاب ہماری نظر سے گزری ہے جس کے اکثر مضامین بشکر یہ ماخوذ ہیں، اور اکثر گوشوں کے اخیر میں مختلف تاثرات دیے گئے ہیں۔ مضامین کے اخیر میں تاثرات کا ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کہ اُن کے ذریعے موضوع سخن شخصیات کے افہام وتفہیم میں معاونت ہوتی ہے لیکن مضامین ماخوذ در ماخوذ ہوں، یہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ 'چراغ نور' میں شمولیت سے پہلے اگر اِن مضامین پر اَز سرنو اِک نظر ڈال دی جاتی اور حسب ضرورت حذف واضافہ کرلیا جاتا، تو تکرار سے بھی نجات مل جاتی اور جو گوشے کچھ نامکمل رہ گئے تھے اُس کی تکمیل بھی ہوجاتی۔ اِن تمام باتوں سے قطع نظر حمید سہروردی پر یہ ایک معلوماتی اور قیمتی دستاویز ہے اور قارئین وشائقین کے لیے بیش بہا تحفہ ہے، جس کے لیے مبین احمد زخم اور اُن کے معاونین قابل مبارکباد ہیں۔ ■

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کرلیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطور خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

دیگر زبانوں کی اہم علمی و ادبی کتابوں کے اردو تراجم کی ضرورت: پروفیسر قدوس جاوید

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں اردو ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں آج بتاریخ 20 اپریل 2026 اردو ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید (سابق صدر، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی) نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے

ہوئے اردو ادب پینل کے تحت کونسل کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر قدوس جاوید نے کہا کہ اردو کا ادبی سرمایہ کافی ثروت مند اور اہم ہے، البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیگر زبانوں میں لکھی گئی اہم علمی و ادبی کتابوں کے اردو تراجم شائع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی تجاویز بھی پیش کیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے تعلق سے بھی اردو میں کام کرنے کی ضرورت ہے اور کونسل یہ کام بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔ میٹنگ میں شریک ہونے والے دیگر اراکین پروفیسر صغیر افراہیم (علی گڑھ)، پروفیسر نسیم الدین فریس (حیدرآباد)، محترم جانکی پرساد شرما (دہلی)، پروفیسر شبنم حمید (شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج)، پروفیسر احمد محفوظ (شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) پروفیسر آفتاب احمد آفاقی (شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)، پروفیسر مشتاق عالم قادری (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)، ڈاکٹر نعیم انیس (شعبۂ اردو، کلکتہ گرلز کالج، کولکاتہ) اور ڈاکٹر درانی شبانہ (شعبۂ اردو، یشونت مہاودیالیہ، ناندیڑ، مہاراشٹر) نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مفید مشورے دیے۔ اس میٹنگ میں ممبران نے پینل کے تحت جاری اور مکمل شدہ مختلف پروجیکٹس کی صورت حال کا جائزہ لیا اور گذشتہ دنوں موصول ہونے والے نئے پروپوزلس کے تعلق سے بھی فیصلے لیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر، فاصلاتی تعلیم، این سی پی یو ایل) ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر، اکیڈمک، این سی پی یو ایل)، جناب نایاب حسن (ریسرچ اسسٹنٹ، اکیڈمک، این سی پی یو ایل)، ڈاکٹر فیضان الحق (ریسرچ اسسٹنٹ، ایڈیٹوریل، این سی پی یو ایل) اور جناب محمد افروز (پروجیکٹ اسسٹنٹ، این سی پی یو ایل) وغیرہ بھی موجود رہے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 20 اپریل 2026

جموں وکشمیر کی علاقائی زبانوں سے اردو کا رشتہ

جموں / نئی دھلی : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کے باہمی اشتراک سے 'جموں وکشمیر کی علاقائی زبانوں سے اردو کا رشتہ' کے عنوان سے جموں یونیورسٹی کے بریگیڈیئر راجندر سنگھ آڈیٹوریم میں یک روزہ سمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں خطے کی مختلف زبانوں سے اردو کے رشتوں کے مختلف پہلوؤں پر اہم مقالات پیش کیے گئے اور اہل علم ودانشوران نے قیمتی خیالات کا اظہار کیا۔

اس سمینار کے افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی جموں وکشمیر کی وزیر برائے تعلیم، صحت وطبی تعلیم اور سماجی بہبود محترمہ سکینہ ایتو نے شرکت کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اس سمینار کے انعقاد پر قلبی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایسے سمیناروں کا انعقاد اپنی جڑوں کی تلاش کی بہترین کوشش اور مشترکہ تہذیبی اقدار کا سنگ میل ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں ایسے موضوعات پر گفتگو وقت کی اہم ضرورت ہے کیونکہ زبانیں محض اظہار کا ذریعہ نہیں ہوتیں بلکہ تہذیبی شناخت کا نمونہ ہوتی ہیں، اس لیے ہمیں اپنی تہذیبی شناخت کے تحفظ کے لیے اپنی زبانوں کی بھی حفاظت کرنی ہوگی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کی پیدائش اور ترقی میں ہندوستان کے دیگر علاقوں کے ساتھ جموں وکشمیر کا بھی ناقابل فراموش کردار ہے اور اردو نے اس علاقے کی زبانوں کے الفاظ ومحاورات لیے ہیں اور بدلے میں انھیں ایک مربوط پلیٹ فارم دیا ہے۔ اردو اس خطے میں مختلف سماجی اکائیوں کو جوڑنے والے ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے جو سرکاری سرپرستی میں پھل پھول رہی ہے۔

اجلاس کے صدر اور جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر امیش رائے نے اپنے خطاب میں کہا کہ لسانی سطح پر اردو نہ صرف جموں وکشمیر بلکہ ہندوستان کے دوسرے خطوں کو بھی جوڑتی ہے۔ ہمیں ہندوستان کی تمام زبانوں کو اسی اعتبار سے دیکھنا چاہیے اور ان کے فروغ کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے توقع ہے کہ یہ سمینار اس سلسلے میں ایک اہم پیش رفت ثابت ہوگا اور جموں وکشمیر کی زبانوں کے ساتھ اردو کے رشتوں پر نہایت مفید باتیں سامنے آئیں گی۔ انھوں نے نئی نسل کو تکنیکی چیلنجز سے نمٹنے کی طرف بھی توجہ دلائی اور کہا کہ آج اگر ہمیں اپنی زبانوں کو زندہ رکھنا ہے تو نئے تکنیکی وسائل کے استعمال کے طریقوں کو سیکھنا ہوگا۔

اس سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ انھوں نے کہا ہندوستان ایک کثیر لسانی وکثیر ثقافتی ملک ہے اور اس ملک کی کئی ریاستیں اس تنوع کے خوب صورت نمائندگی کرتی ہیں جن میں ریاست جموں وکشمیر سرفہرست ہے۔ انیسویں صدی میں اردو کو یہاں سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج نہ صرف یہاں کی مقامی زبانوں جیسے کشمیری، گوجری، پہاڑی، ڈوگری، شینا، بلتی وغیرہ میں بہت سے اردو الفاظ وتعبیرات پائے جاتے ہیں بلکہ اردو میں بھی ان زبانوں کے بہت سے الفاظ موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نئی ایجوکیشن پالیسی نے ہندوستان کی تمام مادری و علاقائی زبانوں کے فروغ کی راہیں روشن کی ہیں، جن سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں بائیس شیڈولڈ زبانیں ہیں یعنی ان سب کو آئینی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا ہمیں مل جل کر اپنی زبانوں کے فروغ کی کوشش کرنی چاہیے اور مل کر اپنے ملک کو خوب صورت بنانا چاہیے۔

شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے صدر پروفیسر شہاب عنایت ملک نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کشمیر سے پہلے جموں میں داخل ہوئی اور ڈوگرہ حکمرانوں کے زمانے میں اس زبان نے سرکاری حیثیت حاصل کی جس کی وجہ سے یہاں اسے پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ انھوں نے بتایا کہ آج بھی کشمیر اور جموں کے عوام کے مابین رابطے کی سب سے مضبوط زبان اردو ہے۔ تحریک آزادی میں اس زبان کے قابل فخر کردار کی طرف بھی انھوں نے کچھ اہم اشارے کیے۔

بزرگ ناقد ومحقق پروفیسر قدوس جاوید نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جموں وکشمیر آج اردو زبان کا سب سے مضبوط قلعہ ہے اور یہاں کی مقامی زبانیں اس قلعے کی ستون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زبان کوئی بھی ہو اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا البتہ

اس کی اپنی تہذیب ہوتی ہے، لہٰذا ہمیں سبھی زبانوں کا احترام کرنا چاہیے جو دراصل ان کے اندر چھپی تہذیبوں کا احترام اور خود اپنے مہذب ہونے کی علامت ہے۔

معروف فکشن نگار خالد حسین نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو نے جموں وکشمیر کی مقامی زبانوں سے خوب استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جموں وکشمیر کی مقامی زبانوں کی ماں پنجابی زبان ہے اور اردو پر بھی اس کے اثرات ہیں، جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس اجلاس کی نظامت شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر فرحت شمیم نے کی اور پروفیسر محمد ریاض احمد کے اظہارِ تشکر پر اس کا اختتام عمل میں آیا۔

سمینار کے پہلے تکنیکی سیشن کی صدارت ڈاکٹر شفق سوپوری اور پروفیسر عباس رضا نیر (لکھنؤ یونیورسٹی) نے کی، مہمان اعزازی پروفیسر محمد علی جوہر (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) تھے جبکہ اس سیشن میں ڈاکٹر ٹی آر رینا، ڈاکٹر مشتاق حیدر (کشمیر یونیورسٹی)، ڈاکٹر لیاقت علی (اگنو، دہلی) نے جموں وکشمیر کی مختلف علاقائی زبانوں سے اردو کے رشتوں کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مقالے پیش کیے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر چمن لال نے کی۔

دوسرے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر مشتاق احمد (سی ایم کالج، دربھنگہ)، ڈاکٹر ٹی آر رینا، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز (ممبئی یونیورسٹی) نے کی، جب کہ مہمان اعزازی ڈاکٹر زرینہ زریں (کلکتہ یونیورسٹی) تھیں۔ جب کہ مقالہ نگاروں میں پروفیسر اسداللہ وانی، ڈاکٹر کوثر رسول، ڈاکٹر آصف ملک علیمی، ڈاکٹر جگ موہن اور ڈاکٹر شہناز قادری شامل تھے۔ ڈاکٹر عبدالرشید منہاس نے اس سیشن کی نظامت کی۔

سمینار کے بعد ایک خوب صورت شام غزل کا بھی اہتمام کیا گیا۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 23 اپریل 2026

امیر حسن عابدی میموریل لیکچر

نئی دھلی : قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان اور شعبۂ فارسی (شبینہ)، ذاکر حسین دہلی کالج کے باہمی اشتراک سے چوتھا امیر حسن عابدی میموریل لیکچر/ پینل ڈسکشن ذاکر حسین دہلی کالج کے سمینار ہال میں منعقد ہوا۔ اس پروگرام میں فارسی زبان وادب کے طلبہ، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز کے علاوہ دیگر شعبہ جات کے اساتذہ وطلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر علیم اشرف خان (صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی) نے 'امیر حسن عابدی کی حیات وخدمات' پر نہایت بصیرت افروز گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ امیر حسن عابدی جیسی نابغۂ روزگار شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ جس انداز سے کام کرتے تھے اور جس محنت ولگن سے تحقیقی خدمات انجام دیتے تھے، وہ واقعی قابلِ تقلید ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ عابدی صاحب نے تحقیق کو محض پیشہ نہیں بلکہ ایک مشن کے طور پر اختیار کیا اور اپنی زندگی علم کی تلاش اور اس کے فروغ کے لیے وقف کر دی۔ ان کی علمی دیانت، تحقیقی بصیرت اور موضوع سے گہری وابستگی نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

فارسی زبان وادب کے ممتاز اسکالر اور سابق صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی پروفیسر چندر شیکھر (آن لائن) نے کہا کہ امیر حسن عابدی نہایت بااخلاق اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے شاگردوں کی رہنمائی کرتے اور انھیں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ عابدی صاحب نے فارسی مخطوطات کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں اور ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ کو ازسرِ نو زندہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ عابدی صاحب کی علمی میراث آنے والی نسلوں کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے جس سے استفادہ کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ پروفیسر وجیہ الدین علوی (آن لائن) نے کہا کہ عابدی صاحب کی خدمات بے حد گراں قدر ہیں۔ وہ بجا طور پر ایک چلتی پھرتی لائبریری تھے۔ وہ ہمیشہ مخطوطات کی تلاش میں رہتے اور اپنے شاگردوں کو بھی اس جانب راغب کرتے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ عابدی صاحب نے تحقیق کے میدان میں جستجو، صبر اور استقامت کی جو مثال قائم کی، وہ کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی شخصیت علم دوستی اور تحقیقی انہماک کی روشن علامت تھی۔ پروفیسر عراق رضا زیدی (سابق صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ امیر حسن عابدی نے فارسی زبان وادب کے حوالے سے اتنا وسیع کام کیا ہے کہ اسے الفاظ میں سمیٹنا مشکل ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی فارسی زبان کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔

پروفیسر سید کلیم اصغر (صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے امیر حسن عابدی سے اپنی پہلی ملاقات کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک نہایت خوشگوار اور متاثر کن تجربہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ عابدی صاحب نے ہندوستان کے علاوہ ایران، افغانستان اور دنیا کی مختلف لائبریریوں کا سفر کیا اور نایاب مخطوطات کی تلاش میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ وہ ہمیشہ نئے اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کرتے اور تحقیق میں جدت پیدا کرتے تھے۔ پروفیسر شمیم الحق صدیقی نے بھی عابدی صاحب کے ساتھ گزارے گئے لمحات کو یاد کرتے ہوئے ان کے کام کرنے کے جنون اور غیر معمولی محنت کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ عابدی صاحب کا اندازِ کار انتہائی منظم اور سنجیدہ تھا، ان کی علمی سنجیدگی اور مستقل مزاجی ہر محقق کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر جمیل الرحمٰن، جناب سہیل عابدی، ڈاکٹر شعیب رضا وارثی، ڈاکٹر مہتاب جہاں، ڈاکٹر زین العبا اور ڈاکٹر عمران چودھری نے بھی امیر حسن عابدی کی حیات اور ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر خورشید احمد نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی، جب کہ شکریے کی رسم ڈاکٹر ممتاز احمد نے ادا کی۔ اس موقع پر پروفیسر محمود فیاض کی مرتبہ کتاب 'امیر حسن عابدی خطبات' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ مقررین نے اس عزم کا اظہار کیا کہ امیر حسن عابدی کے علمی مشن کو آگے بڑھایا جائے گا اور فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے سنجیدہ کوششیں جاری رکھی جائیں گی۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 26 اپریل 2026

کلیم الدین احمد کی نگارشات: ایک بازدید

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے باہمی اشتراک سے 'کلیم الدین احمد کی نگارشات: ایک بازدید' کے عنوان سے سی آئی ئی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کانفرنس ہال میں یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں کلیم الدین احمد کی شخصیت و افکار پر نہایت مفید و معنی خیز خطبات و مقالات پیش کیے گئے۔

اس سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت بزرگ ناقد و دانشور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ کلیم الدین احمد کا سب سے بڑا

کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور کی یک رخی اور ایک ہی ڈگر پر چلنے والی اردو تنقید کو تجزیہ و نظر کی ایک نئی راہ سے روشناس کیا۔ انھوں نے اردو شاعری اور تنقید پر جو کچھ لکھا وہ ہمارے ذہنوں کو روشن کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کلیم الدین احمد کے افکار و نظریات پر بعد میں جس طرح غور و فکر ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہوا۔ میں کونسل اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اس سمینار کے انعقاد کے لیے خصوصی مبارکباد پیش کرتا ہوں، کہ آج کا یہ سمینار کلیم الدین احمد کے فکر و فن کی ایسی جہتیں سامنے لائے گا جو اب تک اجاگر نہیں کی گئی ہیں۔

اس سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ کلیم الدین احمد ایک قاموسی شخصیت کے حامل تھے جنھیں اردو کے ساتھ دیگر کئی علوم و فنون اور زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے روایتی تنقیدی نظریات پر دلائل اور تحقیق کی روشنی میں چوٹ کی اور ان کے کچھ تیکھے جملے بہت مشہور ہوئے جن کا ان کے معاصرین نے نوٹس لیا اور ان سے اختلاف بھی کیا گیا مگر اس کے باوجود سبھوں نے ان کی بلند و بالا علمی و ادبی قد و قامت کو تسلیم کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ضرورت ہے کہ نئی نسل کو ایسے عظیم ادیب و ناقد کی ہمہ جہت خدمات سے روشناس کروایا جائے۔ آج کا سمینار اسی سلسلے کی اہم پیش رفت ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اس سمینار کے مقالات و خطبات سے کلیم الدین احمد کی تفہیم کے نئے زاویے روشن ہوں گے۔

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر کوثر مظہری نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے اس سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور کہا کہ کلیم الدین احمد کی شخصیت و نگارشات پر دہلی میں اپنی نوعیت کا یہ منفرد سمینار ہے جس میں ان کی پوری شخصیت، نگارشات و افکار کا بھرپور جائزہ لیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کلیم الدین احمد کی خدمات ایسی ہمہ گیر ہیں کہ ان کے منظم مطالعے اور جائزے کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ قومی اردو کونسل اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے منعقدہ یہ سمینار اسی سلسلے کی کاوش ہے جسے دراز ہونا چاہیے اور ان پر مزید ڈسکورس ہونا چاہیے۔

معروف ناقد و دانشور پروفیسر شافع قدوائی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کلیم الدین احمد کی مختلف تصانیف کے حوالے سے ان کے تنقیدی نظریات و افکار پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اردو شاعری، تنقید اور داستان پر ان کی نگارشات کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کلیم الدین احمد کے امتیازات کی نشان دہی کی۔ پروفیسر قدوائی نے نفسیاتی تنقید پر کلیم الدین احمد کی کتاب کا خصوصی تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ پہلے اردو ناقد ہیں جنھوں نے تحلیلِ نفسی اور ادب کے باہمی تعلق کو اپنے تنقیدی مطالعے کا محور بنایا۔

اجلاس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر ابوبکر رضوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کلیم الدین احمد کی شخصیت جیسی عبقری تھی، اس کے شایانِ شان ان کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ قومی اردو کونسل اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مشترکہ کوششوں سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ انھوں نے کلیم الدین احمد کی علمی و ادبی عظمت کا حوالہ دیتے ہوئے خصوصاً طلبہ و طالبات سے ان کی جیسی ایمان داری اور علمیت پیدا کرنے کی تلقین کی۔

اس افتتاحی اجلاس کی نظامت پروفیسر سرور الہدیٰ نے کی۔ ڈاکٹر شاداب شمیم کے اظہارِ تشکر کے ساتھ اس اجلاس کا اختتام عمل میں آیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد سمینار کا پہلا تکنیکی سیشن منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر انور پاشا نے کی جبکہ مقالہ نگاروں میں پروفیسر شہزاد انجم (کلیم الدین احمد کی تنقیدی زبان)، پروفیسر احمد محفوظ (اردو شاعری پر ایک نظر: بازدید)، ڈاکٹر معید رشیدی (کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر) اور ڈاکٹر عبدالسمیع (کلیم الدین احمد کی عملی تنقید) شامل تھے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر نوشاد منظر نے کی۔

دوسرے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے کی۔ اس سیشن میں پروفیسر ابوبکر رضوی (کلیم الدین احمد اور ان کا رسالہ معاصر)، ڈاکٹر مشتاق صدف (اردو غزل اور کلیم الدین احمد)، ڈاکٹر مجاہد الاسلام (کلیم الدین احمد کی تنقید مغربی تناظر میں)، ڈاکٹر معراج رعنا (ہیئتی تنقید اور کلیم الدین احمد) نے مقالات پیش کیے، جب کہ نظامت ڈاکٹر ثاقب عمران نے کی۔

تیسرے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر شہپر رسول نے کی اور اس سیشن میں پروفیسر ابوبکر عباد (اردو داستان اور کلیم الدین احمد)، پروفیسر احمد امتیاز (کلیم الدین احمد کی تنقید)، ڈاکٹر محمد مقیم (کلیم الدین احمد کی کتاب اردو تنقید پر ایک نظر: بازدید)، ڈاکٹر خالد مبشر (کلیم الدین احمد اور ترقی پسند نظریہ) نے مقالات پیش کیے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر جاوید حسن نے کی۔

قابلِ ذکر ہے کہ اس سمینار میں شروع سے آخر تک اردو طلبہ و طالبات، دانشوران و اساتذہ کی بڑی تعداد موجود رہی۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 27 اپریل 2026

پریم چند کا ادب: نئے تناظر میں

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور پریم چند آرکائیوز اینڈ لٹریری سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے باہمی اشتراک سے 'پریم چند کا ادب: نئے تناظر میں' کے عنوان سے نہرو گیسٹ ہاؤس، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کمیٹی روم میں یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں پریم چند کی تخلیق، ادب اور فکر پر مرکوز خطبات اور مقالات پیش کیے گئے۔

سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد علی جوہر (سابق چیئرمین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے کی۔ انھوں نے ایک اہم موضوع پر سمینار کے انعقاد کے لیے مبارکباد پیش کی اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند کے ادبی کارناموں کی سیر کرتے ہوئے ہمیں مایوسی کے بجائے حد درجہ خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ 'ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا' جیسا پریم چند کا معروف جملہ نہایت گہرا اور معنی خیز ہے، جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اس سے قبل استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ فکشن کے حوالے سے پریم چند کی شخصیت گراں قدر ہے۔ قومی کونسل نے پریم چند کی تخلیقات کو 24 جلدوں میں شائع کر کے ایک تاریخی دستاویز فراہم کیا ہے۔ اسی طرح پریم چند کی تفہیم وتنقید سے متعلق مختلف کتابیں بھی کونسل سے شائع ہوئی ہیں۔ آج پریم چند کو نئے زاویے سے پڑھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ادب کے میدان میں ان کی خدمات غیر معمولی ہیں۔

تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شہزاد انجم (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے پریم چند سے متعلق پریم چند آرکائیوز اینڈ لٹریری سینٹر کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ پریم چند ہندوستانی ادب، تہذیب اور معاشرے کا ایک روشن چہرہ ہے۔ آج پریم چند کو نئے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ موضوع اور اسلوب کی سطح پر پریم چند کے یہاں حب الوطنی کے جذبات نمایاں ہیں۔ انھوں نے میدانی سطح پر کام کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کی تحریک کا بھی ساتھ دیا اور معاشرتی برائیوں کو اجاگر کیا۔ پریم چند کے ادبی متون کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔

سمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر انور پاشا (سابق چیرمین سی آئی ایل، جے این یو) نے پریم چند سے متعلق نہایت پرمغز اور معنی خیز خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند اردو اور ہندی میں یکساں طور پر سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب ہیں۔ پریم چند کے ذکر کے بغیر فکشن پر کوئی گفتگو شروع نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے اپنے آدرشوادی نقطۂ نظر کے ذریعہ معاشرے کو بدلنے کی کوشش کی۔ پریم چند کا خیال تھا کہ انسان فطری طور پر برا نہیں ہوتا، بعض عوامل اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں، جنھیں دور کر کے اسے بدلا جا سکتا ہے۔ پریم چند کا فن اور فنی رویہ انسانی حسیت سے عبارت ہے۔ پریم چند نے پہلی مرتبہ اپنی تخلیقات میں طبقاتی کشمکش کو پیش کرتے ہوئے مساوات کو اہمیت دینے کی ضرورت محسوس کی۔

مہمان اعزازی پروفیسر جتندر سریواستوا (رجسٹرار، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی) نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وکست بھارت 2047@ کے تناظر میں پریم چند کے فکر وفن پر گفتگو نہایت اہم ہے۔ پریم چند پہلے دور اندیش قلم کار ہیں جنھوں نے عورتوں کی تعلیم اور ان کی مساوات کا درس دیا۔ پریم چند وویکا نند سے متاثر تھے اور انھیں کی طرح ملک کو بدحال نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انھوں نے ایک بڑے تخلیق کار کے طور پر معاشرے کو سمجھتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ سماجی بیداری کی زمین ہموار کرنے میں پریم چند نے اہم کردار ادا کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر جاوید حسن (شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کی اور رسم تشکر جناب نایاب حسن (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) نے ادا کی۔

افتتاحی اجلاس کے بعد تین اہم تکنیکی اجلاس کا انعقاد کیا گیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی (چیئرمین، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور پروفیسر ابوبکر عباد (صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے کی۔ جس میں پروفیسر حبیب اللہ خاں (پریم چند عالم عرب میں)، پروفیسر احمد امتیاز (پریم چند کا نظریۂ مصوری)،

ڈاکٹر ارشاد نیازی (افسانہ 'کفن' کی ایک اور قرأت)، ڈاکٹر خالد مبشر (پریم چند کا افسانہ، بازارواد کے تناظر میں) اور جناب سید فیصل ہاشمی (مغربی زبانوں میں پریم چند کے تراجم) نے مقالات پیش کیے۔

دوسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ارشاد نیازی (شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی) نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد علی جوہر (پریم چند کا ایک مضمون 'قوت بیانیہ کا زوال')، ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی (جامعہ کا پریم چند آرکائیوز اور ادبی مرکز)، ڈاکٹر رحیل صدیقی (پریم چند اپنی تخلیقات کے آئینے میں)، ڈاکٹر سید محمد عامر (پریم چند کے افسانوں میں نسوانی کردار: نئے تناظر میں)، ڈاکٹر ثاقب عمران (افسانہ 'پنچایت' حق وانصاف کا لازوال بیانیہ) نے مقالات پیش کیے۔

تیسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری اور پروفیسر شہزاد انجم نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر جاوید حسن (پریم چند کے افسانوں میں ڈرامائی عناصر)، ڈاکٹر جے موہن سنگھ (پریم چند کے مضامین: نئے تناظر میں)، ڈاکٹر محمد اسلم (عصر حاضر میں پریم چند کے افسانوں کی معنویت)، ڈاکٹر شاہنواز حیدر شمسی (پریم چند کے افسانوں کی عصری حسیت) اور ڈاکٹر نسیم افضل (پریم چند کے مضامین: ایک مطالعہ) نے مقالات پیش کیے۔

یہ سمینار پریم چند کے فکر وفن کی تفہیم میں اہم کاوش کی حیثیت رکھتا ہے۔ سمینار میں مختلف یونیورسٹیوں کے مہمان مقالہ نگاروں کے علاوہ ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات موجود رہے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 29 اپریل 2026

قومی اردو کونسل میں لسانی ٹیکنالوجی کے ذریعے فروغِ اردو کے امکانات پر اہم میٹنگ

نئی دھلی: اردو زبان کو جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ہندوستان کی دیگر زبانوں سے قریب لانے اور اس کے فروغ کے نئے امکانات تلاش کرنے کے مقصد سے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں اے آئی پر مبنی لسانی ٹیکنالوجی کے موضوع پر دوسری میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال،

انووادنی فاؤنڈیشن کے چیف ایگزیکٹو آفیسر اور آل انڈیا کونسل برائے تکنیکی تعلیم، وزارت تعلیم، حکومت ہند کے چیف کوآرڈینیٹنگ آفیسر ڈاکٹر بدھا چندر شیکھر اور ان کے رفقا جناب گنیشن (نائب صدر، سیلس)، جناب نشانت، جناب اکشے کمار، جناب راگھو، جناب ساحر اور جناب ابھے وغیرہ شریک ہوئے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) جناب محمد احمد اور تمام افسران بھی موجود رہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے نوجوانوں کو اردو زبان سکھانے کے لیے شروع کیا گیا آن لائن اردو لرننگ پروگرام 2012 سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ اس پروگرام کے تحت ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے ہزاروں طلبہ مستفید ہو رہے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی اور موجودہ تعلیمی تقاضوں کے مطابق اس پروگرام کو مزید مؤثر، دلچسپ اور جاذب نظر بنانے کے پیش نظر اس کے موجودہ تعلیمی مواد کا جائزہ لینے کے لیے 06 مئی 2026 کو کونسل کے صدر دفتر، نئی دہلی میں ایک

اہم میٹنگ منعقد کی گئی۔ اس

میٹنگ میں بطور ایکسپرٹ پروفیسر غضنفر علی (سابق ڈائریکٹر، اکیڈمی آف پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو میڈیم ٹیچرز) اور پروفیسر روپ کرشن بھٹ (سابق پروفیسر، سی آئی آئی ایل میسور، وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند و سابق پرنسپل پبلیکیشن آفیسر، این سی پی یو ایل) شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ جناب سید محمد احمد (چیف ٹیکنالوجی آفیسر، ایڈوانس لیب فار انٹیلی جینس سسٹم ریسرچ، نئی دہلی) اور قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال، جناب کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) جناب شاہنواز خرم (ریسرچ آفیسر) اور جناب افضل حسین خان (ریسرچ اسسٹنٹ) موجود رہے۔

میٹنگ میں آن لائن اردو لرننگ پروگرام کے موجودہ اسباق، تدریسی طریقۂ کار، مشق، صوتی مواد، اور نئی نسل کی ضروریات کے مطابق ڈیجیٹل پلیٹ فارم کو مزید بہتر اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا گیا۔ ماہرین نے پروگرام کو زیادہ مؤثر، سائنٹفک اور صارف دوست بنانے کے لیے متعدد اہم تجاویز بھی پیش کی گئیں۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 6 مئی 2026

میٹنگ میں پی ڈی ایف فائلوں کو سرچ ایبل بنانے کا Demo کیا گیا اور آواز پر مبنی کثیر لسانی فارمز کے ذریعے سروے، فیڈ بیک اور عوامی رابطہ کاری کو آسان بنانے کے طریقوں پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ اس کے علاوہ گیمنگ کے ذریعے اردو رسم الخط سیکھنے اور سکھانے کے جدید طریقوں پر بھی گفتگو کی گئی۔

ڈاکٹر شمس اقبال نے اپنے خطاب میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں مادری زبانوں کے فروغ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ انووادنی پلیٹ فارم کے ذریعے نہ صرف اردو اور ہندی بلکہ دیگر ہندوستانی زبانوں کے توسط سے فاصلاتی تعلیم کے کورسز کو بھی مختلف زبانوں میں منتقل کیا جا سکے گا۔ اس عمل سے اردو زبان سیکھنے والوں کو آسانی ہوگی۔

میٹنگ میں اس امر پر اتفاق کیا گیا کہ جدید لسانی ٹیکنالوجیز کے استعمال سے اردو زبان کو ڈیجیٹل دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے، جس کے نتیجے میں ای۔ گورننس، تعلیمی مواد کی تیاری و ترجمہ اور قومی سطح پر لسانی شمولیت کو فروغ دینے کے وسیع امکانات پیدا ہوں گے۔ آخر میں انووادنی فاؤنڈیشن کے نمائندوں نے یقین دہانی کرائی کہ دیگر زبانوں کی طرح اردو مواد کو بھی مؤثر انداز میں مختلف زبانوں میں منتقل کر کے اسے قابلِ تلاش (searchable) بنایا جا سکتا ہے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل اور انووادنی کے درمیان باہمی تعاون کو مزید مستحکم بنانے اور مشترکہ منصوبوں کو آگے بڑھانے پر بھی اتفاق کیا گیا۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 4 مئی 2026

'بلیک بورڈ' کی تقریب اجرا و مذاکرہ

دھلی: 18 اپریل 2026 میونسپل کارپوریشن اسکول، حوض رانی، گاندھی پارک، نئی دہلی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام رسم اجرا و مذاکرہ کی تقریب منعقد کی

گئی جس میں کونسل سے شائع ہونے والی کہانی کی کتاب 'بلیک بورڈ' کا اجرا عمل میں آیا۔

اس تقریب کی صدارت ایم سی ڈی اسکول، حوض رانی (اردو) کے سابق پرنسپل جناب شوکت نے کی جب کہ شاہ حسن سیفی (رشین ایجوکیشن ایڈمیشن کونسلر، نئی دہلی) بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ مقررین کی حیثیت سے پروفیسر مظہر احمد (شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج، دہلی) اور ڈاکٹر معین الدین (شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج، دہلی) نے شرکت کی۔ اس موقعے پر 'بلیک بورڈ' کے مصنف ڈاکٹر حبیب سیفی، میونسپل کارپوریشن اسکول، حوض رانی (اردو) کے پرنسپل جناب نظام الدین اور ریسرچ اسسٹنٹ، این سی پی یو ایل، ڈاکٹر فیضان الحق کے علاوہ متعدد علمی و ادبی شخصیات اور اسکول کے طلبہ موجود رہے۔

استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر فیضان الحق نے قومی اردو کونسل کی مختلف سرگرمیوں کا ذکر کیا اور ادب اطفال سے متعلق ادارے کے فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال کی کاوشوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت ادب اطفال اور مادری زبان کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر حبیب سیفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کتاب کی اشاعت پر قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کیا اور ادب اطفال کے تئیں ادارے کی سنجیدہ کوششوں کو قابل قدر قرار دیا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی کہانی 'بلیک بورڈ' بھی پیش کی۔

کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے پہلے مقرر پروفیسر مظہر احمد نے مصنف کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ حبیب سیفی نے بلیک بورڈ کو زبان دے کر بچوں سے مکالمہ قائم کیا ہے۔ ادب اطفال کی تخلیق سے متعلق مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بچوں کے لیے لکھتے ہوئے زبان و اسلوب اور تحیر و تجسس پر توجہ دینی ضروری ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بچوں کے معروف ادیب و قلمکار اشرف صبوحی کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے ادب اطفال کے تئیں قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے ایک اہم کارنامہ قرار دیا۔ دوسرے مقرر ڈاکٹر معین الدین نے کتاب 'بلیک بورڈ' پر اظہار خیال کرتے ہوئے بچوں کی تربیت پر زور دیا اور کہا کہ یہی بچے ملک و قوم کی تعمیر کی بنیاد ہیں اس لیے ان کی فکر کرتے ہوئے معیاری ادب اطفال کی تخلیق ضروری ہے۔ انھوں نے بلیک بورڈ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسی طرح مثبت کردار اور مثبت پیغام پر مبنی مزید کہانیاں لکھنے کی ضرورت ہے۔

مہمان خصوصی شاہ حسن سیفی نے تقریب کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر حبیب سیفی کو مبارکباد پیش کی اور اس اہم تقریب کے انعقاد کے لیے قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کیا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے جناب شوکت نے نئی نسل میں اردو کے فروغ کی اہم کوششوں پر خوشی کا اظہار کیا اور صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان کے زندہ رہنے کے لیے اس زبان میں معیاری ادب اطفال کی تخلیق ضروری ہے۔ یہ تقریب جناب نظام الدین کے کلمات تشکر پر اختتام پذیر ہوئی۔ نظامت کے فرائض محترم عرفان راہی نے انجام دیے۔

رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 18 اپریل 2026

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی Bogota International Book Fair 2026 (کولمبیا) میں شرکت

بوگوٹا عالمی کتاب میلہ 2026 کے موقع پر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، وزارت تعلیم، حکومت ہند اور ہندوستانی سفارت خانہ کی جانب سے سجائی گئی 'انڈیا پویلین' میں قومی اردو کونسل کی شاندار شرکت رہی۔ اس موقع پر ہزاروں شائقین کتب نے این سی پی یو ایل کے اسٹال کا دورہ کیا اور اردو زبان سیکھنے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ 20 اپریل 2026 سے شروع ہونے والا یہ بین الاقوامی میلہ 4 مئی 2026 کو اختتام پذیر ہوا۔ اس میلے میں ہندوستان نے بطور گیسٹ آف آنر شرکت کی۔ یہ میلہ لاطینی امریکہ میں اردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے ایک اہم عالمی پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتا ہے۔ رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 5 مئی 2026)

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبر نامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی و ثقافتی سرگرمیوں، تنوع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی و ثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درجہ ذیل ای۔میل editor@ncpul.in | urdudunyancpul@yahoo.co.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

دہلی

امیر خسرو اور ہندوستانی تہذیب وثقافت

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام امیر خسرو یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ یہ خطبہ ایک زمانے

سے ہوتا آرہا ہے اور ہر بار خسرو سے متعلق ہی گفتگو ہوتی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تشنگی ابھی باقی ہے۔ اس کا سبب ان کی ہمہ پہلو شخصیت ہے جس کے تمام پہلو ابھی تک واضح نہیں ہو سکے ہیں۔ خطبے کی صدارت معروف ادیب و نقاد پروفیسر انور پاشا نے کی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ امیر خسرو ایک جامع کمالات شخصیت کا نام ہے۔ وہ شاعری موسیقی اور دیگر علوم میں غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ امیر خسرو نے سات بادشاہوں کا دور دیکھا اور درباری لحاظ سے بھی فعال رہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ انھیں پانچ دیوان دس مثنویاں اور نثر میں بھی تین کتابیں لکھنے کی مہلت کیونکر میسر آئی جو کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے غیر معمولی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اردو کا ایک سرگرم ادارہ ہے جو ہر سال امیر خسرو یادگاری خطبے کا اہتمام کرتا ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اس خطبے کے لیے کسی علمی شخصیت کی خدمات حاصل کی جائیں۔ پروفیسر اخلاق آہن کو دعوت دینے کا ایک مقصد یہ ہے کہ امیر خسرو پر گفتگو کے لیے اردو کی کلاسیکی روایت کے ساتھ فارسی سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ اردو فارسی پروفیسر اخلاق آہن نے 'امیر خسرو اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت' کے عنوان سے خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب میں خسرو کی ادبی میراث پر نظر کرتا ہوں تو میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے کس کام کو فوقیت دوں۔ انھوں نے ایک طرف نثر میں 'اعجاز خسروی'، 'خزائن الفتوح' اور 'افضل الفوائد' جیسی بے مثال تصنیف چھوڑیں اور دوسری طرف 'نہ سپہر' جیسی لازوال مثنوی سے یہاں کی شعری روایت کو عروج بخشا۔ 'نہ سپہر' ایسی مثنوی ہے جس کے بارے میں اپنی ثروت مند روایت کا احساس ہونے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ ایسی مثنوی ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ اس مثنوی کا بھی تیسرا سپہر جو ہمارے ملک ہندوستان سے متعلق ہے، بطور خاص متاثر کرتا ہے۔ ہمیں آئندہ نسل کی تربیت اس انداز سے کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ عصری تقاضوں کے ساتھ اپنی علمی روایت سے بھی واقف ہو۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 اپریل 2026

اردو اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج (صبح) کے شعبۂ اردو میں 'اردو اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی' کے موضوع پر ایک اہم علمی لیکچر کا انعقاد کیا گیا، جس میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مرکز برائے ہندوستانی زبانیں و شعبۂ اردو سے وابستہ ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر پرویز احمد نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ لیکچر میں طلبہ و طالبات کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور اردو زبان و ادب سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر پرویز احمد نے اردو کے فروغ، مشینی ترجمہ، لسانیات اور جدید اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں زبان و ادب کے طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جدید تقاضوں کو سمجھیں اور ٹیکنالوجی سے بھرپور استفادہ کریں۔ انھوں نے طلبہ کو درپیش تعلیمی مسائل پر بھی گفتگو کی اور رہنمائی فراہم کی۔ اس موقعے پر طلبہ و طالبات نے مختلف سوالات کیے، جن کے انھوں نے تسلی بخش جوابات دیے۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر جعفر احراری نے ڈاکٹر پرویز احمد سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی علمی و ادبی خدمات اور اعلیٰ اخلاق کی ستائش کی۔ پروگرام میں شعبۂ اردو کے اساتذہ کے ساتھ طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اپریل 2026

کروڑی مل کالج میں سالانہ 'سمفنی' میلے کا انعقاد

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج میں فارن اسٹوڈنٹس کمیٹی کے زیر اہتمام سالانہ میلہ 'سمفنی' کا انعقاد کیا گیا۔ اس سال پروگرام کا مرکزی موضوع 'وسودیو کٹمبکم: دنیا ایک خاندان ہے' رہا، جس نے عالمی

یکجہتی اور ثقافتی ہم آہنگی کے پیغام کو موثر انداز میں پیش کیا۔ تقریب میں تقریباً 10 ممالک سے تعلق رکھنے والے 50 سے زائد غیر ملکی طلبہ نے شرکت کی۔ کمبوڈیا، بنگلہ دیش، سری لنکا، تھائی لینڈ اور مختلف افریقی ممالک کے طلبہ نے اپنی ثقافت، روایتی رقص اور موسیقی کے ذریعے رنگارنگ پروگرام پیش کیے، جس سے ماحول بین الاقوامی رنگ میں ڈھل گیا۔ اس موقعے پر دہلی یونیورسٹی کی کلچرل کونسل کے صدر اور پبلک ریلیشنز آفیسر انوپ لاتھیر بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی یونیورسٹی دنیا بھر کے طلبہ کے لیے مواقع کا مرکز ہے اور یہاں کا کثیر الثقافتی ماحول طلبہ کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر دنیش کھٹر نے اپنے استقبالیہ خطاب میں کہا کہ کروڑی مل کالج نہ صرف تعلیمی امتیاز کا حامل ادارہ ہے بلکہ عالمی بھائی چارے اور ثقافتی ہم آہنگی کے فروغ کا ایک مضبوط پلیٹ فارم بھی ہے۔ انھوں نے غیر ملکی طلبہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ادارے کے عزم کا اعادہ کیا۔ فارن اسٹوڈنٹس کونسل کی جوائنٹ ڈین شالینی بخشی نے کہا کہ یونیورسٹی غیر ملکی طلبہ کے لیے محفوظ، معاون اور مثبت تعلیمی ماحول فراہم کرنے کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ فارن اسٹوڈنٹس کمیٹی کے رکن ڈاکٹر ندیم احمد نے کہا کہ 'سمفنی' جیسے پروگرام مختلف ثقافتوں کے درمیان پل کا کردار ادا کرتے ہیں، جب کہ کنوینر ڈاکٹر وید پرکاش نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ پروگرام تنوع میں اتحاد کا عملی مظہر ہے۔ پروگرام کے دوران مختلف ممالک کے طلبہ نے اپنے روایتی فنون، موسیقی اور رقص کے ذریعے اپنی تہذیبی شناخت پیش کی۔ اس موقعے پر غیر ملکی طلبہ کے لیے تین روزہ تعلیمی مطالعاتی دورے کا بھی اعلان کیا گیا، جسے شرکا نے سراہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2026

ہندوستان میں مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں خانقاہوں کا کردار

نئی دھلی: سینٹر فار صوفی اسٹڈیز (مرکز مطالعاتِ تصوف)، جامعہ ہمدرد کے زیر اہتمام تیغ برہنہ سہروردیہ فاؤنڈیشن، ادونی کے اشتراک سے 'ہندوستان میں مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں خانقاہوں کا کردار' کے عنوان سے جامعہ ہمدرد کے کنونشن سینٹر میں ایک روزہ

قومی سمینار کا کامیاب انعقاد کیا گیا، جس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، عالیہ یونیورسٹی کولکاتا، ذاکر حسین کالج دہلی سمیت متعدد جامعات کے پروفیسرز، ڈاکٹرز اور ریسرچ اسکالرز نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سمینار کے مختلف علمی اجلاسوں میں تقریباً ستر تحقیقی مقالات پیش کیے گئے۔ اجلاس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر افشار عالم نے کی، جب کہ سید مولانا محمد نوید ادونی مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ مہمانانِ اعزازی میں مفتی حماد احمد، پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر بشیر احمد خان شامل تھے۔ ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد احمد نعیمی نے انجام دیے۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر افشار عالم نے کہا کہ صوفیا کرام نے ہمیشہ بلاتفریق مذہب وملت محبت، اخوت، امن وآشتی اور خدمتِ خلق کو فروغ دیا ہے۔ موجودہ دور میں ان تعلیمات کو عملی طور پر عام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ مہمانِ خصوصی سید مولانا محمد نوید ادونی نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج عالمی سطح پر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مشائخ اور صوفیا خانقاہوں سے نکل کر سماجی میدان میں فعال کردار ادا کریں اور معاشرے میں باہمی رواداری، اخوت اور امن کو فروغ دیں۔ پروفیسر بشیر احمد خان نے صوفیا کرام کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے بانی جامعہ ہمدرد حکیم عبدالحمید کے صوفیا سے تعلق کا ذکر کیا اور ان کی خدمات کو صوفیانہ روایت کا تسلسل قرار دیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ تصوف کی تاریخ نہایت قدیم ہے اور ہر دور میں صوفیا کرام نے معاشرے کی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سمینار کے دوران نمازِ ظہر سے قبل اور بعد مختلف ہالز میں متعدد علمی نشستیں منعقد ہوئیں، جن میں تقریباً ستر تحقیقی مقالات پیش کیے گئے اور شرکا نے بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اختتامی اجلاس شام چار بجے منعقد ہوا جس میں پروفیسر عبیداللہ فہد نے نصیحت آمیز خطاب کرتے ہوئے صوفیا کرام کی تعلیمات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ پروفیسر مسعود انور علوی نے مختصر اظہارِ خیال پیش کیا۔ سہروردیہ فاؤنڈیشن کے نائب صدر مفتی فیض محمد شکیل خان نے صوفیانہ تعلیمات کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت پر زور دیا اور سمینار کے کامیاب انعقاد پر منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ سید مولانا محمد نوید ادونی نے بھی اپنے اختتامی کلمات میں صوفیانہ تعلیمات کے فروغ پر زور دیا اور جامعہ ہمدرد اور مرکز مطالعاتِ تصوف کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں ڈاکٹر آبرو امان اندرابی نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 1 مئی 2026

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام آن لائن اردو، فارسی کلاسز کا افتتاح

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں یکم مئی سے آن لائن اردو، فارسی کلاسز کا آغاز ہوگیا ہے۔ ان کلاسز کا مقصد اردو، فارسی کے مبادیات سے لوگوں کو واقف

کرانا ہے۔ آج جلسے کی صدارت ہمالیہ گروپ کے صدر ایس فاروق نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ زبان ہماری بنیادی ضرورت ہے، مثلاً میں پیشے سے ایک تاجر ہوں اگر مجھے اس زبان پر قابو نہیں ہوگا جس میں مجھے اپنی بات کہنی ہے یا دوسرے کو سمجھانی ہے تو میں اپنے پیشے کا بھی حق ادا نہیں کرسکتا۔ انسان جتنی زیادہ زبانوں کو جانتا ہے، اس کی شخصیت میں اتنا ہی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد

نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں اردو، فارسی اور موسیقی کی کلاسز کا سلسلہ نیا نہیں ہے، پچھلی بار جن لوگوں نے اس کورس میں حصہ لیا، ان کی پیش رفت کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور حوصلہ بھی ملا۔ اردو، فارسی کے استاد طاہرالحسن نے بڑی محنت سے طلبا کو تعلیم دی اور مشق کرائی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس بار کا سیشن بھی پہلے کی طرح کامیاب رہے گا۔ اردو فارسی کے استاد طاہرالحسن نے کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے۔ اس کے سیکھنے سے شخصیت میں کشش پیدا ہوتی ہے اور فارسی کے ساتھ سیکھنا زبان کی کئی باریکیوں کو آسان بنا دیتا ہے۔ ڈاکٹر شعیب رضا وارثی نے کلاسیز کا باقاعدہ افتتاح کیا اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہر عمارت کی بنیاد بہت اہم ہوتی ہے، بنیاد جتنی مضبوط ہوگی، عمارت بھی اتنی ہی مستحکم ہوگی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے عالمی معیار کے مذاکرے منعقد کرائے ہیں لیکن مجھے خوشی ہے کہ یہاں بیسک تعلیم کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ اردو کی کلاس آن لائن ہفتے میں تین دن دوشنبہ، منگل اور بدھ اور فارسی کی کلاسز ہفتے میں دو دن جمعرات اور جمعہ کو شام پانچ بجے آن لائن ہوں گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 مئی 2026

محمد برکتہ کے ناولوں میں مشرق و مغرب کا تصادم اور 'میں' و 'دوسرے' کا تصور

نئی دہلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے زیر اہتمام ریسرچ فورم عربی کلب کی جانب سے اسکالرز کا ماہانہ سیمینار منعقد ہوا۔ سیمینار کا مرکزی موضوع 'محمد برکتہ کے ناولوں میں مشرق و مغرب کا تصادم اور 'میں' و 'دوسرے' کا تصور' تھا۔ تقریب کی نظامت شعبۂ عربی کے پی ایچ ڈی اسکالر محمد قاسم نے انجام دی جب کہ صدر شعبہ پروفیسر محمد قطب الدین نے مہمانِ خصوصی، صدر اجلاس، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز طلبہ، اور حاضرین کا خیر مقدم کیا اور سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں ڈاکٹر محمد اجمل نے صدر اجلاس ڈاکٹر اورنگ زیب الاعظمی، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعارف پیش کیا۔ اس موقع پر مقرر خصوصی مہتاب عالم نے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے عربی کے معروف ادیب محمد برکتہ کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مشرق و مغرب کے درمیان فکری اور تہذیبی کشمکش کو نمایاں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان ناولوں میں محض جغرافیائی یا ثقافتی اختلاف نہیں بلکہ 'میں' اور 'دوسرے' کے درمیان ایک گہرا نفسیاتی اور فکری تصادم بھی موجود ہے۔ مقالے کے بعد اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کی جانب سے سوالات پیش کیے گئے، جن کے مہتاب عالم نے مدلل جوابات دیے۔ ڈاکٹر عبدالقدوس نے اس موقع پر کہا کہ اس نوعیت کے تحقیقی پروگرام طلبہ میں علمی و تحقیقی ذوق کو فروغ دیتے ہیں اور عربی ادب کے نئے پہلوؤں کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اختتام پر صدر اجلاس ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی نے اپنے صدارتی کلمات میں مقالے کے موضوع، اندازِ پیشکش اور تحقیقی گہرائی کو سراہا اور کہا کہ مقرر نے سنجیدگی اور وسعتِ مطالعہ کے ساتھ موضوع کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مطالعہ اور تخلیق کا عمل انسان کو ممتاز بناتا ہے، اس لیے علمی جستجو جاری رکھنی چاہیے۔ آخر میں عربی فورم جے این یو کے جنرل سکریٹری ابوسعید نے مہمانِ خصوصی، صدر اجلاس اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2026

معاصر میڈیا میں اردو کی اہمیت و افادیت

نئی دہلی: اردو میڈیا ایسوسی ایشن اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے زیر اہتمام معروف صحافی ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز (ایڈیٹر گواہ) کے اعزاز میں مجلس تکریم اور مذاکرہ بعنوان 'معاصر میڈیا میں اردو کی اہمیت و افادیت' کا انعقاد کیا گیا۔ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے صدر دفتر جامعہ نگر میں منعقد اس تقریب کی صدارت مجلس کے صدر فیروز احمد ایڈوکیٹ نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض عبدالباری مسعود نے انجام دیے۔ اس موقعے پر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے معاصر میڈیا میں اردو کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی اہمیت پہلے بھی مسلم تھی اور آج بھی برقرار ہے اور معاصر میڈیا اردو کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کو نئی دنیا فاؤنڈیشن کی جانب سے مولانا عبدالوحید صدیقی ایوارڈ برائے صحافت ملنے پر مبارکباد بھی پیش کی اور کہا کہ اردو صحافت آج بھی اپنی افادیت کے ساتھ قائم ہے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز نے اردو صحافت کے مستقبل کو تابناک قرار دیا۔ صدر مجلس فیروز احمد ایڈوکیٹ نے اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز نے کہا کہ تمام تر مشکلات کے باوجود اردو صحافت کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دیگر مقررین میں مجلس کے نائب صدر نوید حامد اور عظیم اختر شامل تھے، جنھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو زبان اور صحافت کی موجودہ صورت حال اور اس کے مستقبل پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 اپریل 2026

رشید احمد شیروانی کی حیات و خدمات

نئی دہلی: بھات سیوا ٹرسٹ اور شیروانی فیملی کی جانب سے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں ممتاز ماہر تعلیم احمد رشید شیروانی کی حیات و خدمات کا یادگاری جشن منعقد کیا گیا۔ واضح رہے کہ احمد رشید شیروانی کا انتقال 23 فروری 2026 کو حیدرآباد میں ہوا تھا۔

تقریب کا آغاز ان کی بیٹی آمنہ شیروانی کے خطاب سے ہوا، انھوں نے اپنے والد کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اے آر شیروانی نے مختلف فکری اور سیاسی دھاراؤں سے گزر کر اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس مقصد کے لیے وقف کردی کہ مسلمان اس ملک کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور مثبت کردار ادا کریں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ملک ہے تو ہم سب ہیں اور اسی سوچ کے تحت انھوں نے ذاتی زندگی پر قومی مفاد کو ترجیح دی۔ بہار کے سابق گورنر عارف محمد خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ مرحوم احمد رشید شیروانی کی زندگی، کامیابیوں اور جدوجہد کے جذبے کا جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا، جو نہایت مثبت اور قابل ستائش قدم ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ احمد رشید شیروانی نے ہماری زندگیوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ طویل عرصے تک وہ ہماری یادوں اور ذہنوں میں زندہ رہیں گے۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم کی زندگی ہمیں مسلسل یہ ترغیب دیتی رہے گی کہ ہم صرف اپنی ذات

تک محدود نہ رہیں، بلکہ سماج اور ملک کے لیے بھی سوچیں اور مثبت کردار ادا کریں۔ سابق مرکزی وزیر سلیم اقبال شیروانی نے اپنے چچا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رنگارنگ شخصیت ہی ان کی سب سے بڑی پہچان تھی اور وہ غیر معمولی طور پر بذلہ سنج انسان تھے۔ بزرگ صحافی شاہد صدیقی نے کہا کہ وہ ان کی نسل کے لیے ایک بڑی ترغیب اور رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر خواجہ محمد شاہد نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک آزاد خیال، وسیع النظر اور کھلے ذہن کے مالک تھے اور ہمیشہ مسلم بچوں کی تعلیم کے لیے بے حد فکر مند رہتے تھے۔ وہ مختلف اسکولوں سے طلبہ کے نتائج منگوا کر ان کا باریک بینی سے تجزیہ کرتے اور بہتری کے لیے مفید مشورے دیتے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر تعلیم کے فروغ اور نئی نسل کی رہنمائی کو اپنا مشن بنائے رکھا۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ شیروانی صاحب کو میں نے تقریباً چالیس برس تک ایک صحافی کے طور پر قریب سے دیکھا۔ اس دوران سیکڑوں ملاقاتیں ہوئیں، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی اور کبھی کبھار اختلاف بھی ہوا۔ وہ ڈانٹتے بھی تھے اور شفقت بھی کرتے تھے۔ ان کی سب سے نمایاں خوبی ان کی جرأت مندی تھی۔ وہ جس کمیونٹی میں رہتے تھے، اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کرنے سے نہیں جھجکتے تھے، جب کہ عام طور پر لوگ اپنی کمیونٹی کے بارے میں کھل کر تنقید کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ معصوم مرادآبادی نے مزید کہا کہ احمد رشید شیروانی ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کے اندر ایک مزاح نگار چھپا بیٹھا تھا۔ اگر ان کے لکھے ہوئے مراسلوں کو یکجا کیا جائے تو طنز و مزاح کی بہترین کتاب وجود میں آسکتی ہے۔ اس موقعے پر ایڈوکیٹ اعجاز مقبول، صحافی جاوید انصاری، مہیش شرما، علیزہ نور خاں، سعید اور اعجاز نے بھی اظہار خیال کا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اپریل 2026

لٹریری ایکوز 2026

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج میں پہلی مرتبہ یک روزہ ادبی میلہ 'لٹریری ایکوز 2026' کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی یونیورسٹی سے وابستگی کے صد سالہ سفر کی جھلک نمایاں رہی۔ کالج کے اردو، عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، بنگالی، اور سنسکرت کے شعبہ جات نے مشترکہ طور پر اس میلے کا اہتمام کیا جو صبح 9 بجے سے شام 5 بجے تک جاری رہا۔ اس موقعے پر مختلف ادبی و ثقافتی پروگراموں کا انعقاد کیا گیا، جن میں رقص، غزل سرائی، بیت بازی، مضمون نگاری، ادبی کوئز، خطاطی، مباحثہ، خطابت، پترا واچن، شلوک واچن اور شلوک لکھن شامل تھے۔ طلبہ و طالبات نے بھرپور جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور اپنی تخلیقی و فکری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جسے حاضرین نے سراہا۔ شعبۂ اردو کے پروگرام کی صدارت پروفیسر محمد جعفر احراری نے کی، جب کہ بزم ادب کے صدر ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ کی نگرانی میں مقابلہ جاتی سرگرمیاں ہوئیں۔ غزل سرائی کے مقابلے میں انیسہ نظامی نے پہلی، محمد شارق رضا نے دوسری اور محمد صفوان نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ انٹر کلاس بیت بازی میں نمرہ ناز، کیف مسعودی اور افراح تبسم کی ٹیم اول رہی، جب کہ محمد فیصل خان، رخشندہ اور معظم اقبال کی ٹیم دوسری اور محمد سہیل، محمد ہمایوں عبداللہ اور شائستہ پر مشتمل ٹیم تیسرے مقام پر رہی۔ ان مقابلوں میں شعبۂ اردو کے اساتذہ ڈاکٹر محمد اعلم شمس، ڈاکٹر محمد معین الدین خان، ڈاکٹر شاہانہ بیگم اور ڈاکٹر محمد مستمر نے جج کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر محمد جعفر احراری نے اپنے صدارتی خطاب میں طلبہ کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اسی طرح شعبۂ عربی کا پروگرام بھی توجہ کا مرکز رہا۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ نے کہا کہ نصابی تعلیم کے ساتھ عملی مہارتوں کا حصول نہایت ضروری ہے اور اضافی سرگرمیاں طلبہ کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد طارق نے عربی کیلی گرافی، خطابت اور شاعری کے مقابلوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں خطاطی، شاعری اور خطابت کے مقابلے منعقد ہوئے، جن میں تقریباً پچاس طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ کیلی گرافی میں ڈاکٹر عبدالملک اور ڈاکٹر ہدیٰ کاظمی، خطابت میں ڈاکٹر قمرالدین اور ڈاکٹر نسیم احمد، جب کہ شعری مقابلے میں ڈاکٹر عبدالملک اور ڈاکٹر محمد عرفان ایاز نے جج کے فرائض انجام دیے۔ نتائج کے مطابق شعری مقابلے میں محمد طالب اول، تسبیحہ نور دوم اور علینہ مرزا سوم رہیں، جب کہ تقریری مقابلے میں حافظ محمد معاذ فاروقی نے پہلی، محمد شفیع عالم نے دوسری اور زینت نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اختتامی مرحلے میں ڈاکٹر محمد قاسم عادل نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی، جب کہ ڈاکٹر محمد عرفان ایاز اور ڈاکٹر ہدیٰ کاظمی نے مفید مشورے دیے۔ صدر شعبۂ ڈاکٹر محمد عبیداللہ نے تمام منتظمین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2026

'ہند و عرب تعلقات کے محرکات' کے عنوان پر بارہواں شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر

نئی دہلی: شعبۂ عربی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے زیر اہتمام 'ہند و عرب تعلقات کے محرکات' کے عنوان پر بارہواں شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر شوبھا شیواشنکرن، ڈین، اسکول آف لینگویجز نے کی جب کہ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر خورشید امام نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ نشست کے آغاز میں صدر شعبہ پروفیسر محمد قطب الدین نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی علمی و فکری وراثت کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد پروفیسر مجیب الرحمٰن نے کلیدی خطیب پروفیسر ہمایوں اختر ندوی، اعزازی ڈائرکٹر سینٹر آف ویسٹ ایشیا جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور ان کی علمی و تحقیقی خدمات کو سراہا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں برصغیر میں بیداریِ نو کا علمبردار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی تعلیمات کا مرکز مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح اور عقلی بنیادوں پر دین کی تفہیم تھا، تاکہ وہ سیاسی اور سماجی چیلنجز کا موثر مقابلہ کرسکیں۔ پروگرام کی صدر پروفیسر شوبھا شیواشنکرن نے صدارتی کلمات میں مقرر کے جامع اور اہم خطاب کی ستائش کی اور کہا کہ موضوع نہایت وسیع اور موجودہ حالات کے تناظر میں حساس تھا، لیکن اسے نہایت علمی انداز میں پیش کیا گیا، جو قابل تعریف ہے۔ انھوں نے اس پروگرام کے انعقاد پر شعبہ کو مبارکباد بھی دی۔ اختتامی کلمات پروفیسر رضوان الرحمٰن پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2026

اتر پردیش

محققین و ناقدین غالب

میرٹھ: اگر ہم نے غالب کو سمجھ لیا تو میر کو بھی سمجھیں گے اور حالی کو بھی۔ اگر غالب کو نہ سمجھا تو میر کو بھی نہیں

سمجھ پائیں گے۔ اس وقت بھی غالب کے سات سو سے زائد ایسے اشعار ہیں جن کو ہم ضمناً کہہ سکتے ہیں اور تقریباً اٹھارہ سو کتابیں غالب پر موجود ہیں۔ غالب کی ترقی پسندی پر کوئی خاص کتاب نہیں ہے۔ غالب کا بہت سا کلام غائب ہے، اس پر تحقیق نہیں ہوئی۔ ہم ابھی تک یہ تحقیق نہیں کر سکے کہ غالب انگریزوں کا دوست تھا یا نہیں یہ الفاظ تھے معروف محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد 'محققین و ناقدین غالب' موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمارا پہلا ادب کا ترقی پسند شاعر غالب ہے۔ غالب غزلوں میں انسانی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض بین الاقوامی شہرت یافتہ محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے انجام دیے۔ خصوصی مقرر کے بطور معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے شرکت فرمائی۔ مقررین کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین اور ڈاکٹر مجیب شہزر، علی گڑھ موجود رہے۔ مقالہ نگار کے بطور فرحت اختر، میرٹھ، عرفان عارف، جموں اور عادل فراز علی گڑھ نے شرکت فرمائی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم محمد عابد نے انجام دی۔ اس موقعے پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ غالب پر بہت ریسرچ ہو چکی ہے مگر ابھی بھی بہت سے گوشوں پر تحقیق ہونا باقی ہے۔ غالب کے خطوط کا ادب میں بڑا مقام ہے۔ غالب کی یہ خوش نصیبی ہے جو غالب کو حالی جیسا ناقد ملا اور یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم غالب جیسے بڑے شاعر پر پروگرام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر مجیب شہزر نے کہا کہ پروفیسر صغیر افراہیم غالب کے ایک منفرد محقق ہیں۔ آپ نے غالب کی تحقیق میں ایسا اسلوب اختیار کیا کہ غالب کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ غالب شناسی پر محققین نے اپنی کوشش کے رنگ بھرے ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے باندہ کی اچھی تصویر کشی کی ہے اور دیوان محمد علی کو لکھے گئے پینتیس خطوط پر صغیر افراہیم نے خاصی تحقیق کی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 اپریل 2026

زمانۂ جاہلیت میں عربی تنقید

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں وائس چانسلر پروفیسر اجے تمیجا کی نگرانی میں زمانہ جاہلیت میں عربی تنقید کے موضوع پر ایک توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ اس علمی نشست کا مقصد طلبہ و طالبات کو عربی ادب کے ابتدائی تنقیدی شعور، اس کی فکری و فنی جہات اور بالخصوص جاہلی شاعری میں موجود تنقیدی اصولوں اور معیارات سے روشناس کرانا تھا۔ اس موقعے پر شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر عبدالحفیظ نے خطبے کے بنیادی مقاصد پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس پروگرام کا اصل ہدف طلبہ کو زمانۂ جاہلیت کے عربی ادب میں تنقید کی قدیم روایت، اس کے فکری پس منظر، فنی محاسن اور عربی شاعری میں اس کے نمایاں تنقیدی پہلوؤں سے آگاہ کرنا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس خطبے کے ذریعے طلبہ کو تنقید کی اہمیت، ایک اچھے ناقد کی بنیادی صفات اور نقد کی مختلف اقسام سے متعارف کرایا گیا تاکہ ان میں ادبی متون کو سمجھنے، پرکھنے اور ان کے حسن و قبح کو علمی انداز میں جانچنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ریاض احمد شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں اس موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زمانۂ جاہلیت میں عربی تنقید نے بعد کے ادبی ادوار کے لیے بنیادی اصول فراہم کیے۔ اس دور میں شعر کی فصاحت، بلاغت، اسلوب، معانی کی گہرائی اور تاثیر کو معیار بنا کر جانچا جاتا تھا جس سے عربی ادب میں تنقیدی شعور کی ایک مضبوط روایت قائم ہوئی۔ خطبے میں اس امر پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی کہ زمانۂ جاہلیت میں عربی تنقید محض عیب جوئی یا سطحی تبصرے تک محدود نہیں تھی بلکہ اس میں فصاحت، بلاغت، اسلوب، معنی آفرینی، تشبیہ و استعارات، اور شعری تاثیر جیسے عناصر کو بڑی باریک بینی سے دیکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ریاض احمد نے خطبے کے اختتام پر طلبہ کو یہ احساس دلایا کہ عربی تنقید کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے زمانۂ جاہلیت کا مطالعہ ناگزیر ہے، کیونکہ یہی وہ دور ہے جہاں سے عربی ادب میں تنقیدی شعور کی ابتدا ہوئی اور جس نے بعد کے ادبی نظریات و مباحث کو فکری سمت عطا کی۔ اس کی نظامت ڈاکٹر مزمل کریم اور شکریے کے کلمات ڈاکٹر محمد مدثر نے انجام دیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 اپریل 2026

عربی، اردو و فارسی زبان کا ادبی و شعری سرمایہ

علی گڑھ: شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں بی اے عربی اور ایم اے عربی کے طلبہ و طالبات کی انجمن 'النادی العربی' اور شعبہ کے ریسرچ اسکالرز کی تنظیم 'منتدی الباحثین' کا ایک مشترکہ علمی اجلاس منعقد ہوا، جس کے مہمان خصوصی، یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق استاذ، ممتاز نقاد، محقق و ادیب اور ماہر جمالیات پروفیسر قاضی جمال حسین تھے۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد فیضان بیگ نے شعبۂ عربی کی تاریخ، خدمات اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی زبان و ادب کی وابستگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اے ایم یو کے شعبہ عربی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی اس یونیورسٹی کی تاریخ قدیم ہے۔ انھوں نے مہمان مقرر کا تعارف کرایا۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے اپنے پرمغز لیکچر میں عربی ادب کے طلبہ کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنے اندر ایسا ادبی ذوق پیدا کریں جس سے کسی بھی ادبی شہ پارے کے محاسن کو آنکنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے، یہی ادب کے مطالعہ کا اصل مقصد ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے عربی زبان کے جاہلی اور کلاسیکی دور کے بعض شعرا کے کلام کو بطور مثال پیش کر کے ادبی محاسن کے مختلف پہلوؤں کو نہایت دلچسپ اور موثر انداز میں اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ عربی زبان آج ایک عالمی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، اگر تاریخ کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو یقیناً یہ دنیا کی نہایت اعلیٰ اور قدیم ترین زبان ہے نیز جب یہ قدیم زبان ہے تو اس کا ادبی سرمایہ بھی بہت قدیم ہے، اس لیے ہمیں اس کے ادبی سرمایہ کو اچھی طرح سیکھنا اور اس کی حفاظت کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور فارسی جیسی زبانوں نے دراصل اپنی فنی حیثیت عربی ہی سے کسب کی ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے مزید کہا کہ ہم چونکہ ادب کے طالب علم ہیں اس لیے ہمیں دوسری زبانوں خصوصاً فارسی اور اردو زبان کے ادب کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے، اس حوالے سے انھوں نے عربی، فارسی اور اردو زبان کے شعرا جیسے میر، غالب، جگر، رومی، سعدی اور امرؤ القیس کے اشعار کو پیش کرتے ہوئے ان کے معانی اور مطالب بھی بیان کیے۔ نظامت کے فرائض خالد سیف اللہ نے ادا کیے جب کہ محمد شاہد

نے پروگرام کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ جلسے کا اختتام شعبہ عربی کے استاذ ڈاکٹر احسان اللہ خان کے کلمات تشکر پر ہوا۔ پروگرام میں شعبۂ عربی کے طلبہ و طالبات کثیر تعداد میں شامل ہوئے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 اپریل 2026

فارسی اور عربی ترجمے کے فن میں ڈیجیٹل اثاثوں کی اہمیت

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ کے شعبۂ فارسی نے شعبۂ اردو کے اشتراک سے 'فارسی اور عربی ترجمے کے فن میں ڈیجیٹل اثاثوں کی اہمیت' کے عنوان پر ایک اہم توسیعی خطبے کا انعقاد کیا۔ پروگرام کے آغاز میں شعبۂ فارسی کے انچارج ڈاکٹر عارف عباس نے استقبالیہ وتعارفی کلمات میں کہا کہ عصر حاضر علم و ادب کی دنیا میں تیز رفتار ڈیجیٹل تبدیلی کا عہد ہے، جہاں کلاسیکی زبانوں کے نادر متون، مخطوطات، لغات، تفاسیر اور دیگر علمی ذخائر کو ڈیجیٹل صورت میں محفوظ کر کے وسیع پیمانے پر قابل رسائی بنایا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فارسی اور عربی جیسی عظیم تہذیبی و علمی زبانوں کے ترجمے میں ڈیجیٹل اثاثے مترجمین کے لیے نہ صرف نئی سہولتیں فراہم کر رہے ہیں بلکہ تحقیق اور تقابلی مطالعے کے بے شمار امکانات بھی روشن کر رہے ہیں۔ ان وسائل کی بدولت مختلف نسخوں تک فوری رسائی، اصطلاحات کے درست انتخاب، معنوی تہہ داری کے ادراک اور تہذیبی وثقافتی سیاق کی صحت مند منتقلی میں نمایاں آسانی پیدا ہوئی ہے۔ ڈاکٹر عارف عباس نے زور دے کر کہا کہ موجودہ دور میں ترجمے کے فن کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ڈیجیٹل مہارت ایک ناگزیر ضرورت بن چکی ہے اور اس نوع کے علمی خطبات، طلبہ محققین اور نوآموز مترجمین کو جدید علمی وفنی جہات سے روشناس کرانے میں نہایت موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ صدر شعبہ اور ڈین پروفیسر ثوبان سعید نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ موجودہ ڈیجیٹل عہد میں علمی، ادبی اور لسانی وسائل کی نئی جہات سامنے آئی ہیں۔ فارسی اور عربی جیسی عظیم تہذیبی زبانوں کے تراجم میں ڈیجیٹل اثاثوں کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مخطوطات، نادر کتب، لغات، صوتی و بصری مواد، آن لائن کارپس اور ڈیجیٹل آرکائیوز مترجمین کے لیے نہایت قیمتی سرمایہ ہیں جو ترجمے کو زیادہ مستند، بامعنی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بناتے ہیں۔ مہمان مقرر ڈاکٹر عبدالحفیظ صدر شعبۂ عربی نے اپنے توسیعی خطبے میں فارسی اور عربی ترجمے کے فن

میں ڈیجیٹل اثاثوں کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ترجمہ محض لفظی تبدیلی کا عمل نہیں بلکہ تہذیب، تاریخ، سیاق اور فکری پس منظر کی منتقلی کا ایک حساس فن ہے اور اس میں ڈیجیٹل وسائل کلیدی کردار کرتے ہیں۔ انھوں نے واضح کیا کہ آج مترجمین کے پاس ڈیجیٹل لغات، متوازی متون، ای-مخطوطات، آن لائن، تفاسیر، تحقیقی ڈیٹا بیس اور زبان آموز سافٹ ویئر کی شکل میں ایسے وسائل موجود ہیں جو فارسی اور عربی متون کے درست، معیاری اور بامحاورہ ترجمے کو ممکن بناتے ہیں۔ انھوں نے طلبہ کو جدید ترجمانی ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنے اور روایتی لسانی مہارت کو ڈیجیٹل قابلیت سے جوڑنے کی تلقین کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ظفر الحق اور شکریے کے کلمات ڈاکٹر عبدالرحمٰن فلاحی نے ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 اپریل 2026

تقسیم سے قبل ہندوستان میں کمیونٹی، شہر اور ہم آہنگی

علی گڑھ: ویمنس کالج ہسٹری اسٹڈی سرکل (ڈبلیو سی ایچ ایس سی)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) نے 'ہسٹوریا' کے عنوان سے دوروزہ قومی کانفرنس منعقد کی، جس کا مقصد تاریخی تحقیق میں گہری دلچسپی کو فروغ دینا اور مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے طلبہ اور

محققین میں تنقیدی نقطہ نظر کو پروان چڑھانا تھا۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں شعبہ تاریخ، اے ایم یو کی پروفیسر شاداب بانو نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، جب کہ اجلاس کی رپورٹ ڈبلیو ایچ ایس سی کی صدر ناز خان نے پیش کی۔ کلیدی خطبہ دیتے ہوئے شعبہ تاریخ، اے ایم یو کے پروفیسر سید علی ندیم رضاوی نے عہد مغلیہ کو مذہبی ہم آہنگی اور فرقہ وارانہ یگانگت کا دور قرار دیا۔ انھوں نے تاریخی مثالوں کے ذریعے واضح کیا کہ اس دور میں مختلف برادریاں اور کمیونٹیز باہمی احترام اور افہام وتفہیم کے ساتھ رہتی تھیں۔ اپنے خطبہ 'تقسیم سے پہلے: مغلیہ ہندوستان میں کمیونٹی، شہر اور ہم آہنگی' میں پروفیسر رضاوی نے زور دیتے ہوئے کہا کہ ہندو-مسلم تقسیم کی جڑیں عہد وسطیٰ میں نہیں بلکہ یہ زیادہ تر نوآبادیاتی دور کی پیداوار ہیں۔ اجلاس کی صدارت شعبہ تاریخ کے چیئرمین پروفیسر حسن امام نے کی، جنھوں نے طلبہ کو اس طرح کی علمی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کی ترغیب دی۔ کانفرنس میں مختلف موضوعات زمروں کے تحت علمی اجلاس منعقد کیے گئے، جس میں طلبہ نے اپنی تحقیق پیش کی۔ پینل یکم، بعنوان 'نوآبادیاتی حکمرانی، قانون اور ادارہ جاتی طاقت' کی صدارت ڈاکٹر سلیم جاوید نے کی۔ اس سیشن میں مس ثانیہ، مس نذرہ، مس نغمہ یوسف اور مس نجن کھروار نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پینل دوم بعنوان 'معیشت، ماحولیات اور زرعی مزاحمت' کی صدارت ڈاکٹر فرح سیف عابدین نے کی۔ اس میں مس سورنیما بھارتی، مس ریشما خاتون، مس شیزا شعیب، مس عظمیٰ گل اور دیگر نے مقالے پیش کیے۔ پینل سوم بعنوان 'تاریخ نگاری، شناخت اور ثقافتی بیانیے' کی صدارت ڈاکٹر کمی خان نے کی۔ اس میں مس اساوری شرما مس شاذیہ عصمت، مس سماہر نے اپنے مقالے پڑھے۔ پینل چہارم بعنوان 'صنف، معاشرہ اور زیست کے تجربات' کی صدارت ڈاکٹر شوانگنی ٹنڈن نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 اپریل 2026

زبانوں کے فروغ میں AI کا حصہ

میرٹھ: مصنوعی ذہانت آج کی ضرورت ہے۔ مصنوعی ذہانت صرف کمپیوٹر سے آگے کی چیز ہے۔ مصنوعی ذہانت وہ ٹیکنالوجی ہے جو ہمارے دماغ کو چلانے میں مدد کرتی ہے مگر ہمیں اسے اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ یہ الفاظ تھے پروفیسر جمال احمد صدیقی کے جو شعبہ اردو اور ایوسا کے زیر اہتمام منعقد 'زبانوں کے فروغ میں AI کا حصہ' موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اے آئی کا استعمال ہم اپنے کام کو آسان کرنے کے لیے کر سکتے ہیں، مصنوعی ذہانت کو زبان کا کیا معلوم؟ اے آئی کی ایک پریشانی یہ بھی ہے کہ جو رزلٹ یہ دیتا ہے اس پر ہم پورا یقین نہ کریں اور اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد وافسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور پروفیسر جمال احمد صدیقی (صدر شعبہ لائبریری سائنس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی) نے شرکت فرمائی اور مہمانان اعزازی کے بطور ڈاکٹر عبدالحی (صدر شعبۂ اردو گیا کالج، بہار) اور ڈاکٹر جاوید رسول (اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، کشمیر) نے آن لائن شرکت کی۔ جب کہ مقالہ نگار کے بطور جاوید رسول، کشمیر نے پروگرام میں شرکت کی اور مقررین کے بطور لکھنو سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر شاداب علیم اور نظامت کے فرائض شعبے کی ریسرچ اسکالر سیدہ مریم الٰہی نے انجام دیے۔ پروگرام کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ مصنوعی ذہانت کے فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ اگر ہم مصنوعی ذہانت کے نقصان کی بات کریں تو اس کے زندگی پر منفی اثرات بھی پڑتے ہیں، تحقیق کرنے کی صلاحیت میں کمی، نوکریوں کا خاتمہ اور جعلی معلومات کا ڈر ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی دورائے نہیں کہ مصنوعی ذہانت ایک انقلابی تحریک ہے جو ہماری ذہانت میں مدد کرتی ہے۔ نئی نئی چیزوں کا تلاش کرنا آسان ہو گیا ہے۔ اس موقعے پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ بی اے اور ایم اے کے طالب علموں کے علاوہ کسی بھی کلاس کے طلبا کے لیے AI بہت اہم ہے۔ AI آج ہماری ضرورت بن گیا ہے۔ اردو میں اس کا استعمال خوب ہو رہا ہے۔ فلم انڈسٹری میں اس کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ AI کے ذریعے کسی لفظ کی پوری تاریخ کا پتہ لگا سکتے ہیں بس ضرورت اس بات کی ہے کہ AI کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں بہت ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 مئی 2026

ساہتیہ اکادمی کی ادبی سرگرمیاں

میرٹھ: بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں ساہتیہ اکادمی دہلی کی طرف سے غلط فہمیاں بہت ہیں۔ میں تقریباً 35 سال سے اکادمی سے جڑا ہوا ہوں۔ بہت سے ادبا و شعرا اکادمی سے ناراض رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انھیں پوری بات کا علم نہیں ہو پاتا۔ ایوارڈ کمیٹی کے انتخاب کا کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ ساہتیہ اکادمی نے مجھے چالیس برس کی عمر میں ایوارڈ سے نوازا اور بعد میں فیلوشپ بھی دی۔ ایوارڈ سے ادیب بڑا نہیں ہوتا صرف حوصلہ ملتا ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف فکشن نگار عبدالصمد کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ساہتیہ اکادمی کی ادبی سرگرمیاں موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بہت سے ادیب ایسے بھی ہیں جو واقعی بہت بڑے ادیب ہیں لیکن یہ ایوارڈ ان کو نہیں ملا۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے معروف فکشن نگار عبدالصمد اور معروف شاعر چندر بھان خیال اور مہمان ذی وقار کے بطور ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے شرکت فرمائی۔ مقررین کی حیثیت سے لکھنو سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین اور ڈاکٹر ابوظہیر ربانی موجود رہے۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر الکا وششٹھ نے انجام دیے۔ اس موقعے پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی دہلی ایک ایسی اکادمی ہے جو ہندوستان کی تقریباً 24 زبانوں کو فروغ دینے کا کام کرتی ہے اور کئی طرح کے پروگرام اکادمی کے ذریعے عمل میں آتے ہیں اور مختلف ادیبوں، دانشوروں کو بلا کر ان کا تعارف اور ان کے خیالات کو ہم تک پہنچانے کا کام کرتی ہے۔ ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کا سیاسی دخل نہیں ہوتا۔ چوبیس زبانوں کو یہ اکادمی دیکھتی ہے اور نئے پرانے ادیبوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ حقیقت میں ساہتیہ اکادمی کی سرگرمیاں ایسی ہیں جن کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا اور جب مجھے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تو مجھے خود یقین نہیں ہوا کہ مجھے یہ ایوارڈ مل رہا ہے۔ چندر بھان خیال نے کہا کہ اکادمی صرف ادیبوں اور شاعروں کو انعامات سے ہی نہیں نوازتی بلکہ ہندوستان کی تقریباً 24 زبانوں کی خدمت کر رہی ہے اور علاقائی زبانوں پر کام کرنے والے ادیبوں کو بھی یہ اکادمی سراہتی ہے۔ پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ آج کا یہ پروگرام ریسرچ اسکالر اور طالب علموں کے لیے بہت اہم ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 اپریل 2026

شیکسپیئر مطالعات اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ انگریزی کے پروفیسر ایم رضوان خان نے کریم سٹی کالج، جمشید پور کے شعبۂ انگریزی (پوسٹ گریجویٹ) اور آئی کیو اے سی اور آتھرز پریس، دہلی کے اشتراک سے 'آل دی انٹرنیٹ از اے اسٹیج: شیکسپیئر اینڈ ڈیجیٹل ہیومنیٹیز - ایکسپلورنگ دی بارڈ ان دی الگورتھمک ایج' کے عنوان پر منعقدہ تین روزہ آن لائن بین الاقوامی سمینار میں کلیدی خطبہ دیا۔ سمینار کا آغاز شعبہ انگریزی کے صدر اور آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر ایس ایم یحییٰ ابراہیم کے استقبالیہ خطاب سے ہوا، انھوں نے سمینار کے موضوع کی اہمیت اور شیکسپیئر مطالعات اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں اس کی معنویت پر روشنی ڈالی۔ اپنے کلیدی خطاب میں پرفیسر خان نے ڈیجیٹل دور میں ادبی مطالعات کے بدلتے ہوئے منظرنامے کا باریک بینی اور فکری گہرائی کے ساتھ تجزیہ پیش کیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ کس طرح الگورتھمک نظام، ڈیجیٹل آرکائیوز اور کمپیوٹیشنل ٹولز مطالعہ، تصنیف

اور تشریح کے روایتی تصورات کو نئی شکل دے رہے ہیں۔ انھوں نے ژاک دریدا، رولاں بارتھ اور مشیل فوکو کے افکار کا حوالہ دیتے ہوئے آرکائیوز کے عدم استحکام، متنیت کی تبدیلی اور موجودہ ڈیجیٹل ماحول میں تشریحی اختیار کی منتقلی کا ذکر کیا۔ خطاب کا ایک اہم پہلو 'شیکسپیئر پرابلمز' پر ان کی گفتگو تھی، جس میں انھوں نے بتایا کہ وسیع پیمانے پر ڈیجیٹلائزیشن کے منصوبے جہاں رسائی کو بڑھاتے ہیں، وہیں ادبی روایت میں قائم شدہ درجہ بندیوں کو مضبوط بھی کر سکتے ہیں اور کم معروف ادبی آوازوں کو پس منظر میں دھکیل سکتے ہیں۔ انھوں نے ڈیجیٹل ڈھانچوں کے ناقدانہ تجزیہ کی ضرورت پر زور دیا تاکہ شمولیت اور تشریحی گہرائی کو یقینی بنایا جا سکے۔ کلیدی خطاب کے بعد ایک دلچسپ گفتگو ہوئی، جس نے پیش کردہ خیالات کی گہرائی اور عصری معنویت کو اجاگر کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 اپریل 2026

ہمارا لکھنؤ، ہمارا شہر

لکھنؤ: نوابوں کے شہر کی دلکش روایتوں اور تابندہ ماضی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے نیز اس حسین ثقافت کو باقی رکھنے کے لیے 25 اپریل 2026 کا دن ایک یادگار لمحہ بن گیا، جب کرامت حسین مسلم گرلز پی جی کالج، لکھنؤ نے ثقافتی فورم 'آداب عرض لکھنؤ' کے اشتراک سے ایک بامعنی اور فکر انگیز مذاکرے کا انعقاد کیا، جس کا عنوان تھا 'ہمارا لکھنؤ، ہمارا شہر' یہ دل افروز نشست کالج کے ایس آر علی آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی جہاں علمی وقار اور تہذیبی نزاکت کا حسین امتزاج نظر آیا۔ محفل میں ایسے اہل علم اور ثقافت سے وابستہ افراد جمع ہوئے جنھوں نے لکھنؤ کی ابھرتی ہوئی شناخت، اس کی گنگا جمنی تہذیب اور جدید دور کے چیلنجوں پر نہایت سنجیدہ اور فکر پرور گفتگو کی۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر صابرہ حبیب نے نہایت سلیقے سے انجام دی، جنھوں نے شہر کی علمی روایتوں پر روشنی ڈالی۔ اسی دوران انھوں نے کرامت پی جی کالج کی پرنسپل پروفیسر ہما خواجہ کی گوناگوں صفات کا اعتراف کرتے ہوئے تعلیم نسواں کے فروغ میں ان کی دامے، درمے، قدمے، سخنے، ہر سطح پر کی جانے والی شب و روز کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ معروف تھیٹر اداکار ڈاکٹر انل رستوگی نے فن و ثقافت کی روشنی میں لکھنؤ کی شان بیان کی، جب کہ پروفیسر اپما چترویدی اودھ گرلز ڈگری کالج کی وائس پرنسپل نے شہر کے جغرافیائی خد و خال اور اس کی تہذیبی تشکیل پر گفتگو کی۔ پرنسپل پروفیسر ہما خواجہ نے تعلیم کے ذریعے شہری شعور اور فخر کو فروغ دینے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ محفل میں 'شہر نگاراں' کے مختلف رنگوں کو اجاگر کرتے ہوئے یہ حقیقت سامنے آئی کہ لکھنؤ صرف عمارتوں کا شہر نہیں بلکہ یہ تہذیب، شائستگی اور انسان دوستی کا استعارہ ہے۔ کالج کا یہ علمی و ثقافتی پلیٹ فارم 'کبیر منجری کلچرل کلب' کے زیر اہتمام ایک انٹرایکٹو نشست پر اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 اپریل 2026

رامپور رضا لائبریری اور لینگویج یونیورسٹی کے درمیان معاہدہ

لکھنؤ: خواجہ معین الدین لینگویج یونیورسٹی اور رامپور رضا لائبریری کے درمیان یونیورسٹی کی چانسلر اور اتر پردیش

کی گورنر آنندی بین پٹیل کی رہنمائی میں ایک تاریخی مفاہمتی یادداشت (ایم او یو) پر باقاعدہ دستخط کیے گئے۔ یہ معاہدہ ہندوستان کی عظیم علمی، تعلیمی اور ثقافتی وراثت کے تحفظ، فروغ اور منظم مطالعے کی سمت ایک اہم قدم قرار دیا جا رہا ہے۔ اس پیش رفت سے نہ صرف دونوں اداروں کے مابین تعلیمی تعاون کو نئی رفتار ملے گی بلکہ تحقیق اور علمی تبادلے کے میدان میں بھی وسیع امکانات روشن ہوں گے۔ اس معاہدے پر لینگویج یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اجے تنیجا اور رامپور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا نے اپنے اپنے اداروں کی نمائندگی کرتے ہوئے دستخط کیے۔ دستخط سے قبل منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے دونوں مقررین نے اس شراکت داری کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر لینگویج یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے کہا کہ یہ ایم او یو خاص طور پر رامپور رضا لائبریری میں محفوظ نایاب اور قیمتی مخطوطات کی تلاش، تحقیق، ڈیجیٹلائزیشن، فہرست سازی اور تحفظ کے لیے مشترکہ منصوبوں کو فروغ دے گا۔ ساتھ ہی محققین اور اسکالرز کو ان مخطوطات تک بہتر رسائی فراہم کرنے کے لیے بھی عملی اقدامات کیے جائیں گے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کثیر لسانی اور کثیر ثقافتی ہندوستانی روایت کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی جیسی زبانوں کے ذریعے ہونے والی مشترکہ تحقیق نہ صرف تعلیمی معیار کو بلند کرے گی بلکہ بین العلومی مطالعے کے لیے در بھی وا کرے گی۔ ڈاکٹر پشکر مشرا نے اپنے خطاب میں پروفیسر اجے تنیجا کی قیادت کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کی فعال اور دور اندیش رہنمائی کے باعث ہی یہ اہم معاہدہ ممکن ہو سکا ہے۔ تقریب میں ممتاز ماہر تعلیم اور سماجی کارکن ڈاکٹر مونیکا تنیجا کی باوقار موجودگی نے پروگرام کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحفیظ (عربی)، ڈاکٹر محمد اکمل (اردو)، ڈاکٹر عارف عباس (فارسی) اور ڈاکٹر یوسف ایاز (انگریزی) بھی شریک رہے۔ اس موقعے پر ورندابن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر راجیو دویدی بھی موجود تھے جو رامپور رضا لائبریری کے ساتھ ایک علاحدہ معاہدے کے سلسلے میں آئے تھے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں بھی اس مفاہمت کو اہم قرار دیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 اپریل 2026

ادبی تنقید بطور ادب

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی

نے 'ادبی تنقید بطور ادب' کے موضوع پر فیکلٹی آف آرٹس میں مصنف، مدیر اور سمر انسٹی ٹیوٹ آئیووا، امریکہ کے

سابق میئور مسٹر چندر ہاس چودھری کے توسیعی خطبے کا اہتمام کیا۔ مسٹر چودھری نے اپنے خطاب میں کہا کہ ادبی تنقید خود بھی ادب کی ایک صورت سمجھی جاسکتی ہے۔ ان کا مرکزی موقف یہ تھا کہ دیگر اقسام تنقید کے برعکس، ادبی تنقید اسی وسیلے یعنی زبان میں کام کرتی ہے جس میں ادب تخلیق ہوتا ہے۔ یہی انفرادیت تنقید کو ادب کی ایک ذیلی صنف بناتی ہے، جو تصوریت، حسیت، اختصار بلیغ اور مابعد الطبیعیاتی غور وفکر سے بھرپور ہوسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تنقید کسی ادبی تخلیق کو وسیع تر ادبی روایت میں رکھتی ہے تو وہ خود بھی جذبہ اور رس بھاؤ، پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکچر میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ادبی تنقید محض ایک ذہنی مشق نہیں بلکہ تخلیقی معنوں میں ادب کو اپنانے کا عمل ہے۔ مسٹر چودھری نے معروف ادیبوں جیسے جارج لوئیس بورخیس، رابندر ناتھ ٹیگور اور ورجینیا وولف کا حوالہ دیا اور جان ملٹن کی شاعری کی باریک بینی سے قرأت کے ذریعے یہ واضح کیا کہ مطالعہ خود بیک وقت ادب اور تنقید دونوں کو جنم دیتا ہے۔ لیکچر کے بعد ایک دلچسپ مباحثہ اور سوال و جواب کی نشست منعقد ہوئی۔ پروگرام کا آغاز شعبۂ انگریزی کی چیئرپرسن پروفیسر شاہینہ ترنم کے استقبالیہ خطاب سے ہوا، جنھوں نے مہمان مقرر کا تعارف کرایا۔ سرسید اکیڈمی کے ڈائرکٹر پروفیسر شافع قدوائی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور مسٹر چودھری کی تخلیقی تحریروں اور تنقیدی بصیرت کی ستائش کی۔ سرسید ہاؤس میں ایک تعاملی نشست بھی منعقد ہوئی، جہاں طلبہ اور نوجوان مصنفین نے تخلیقی تحریر کے موضوع پر مسٹر چودھری سے تبادلہ خیال کیا۔ آخر میں مسٹر جنید نے اظہارِ تشکر کیا جب کہ مسٹر صائم رضا نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مہمان مقرر کے پرزنٹیشن اور تکنیکی امور کی ذمے داری مسٹر مجیب الحق نے سنبھالی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 اپریل 2026

تنوع کا احترام: بین المذاہب مکالمہ اور ثقافتی تفہیم

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبہ فلسفہ کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سمینار 'تنوع کا احترام: بین المذاہب مکالمہ اور ثقافتی تفہیم' کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا، جس میں مکالمہ، بقائے باہمی اور ثقافتی ہم آہنگی کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ سمینار میں مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے اسکالرز، اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ سمینار کے دوران متعدد تکنیکی اجلاس منعقد ہوئے جن میں تحقیقی مقالات پیش کیے گئے اور علمی مباحث ہوئے۔ اختتامی اجلاس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر محمد رضوان خان، کوآرڈینیٹر کلچرل ایجوکیشن سینٹر اور سابق چیئرپرسن، شعبہ انگریزی تھے۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ سننے کی صلاحیت بامعنی مکالمے کی بنیاد ہے اور اصل مسئلہ تنوع نہیں بلکہ معاشرے کی اس کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ جینے میں ناکامی ہے۔ انھوں نے ادب، مذہب اور ثقافتی روایات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ شعبے ہم آہنگی اور باہمی احترام کے ساتھ زندگی گزارنے کے قیمتی سبق فراہم کرتے ہیں۔ اس سے قبل شعبہ فلسفہ کے چیئرپرسن ڈاکٹر عامر ریاض نے سمینار کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ سمینار میں آف لائن اور آن لائن نشستوں کے دوران تحقیقی مقالات پیش کیے گئے، جو علمی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے مقررین، سیشن چیئرز اور شرکا کی خدمات کو سراہا۔ اختتامی کلمات میں ڈاکٹر عقیل احمد نے یونیورسٹی کے مختلف اداروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ثقافتی، لسانی اور مذہبی پہلو مل کر تنوع اور مکالمے کے اس موضوع کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ سمینار کی قرارداد یں ڈاکٹر بودھیندر کمار نے پیش کیں، جن میں مباحث کے اہم نکات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے تنوع کے ساتھ مثبت اور تعمیری انداز میں تعامل اور بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ آخر میں آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر شاہدالحق نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر شرکا میں اسناد بھی تقسیم کی گئیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 اپریل 2026

وقار رضوی اور اودھ نامہ

میرٹھ: میں وقار رضوی سے بخوبی واقف ہوں۔ میری ان سے کافی ملاقاتیں رہیں۔ ہمیں سب کو جوڑنے کا کام کرنا چاہیے اور یہ خصوصیت وقار رضوی صاحب کے اندر موجود تھی۔ یہ الفاظ تھے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کے جو شعبۂ اردو میں منعقد پروگرام بعنوان 'وقار رضوی اور اودھ نامہ' میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت کے فرائض معروف ناقد اور سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔

مہمانانِ خصوصی کے بطور ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، امیر مہدی انگلینڈ نے شرکت کی۔ مہمانانِ اعزازی کے بطور ڈاکٹر کہکشاں عرفان اور ڈاکٹر مجیب شہزر، مقرر کے بطور ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں جب کہ مقالہ نگار کے بطور ڈاکٹر موسیٰ رضا نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض غلام عباس لکھنؤ نے انجام دیے۔ ڈاکٹر کہکشاں عرفان نے کہا کہ میں نے اودھنامہ میں دیگر ساتھیوں کی مانند بہت کام کیا ہے۔ اودھ نامہ صرف ایک اخبار نہیں بلکہ ہمارے لیے ایک خاندان تھا اور ہم سب مل کر اودھ نامہ کے لیے کام کرتے تھے۔ امیر مہدی نے کہا کہ وہ لکھنؤ کے وقار تھے۔ آج بھی ان کا اخبار نکل رہا ہے۔ اس اخبار سے ایسے لوگ جڑے ہوئے تھے جو دل سے کام کرتے تھے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اس طرح کے پروگرام کا ہمارا مقصد زیادہ سے زیادہ نوجوان اسکالرز کو جوڑنا ہے۔ وقار رضوی جب تک زندہ رہے تب تک وقار رضوی اور 'اودھ نامہ' ایک سکہ کے دو پہلو بنے ہوئے تھے۔ وقار رضوی صرف ایک اخبار نہیں نکالتے تھے وہ اودھ نامے کے بہت سے جلسے جلوس بھی کرتے تھے۔ پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ وقار بھائی صرف اودھ نامہ کے مالک ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک ایسی شخصیت تھی جو چوبیس گھنٹے اودھ نامہ کی خدمت میں مصروف تھے۔ اودھ نامہ صرف اخبار ہی نہیں بلکہ محبتوں کی درسگاہ ہے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر موسیٰ رضا (اسسٹنٹ پروفیسر خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی لکھنؤ) نے 'وقار رضوی اور اودھ نامہ: ایک جائزہ' کے عنوان سے اپنا مفصل مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر مجیب شہزر نے اودھ نامہ کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ صحافت کے علاوہ دیگر پہلوؤں پر بھی وقار رضوی بات کرتے تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 10 اپریل 2026

بہار

عہد حاضر میں ادب کی معنویت اور اہمیت

گیا: ادب انسان کی داخلی دنیا کا آئینہ ہوتا ہے اور اسے اپنی ذات کی گہرائیوں میں جھانکنے کا سلیقہ عطا کرتا

ہے۔ جب انسان ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ محض الفاظ نہیں پڑھتا بلکہ مختلف تجربات، احساسات اور خیالات سے گزرتا ہے۔ یہی عمل اس کے اندر بصیرت پیدا کرتا ہے، جو اسے اپنے اردگرد کی دنیا کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھنے کے قابل بناتا ہے۔ یہ باتیں للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار اور سی ایم کالج دربھنگہ کے موجودہ پرنسپل معروف محقق، ادیب و شاعر پروفیسر مشتاق احمد نے گیا کالج گیا کے شعبہ اردو میں منعقدہ خصوصی لکچر 'عہد حاضر میں ادب کی معنویت اور اہمیت' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ادب پڑھنے والا فرد زیادہ متوازن، سنجیدہ اور گہری سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے مسائل کو محض جذباتی انداز میں نہیں بلکہ عقلی اور فکری بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ادب کسی بھی معاشرے کی فکری اور تہذیبی شناخت کا بنیادی ستون ہوتا ہے۔ ادب کے بغیر نہ تو معاشرہ اپنی روح کو برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی تاریخ اور روایت کو صحیح معنوں میں سمجھ سکتا ہے۔ پروفیسر مشتاق احمد نے موجودہ دور کے تناظر میں ادب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کا زمانہ تیز رفتار، مادی ترقی اور ٹیکنالوجی کی یلغار کا زمانہ ہے، جہاں انسان بظاہر ترقی کی بلندیوں کو چھو رہا ہے، لیکن اندرونی طور پر ایک خلا اور بے سمتی کا شکار ہے۔ ایسے میں ادب ہی وہ ذریعہ ہے جو انسان کو اس کی اصل سے جوڑتا ہے اور اسے توازن اور اعتدال کی راہ دکھاتا ہے۔ معروف فکشن نگار اور مشاورتی بورڈ ساہتیہ اکادمی کے ممبر ڈاکٹر احمد صغیر نے اس تقریب میں صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں جہاں تیز رفتار زندگی اور ڈیجیٹل مصروفیات نے انسان کو سطحی معلومات تک محدود کر دیا ہے، ادب کا مطالعہ اور بھی اہم ہو گیا ہے۔ یہ ہمیں ٹھہراؤ، غور و فکر اور خود احتسابی کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ادب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ زندگی کو محض گزارنا نہیں بلکہ اسے سمجھنا اور محسوس کرنا بھی ضروری ہے۔ اس تقریب میں ایس ایس کالج جہان آباد کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر محمد عمران ارشد نے بطور مہمان ذی وقار شرکت کی اور کہا کہ ادب انسان کو نہ صرف بہتر سوچنے کا ہنر دیتا ہے بلکہ اسے ایک باکردار، باشعور اور حساس انسان بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کا مطالعہ ہر دور میں اہم رہا ہے اور آئندہ بھی انسانی ترقی اور فکری بالیدگی کے لیے ناگزیر رہے گا۔ خصوصی خطبے سے قبل صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عبدالحی نے مہمان مقرر کا شال اور مومنٹو دے کر استقبال کیا اور ان کا تعارف پیش کیا۔ ساتھ ہی اس خصوصی لکچر کی غرض و غایت بیان کی اور کہا کہ آج کے مشینی دور میں ادب کی اہمیت اور معنویت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ادب صرف پڑھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ اسے اپنی زندگی میں اتارنا بھی لازمی ہے۔ پروگرام کی نظامت محمد منہاج الدین نے کی۔ اس موقعے پر 'جہان اردو' کے دستاویزی شمارے عظیم آباد نمبر کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 اپریل 2026

تلنگانہ

مانو کی جانب سے گوا میں اردو اساتذہ کے لیے ورکشاپ

حیدر آباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اردو ذریعہ تعلیم کے زیر اہتمام ریاست گوا میں اردو میڈیم اساتذہ کے لیے دو روزہ کپیسٹی بلڈنگ ورکشاپ 28 اور 29 اپریل 2026 کو بالترتیب ساؤتھ اور نارتھ گوا میں کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس تربیتی پروگرام کا انعقاد All Association of Goa Urdu Schools اور India Ideal Teachers Association [AIITA] کے اشتراک سے عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ایسوسی ایشن آف گوا اردو اسکولز کے سکریٹری جناب شعیب شیخ نے مہمانانِ گرامی اور شرکائے ورکشاپ کا خیر مقدم کیا، جب کہ اے آئی آئی ٹی اے کرناٹک کے صدر جناب رضا معنوی نے تنظیم کے اغراض و مقاصد اور اس کی تعلیمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ دونوں ورکشاپ کے دوران ماہرین تعلیم نے عملی سیشنس کے ذریعے اساتذہ کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو فروغ دیا۔ مرکز کے ڈائرکٹر، پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی نے اپنے خطاب میں تعلیمی نظام میں مصنوعی ذہانت (AI) کے موثر اور بامقصد استعمال کی اہمیت کو اجاگر کیا اور جدید ٹیکنالوجی کے تدریسی عمل پر مرتب ہونے والے اثرات پر اظہار خیال کیا۔ جناب سید عارف نے کلاس روم مینجمنٹ کے مختلف پہلوؤں پر جامع گفتگو کرتے ہوئے اساتذہ کو عملی رہنمائی فراہم کی۔ ان ورکشاپوں میں ریاست گوا کے 120 سے زائد اساتذہ نے شرکت کی اور تربیتی سیشنس سے بھرپور استفادہ کیا۔ شرکا نے اس نوعیت کے پروگراموں کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اسے تدریسی معیار کی بہتری کی جانب ایک پیش رفت بتایا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 مئی 2026

کیوڑے کا بن

حیدر آباد: تہذیبی و تاریخی شہر حیدرآباد میں ادب، ثقافت اور فنون لطیفہ کے فروغ کے مقصد سے ایک عظیم الشان میوزیکل ڈرامہ بعنوان 'کیوڑے کا بن' پیش کیے جانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ میوزیکل ڈرامہ دراصل دکنی اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار شاعر سلیمان خطیب کے شہرۂ آفاق کلام کو جدید اسٹیج تکنیک، دلکش موسیقی اور موثر تھیٹر کے حسین امتزاج کے ساتھ پیش کرنے کی ایک تخلیقی اور دلنشیں کوشش ہے۔ اس شاندار پیشکش کی ہدایت کاری علی احمد نے انجام دی ہے، جب کہ اس کا اسکرپٹ نعیم جاوید نے تحریر کیا ہے اور اس کے پروڈیوسر خواجہ معین خطیب ہیں۔ پروگرام کی مجموعی نگرانی بطور پروڈکشن منیجر قطب محی الدین نے کی جب کہ موسیقی کی ترتیب و تشکیل جیپال سنگھ مونی نے انجام دی۔ پروگرام کی نمایاں خصوصیت دکنی تہذیب، معاشرت اور روزمرہ زندگی کے مختلف رنگوں کو نہایت سلیقہ مندی اور فنکارانہ انداز میں اجاگر کرنا ہے، جس کے ذریعے ناظرین کو دکن کی تہذیبی روایات کی جیتی جاگتی جھلک دیکھنے کا موقع ملا۔ اس یادگار ثقافتی پیشکش

کا حصہ بنے ملک کے کئی نامور گلوکار اور گلوکارائیں، جن میں معروف گلوکارہ رچا شرما، ممتاز گلوکارہ سادھنا سرگم اور نامور فنکارہ جسپندر نرولا شامل ہیں، جنھوں نے اپنی پراثر اور سحر انگیز آوازوں میں سلیمان خطیب کے منتخب کلام کو ریکارڈ کیا ہے۔ اسی طرح غزل کے میدان کے معروف گلوکار طلعت عزیز اور ممتاز فنکار جسویندر سنگھ بنٹی نے بھی اپنی دلنشیں آوازوں میں منتخب غزلیات ریکارڈ کی ہیں، جب کہ بالی ووڈ کے مقبول پلے بیک سنگر جاوید علی نے بھی دلکش نغمات کو اپنی آواز میں ریکارڈ کیا ہے۔ مزید برآں صوفی موسیقی کے رنگ کو نمایاں کرنے کے لیے معروف صوفی گلوکاروں کی جوڑی رئیس انیس صابری نے بھی اپنے مخصوص صوفیانہ انداز میں کلام ریکارڈ کیا ہے۔ خصوصی بات یہ ہے کہ تمام گلوکار و گلوکارائیں کی آواز میں سلیمان خطیب کے منتخب کلام، طنز و مزاح پر مبنی نظمیں، دلکش غزلیات اور روح پرور صوفیانہ کلام کو باضابطہ موسیقی کے ساتھ پیشہ ورانہ انداز میں ریکارڈ کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 12 اپریل 2026

ہریانہ

اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں میٹنگ

نوح، میوات: تنظیم فروغ اردو میوات کے قائم مقام صدر مولانا ظہیر احمد کی صدارت میں تنظیم فروغ اردو کے انتظامی سیل کی میٹنگ تنظیم کے صدر دفتر نوح گوشالہ روڈ پر منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر قمرالدین ڈاکر کی سرپرستی میں منعقد میٹنگ میں نظامت کے فرائض تنظیم کے سکریٹری مولانا محمد حارث مدنی نے انجام دیے۔ میٹنگ میں مختلف امور پر تبادلہ خیال ہوا جن میں نئے تعلیمی سال کے آغاز میں 6ویں سے 12 ویں تک اختیاری زبان الاٹ کرنے کے تعلق سے محکمہ تعلیم دفتر نوح سے لیٹر جاری کرانا، جس میں ہدایت ہو کہ کسی طالب علم کو اس کی مرضی کے بغیر کوئی زبان نہ دی جائے۔ اس کام کی ذمہ داری ماسٹر ذاکر و ماسٹر نسیم کو سونپی گئی۔ میٹنگ کے دوران تنظیم کے ایک کو آرڈینیٹر کی تعیین عمل میں آئی اور یہ ذمہ داری جناب راشد صاحب نظام پور کو تفویض کی گئی۔ تنظیم فروغ اردو کے اکاؤنٹ اور بیلنس شیٹ کی ذمے داری جناب ذاکر صاحب آکیڑا کو سونپی گئی۔ علاوہ ازیں ایم آئی ایس پارٹل پر بچوں کے اندراج کرانے کا لائحہ عمل، حکومت کی جانب سے ہو رہے سینسس میں تنظیم فروغ اردو کا کردار اور بیداری مہم چلایا، تنظیم فروغ اردو کے ذریعے سماج میں تعلیمی بیداری اور اردو کے فروغ کے لیے مہم کا لائحہ عمل تیار کرنا سرکاری آفیسز میں اردو ترجمان کی تعیین کی مہم اور اردو کو تیسری زبان کا درجہ دلانے کی مہم شروع کرنا اور میوات کے آفیسرز کو اس تعلق سے واقف کرانا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اپریل 2026

اعزاز و اکرام

میڈیا فار یونٹی ایوارڈز 2026

نئی دہلی: 'نئی دنیا' فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں 'میڈیا فار یونٹی ایوارڈز 2026' تقریب کا شایان شان اہتمام کیا گیا۔ تقریب میں ملک کے 12 ممتاز صحافیوں، ادیبوں، فلم سازوں اور فنکاروں کو ان کی نمایاں خدمات کے لیے معززین کے ہاتھوں اعزازات سے نوازا گیا۔ تقریب کی صدارت سپریم کورٹ کے جج جسٹس رشی کیش رائے کر رہے تھے اور نظامت کے فرائض ممتاز فلم ساز و ہدایت کار اتل تیواری نے انجام دیے جب کہ ایوارڈ یافتگان کا تعارف زبیر صدیقی نے پیش کیا۔ اس موقعے پر شہ نشین پر رونق اور حاضرین سے خطاب کرنے والوں میں ایوارڈ کی جوری کے صدر ایس وائی قریشی (مصنف و سابق الیکشن کمشنر)، سینئر کانگریس رہنما، رکن پارلیمنٹ اور ممتاز ادیب ششی تھرور، ممتاز اسلامی اسکالر پروفیسر اختر الواسع، نامور صحافی و مصنف راجدیپ سردیسائی، ممتاز صحافی برکھادت، سابق رکن پارلیمنٹ م افضل، رکن پارلیمان راجیو شکلا، لندن سے آئے ممتاز دانشور ڈاکٹر عظمت حسین اور دوسرے معززین شامل ہیں جن کے ہاتھوں میڈیا کے منتخب افراد کو مختلف شعبوں میں ان کی نمایاں خدمات کے لیے ایوارڈز پیش کیے گئے۔ سینئر صحافی نیرجا چودھری، معروف ادیب و مصنف ڈاکٹر پرشوتم اگروال، سینئر صحافی و ادیب ویویک شکلا، تھیٹر اداکار اروند گوڑ، صحافی و مصنف ضیاء السلام، ٹی وی اینکر و تجزیہ کار سندیپ چودھری، نامور رپورٹر سوربھ شکلا، کارٹونسٹ منجول، فلم ہدایت کار سدھیر مشرا، صحافی و مصنف ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز، سماجی خدمت گار اور ماہ رقص و موسیقی رانی خانم اور دہلی میں مقیم عرب صحافی ڈاکٹر وائل عواد کو اس موقعے پر مختلف زمرے میں مولانا عبدالوحید صدیقی، کلدیپ نیر، پربھا جوشی، خوشونت سنگھ، ایس پی سنگھ، ونود دوا، سوامی اگنی ویش، شیام بینگل، حبیب تنویر اور پربھادت کے نام سے منسوب اعزازات سے سرفراز کیا گیا۔ ان عہد ساز ہستیوں سے منسوب یہ ایوارڈز ان ممتاز افراد کو اپنے اپنے میدان میں نمایاں کارکردگی، جرأت مندانہ رپورٹنگ، ادبی خدمات، سنیما اور تھیٹر میں سماجی مسائل کو موثر انداز میں اجاگر کرنے کے اعتراف میں ان عہد ساز شخصیتوں کے نام کے ایوارڈ پیش کیے گئے۔ تقریب کے دوران معزز شخصیات نے اپنے مختصر خطابات میں صحافت کی اخلاقی ذمہ داریوں پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ حقیقی صحافت صرف خبروں تک محدود نہیں بلکہ یہ معاشرے کے آخری فرد کی آواز بننے کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ نئی دنیا فاؤنڈیشن کے صدر، ممتاز صحافی مصنف اور سابق رکن پارلیمنٹ شاہد صدیقی نے کہا کہ یہ ایوارڈز محض اعزاز نہیں بلکہ ان اقدار کی یاددہانی ہیں جن پر میڈیا کو چلنا چاہیے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آنے والے برسوں میں مزید ایسے باوقار صحافی، ادیب اور فنکار سامنے آئیں گے جو صدارت اور جرأت کی مثال قائم کریں گے۔ واضح رہے کہ یہ تقریب میڈیا کے لیے ایک سنگ میل ثابت ہوئی اور تمام شرکا نے اسے یادگار قرار دیا۔ مجموعی طور پر 'میڈیا فار یونٹی ایوارڈز 2020' نے مثبت اور ذمہ دار صحافت کے عزم کو ایک بار پھر مضبوطی سے اجاگر کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 اپریل 2026

رسم اجرا

داراشکوہ: زندگی، فلسفہ اور تخلیقات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخی 'سلطان جہاں منزل' کے کانفرنس ہال میں ڈاکٹر محمد فاروق خان

کی تحقیقی تصنیف 'داراشکوہ: زندگی، فلسفہ اور تخلیقات' کی

رسم اجرا کی تقریب منعقد ہوئی۔ اتر پردیش قانون ساز کونسل کے رکن اور اے ایم یو کے سابق وائس چانسلر پروفیسر منصور نے بطور مہمانِ خصوصی کتاب کی رونمائی کی۔ پروفیسر طارق منصور نے اپنے خطاب میں کہا کہ داراشکوہ نے صدیوں پہلے بین المذاہب مکالمے کی بنیاد رکھی تھی۔ انھوں نے زور دیا کہ ہندوستان کی ہمہ گیر ترقی اور سماجی ہم آہنگی کے لیے داراشکوہ کے فلسفے کو سمجھنا ناگزیر ہے، کیونکہ ان کی فکر ہی ایک ترقی یافتہ بھارت کی ضامن ہے۔ پروفیسر رضاء اللہ خان نے کہا کہ جس گنگا جمنی تہذیب کو ہم آج عزیز رکھتے ہیں، اس کا بیج داراشکوہ نے ہی بویا تھا۔ سابق پراکٹر پروفیسر وسیم علی اور ڈاکٹر عبدالحق نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مصنف ڈاکٹر محمد فاروق خان نے کتاب کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ داراشکوہ کی تصانیف تصوف اور اپنشدوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہیں اور 'مجمع البحرین' (دو سمندروں کا ملاپ) کا پیغام آج کے دور میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر فیضان الٰہی نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 اپریل 2026

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی: قائد ملت، مسیحائے قوم

نئی دھلی: سینئر صحافی وادیب معصوم مرادآبادی کی مرتب کردہ کتاب 'ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی: قائد ملت، مسیحائے قوم' کے رسم اجرا کی ایک پروقار تقریب کانسٹی ٹیوشن کلب آف انڈیا کے اسپیکر ہال میں منعقد ہوئی۔ یہ تقریب انڈین مسلمس فار سول رائٹس، نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت سابق رکن پارلیمنٹ محمد ادیب نے کی، جب کہ دہلی کے سابق لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ مہمان خصوصی تھے۔ کتاب کا اجرا آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے صدر ڈاکٹر ظفر

الاسلام خاں اور دیگر معزز مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مہمانانِ اعزازی میں سابق چیف انفارمیشن کمشنر وجاہت حبیب اللہ، پٹنہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جسٹس اقبال احمد انصاری، رکن پارلیمنٹ مولانا محبّ اللہ ندوی، پدم شری پروفیسر اختر الواسع اور ڈاکٹر ایس فاروق شامل تھے۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے معصوم مرادآبادی نے کہا کہ شخصیت نگاری ان کا محبوب مشغلہ ہے اور وہ سیکڑوں شخصیات کے خاکے لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب انھوں نے ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی پر کام شروع کیا تو تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ ان پر کافی مواد موجود ہے، تاہم انھوں نے اس کتاب میں نئی اور معلومات شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے مختلف لائبریریوں سے رجوع کیا گیا اور ڈاکٹر فریدی کی تقاریر، خطبات اور خیالات کو یکجا کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ قومی یکجہتی کونسل میں ڈاکٹر فریدی کی ایک تاریخی تقریر کا اردو ترجمہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کتاب کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات نہایت اہم ہیں، جن میں ڈاکٹر فریدی کی فکر، مشن، جدوجہد اور خدمات کو جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے کہا کہ میرے بچپن میں یہ تصور عام تھا کہ عبدالجلیل فریدی ہندوستان میں ٹی بی کے سب سے بڑے معالج تھے اور انھوں نے اپنی پوری زندگی ملک وملت کے لیے وقف کردی۔ انھوں نے بارہ دری میں مجلس مشاورت کے پہلے اجتماع کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس موقعے پر ڈاکٹر فریدی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع اور نجیب جنگ نے اپنے خیالات سے سامعین کو روشناس کرایا۔ صدارتی تقریر میں سابق ممبر پارلیمنٹ محمد ادیب نے معصوم مرادآبادی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے یہ کتاب مرتب کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور امید ہے کہ اب فریدی شناسی کا نیا دور شروع ہوگا، دیگر مقررین میں جسٹس اقبال انصاری، وجاہت حبیب اللہ اور ڈاکٹر ایس فاروق نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اپریل 2026

یادوں کا جشن

نئی دھلی: معروف شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی سوانح حیات 'یادوں کا جشن' کا انگریزی ترجمہ اے سیلی بریشن آف میموریز کی رسم اجرا ایک پروقار تقریب انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد ہوئی جس میں علم وادب سے وابستہ سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ تقریب کا آغاز کنور مہندر سنگھ بیدی کی ادبی، تہذیبی اور انسانی خدمات کے اعتراف سے ہوا، جہاں مقررین نے ان کی شاعری، فکر، سیکولر اقدار، انسان دوستی اور اردو ادب کے لیے ان کی گراں قدر خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ پروگرام میں متعدد ممتاز شخصیات شریک ہوئیں، جن میں دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر تجیت سنگھ سندھو، سابق گورنر بہار عارف محمد خاں، معروف اردو اسکالر کامنا پرساد و سحر صاحب کے نواسے ڈاکٹر وشواجیت سنگھ اور کولکاتا سے تعلق رکھنے والے اسکالر عبدالرحیم بطور مقرر شامل تھے۔ اس کے علاوہ ادبی علمی اور سماجی حلقوں کی متعدد معزز شخصیات بھی سامعین میں موجود تھیں۔

کامنا پرساد جنھوں نے اس کتاب کو اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، نے کہا کہ وہ خود کو خوش نصیب سمجھتی ہیں کہ انھیں اس اہم ادبی کام کا حصہ بننے کا موقع ملا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ترجمہ خاص طور پر نئی نسل اور انگریزی داں طبقے تک سحر صاحب کی فکر، یادداشتوں اور ادبی ورثے کو پہنچانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ ان کے مطابق یہ صرف ایک ترجمہ نہیں بلکہ تہذیبی ورثے کی نئی نسل تک منتقلی کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ عارف محمد خان نے اپنے خطاب میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے اپنی ملاقاتوں کو زندگی کا قیمتی سرمایہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ سحر صاحب محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک ایسی شخصیت تھے جنھوں نے اپنے کردار، فکر اور طرز عمل سے مشترکہ تہذیب اور انسان دوستی کے اصولوں کو زندہ رکھا۔ انھوں نے کہا کہ سحر صاحب کی شخصیت اور شاعری آج بھی سماجی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کا پیغام دیتی ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر تجیت سنگھ سندھو نے

اپنے خطاب میں بیدی کی انسانی عظمت، وسیع النظری اور ہمدردانہ کردار کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ انھوں نے حاضرین سے اپیل کی کہ اردو سمیت تمام ہندوستانی زبانوں کو فروغ دیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 اپریل 2026

تلاش

نئی دھلی: غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں عصر حاضر کی شاعرہ ڈاکٹر انا دہلوی کا ایک باوقار اور یادگار جشن کا انعقاد کیا گیا جس میں ان کے آٹھویں شعری مجموعہ 'تلاش' کی رسم اجرا مہمانِ خصوصی ساجد احمد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اسلم چشتی فرینڈ سرکل پونے کے زیر اہتمام منعقد کل ہند مشاعرہ کی صدارت سہیل صدیقی نے کی اور نظامت کے فرائض معروف شاعر و صحافی معین شاداب نے انجام دیے۔ یہ ادبی تقریب اپنے منظم انداز، مہذب ماحول اور معیاری پیشکش کے باعث ابتدا ہی سے سامعین کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ سہیل صدیقی نے اپنے صدارتی کلام میں ادب کی اہمیت، تخلیقی اظہار کی ضرورت اور نئی نسل کے ادبی رجحانات پر روشنی ڈالی۔ مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے کشش وارثی، جاوید رحمانی، تنویر احمد خان نے شرکت کی۔ پہلے سیشن کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر وسیم راشد نے پروگرام پر روشنی ڈالی اور اے سی ایف سی (پونے) ادبی تنظیم کے اغراض ومقاصد بیان کیے اور ڈاکٹر انا دہلوی کی ادبی کاوشوں کی ستائش کی۔ اس موقعے پر اے سی ایف سی کی جانب سے اسلم چشتی نے سپاس نامہ پڑھ کر سنایا۔ اس موقعے پر معین شاداب نے ڈاکٹر انا دہلوی کے شعری مجموعہ 'تلاش' پر مختصر اور جامع گفتگو کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 اپریل 2026

سمندر میں دھول

دیوبند: سہارنپور کی فعال ادبی انجمن عروج ادب کے زیر اہتمام ایک ادبی تقریب کا انعقاد ہوٹل راج محل

میں کیا گیا جس کی صدارت سپریم کورٹ کے وکیل اور

انا دہلوی کے آٹھویں شعری مجموعہ 'تلاش' کا اجرا

معروف شاعر و ادیب عمران عظیم نے کی اور نظامت کے فرائض انجمن کے جنرل سکریٹری جاوید خان سروہا نے انجام دیے۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر دلّی کے مشہور شاعر شاہد انور تھے اور مہمان ذی وقار کشمیر سنگھ معروف کوی اور دلّی سے تشریف لائی شاعرہ فرزانہ غزل تھیں۔ محفل میں شہر کی چنندہ اور مقتدر شخصیات کی شرکت نے اس بزم کی رونق کو اور دوبالا کر دیا۔ ڈائس سے قاضی ندیم اختر نے اپنے خطاب میں سہیل اقبال کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ سہیل اقبال کی شاعری کے علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی سے مداح رہے ہیں۔ اس کے بعد معروف گلوکار سنجیو جھینگرن نے سہیل اقبال کی ایک غزل کو سروں میں ڈھال کر بہت ہی دلکش انداز میں پیش کیا۔ تعارفی خطاب جلال عمر سابق پرنسپل اسلامیہ کالج نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں پیش کیا۔ انھوں نے سہارنپور کی ادبی تاریخ کو اجاگر کرتے ہوئے ادبی سلسلے کو سہیل اقبال تک لاکر ان کی صلاحیت اور تصنیف پر تفصیلی گفتگو کی۔ شاہد انور دہلوی نے اپنے خوبصورت انداز میں سہیل اقبال کی شاعری اور ان کی تصنیف پر، پرمغز گفتگو کی اور ایک سپاس نامہ موصوف کو پیش کیا۔ مہمان کشمیر سنگھ اور فرزانہ غزل نے بھی سہیل اقبال کو ان کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی اور اس محفل میں شرکت کو باعث خوش نصیبی قرار دیا۔ اس کے بعد ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر اور بیرون شہر کے شعرا اور شاعرات نے اپنے کلام کو پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 اپریل 2026

پرواز

ٹونک: مراد اکیڈمی کے زیر اہتمام الکزر کلاسیز، سول لائن روڈ، تال کٹورہ، ٹونک پر ٹونک کی ہمہ جہت شخصیت صاحب زادہ محمد شمشیر خان شاہین کے شعری مجموعہ 'پرواز' کے ہندی ورژن کی رسم اجرا اور محفل قوالی کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت عبدالحفیظ شوق احسنی نے کی اور مہمانِ خصوصی فیروز کمال انصاری رہے۔ مہمانانِ اعزازی میں پروفیسر حسین رضا خان، ڈاکٹر سید عبدالمبین قادری اور پروفیسر عزیز اللہ شیرانی تھے۔ پروگرام میں سید ساجد علی ٹونکی نے شمشیر خان شاہین کی کتاب 'پرواز' پر اپنے خیال پیش کیے، پروفیسر حسین رضا خاں نے شمشیر خان شاہین کی شخصیت سے جڑے پہلوؤں اور ان کی ہمہ جہت شخصیت پر تفصیل سے بات کی۔ ڈاکٹر سید عبدالمبین قادری نے ٹونک کے ادبی ماحول کی تعریف کی۔ سیشن کے آخر میں عبدالحفیظ شوق احسنی نے سبھی حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت قاری مطیع اللہ نواب واصفی نے کی۔ پروگرام کے دوسرے حصے میں محمد آصف قوال اور امین سعادت صابری نے قوالی کا مظاہرہ پیش کیا۔ رات دو بجے تک چلے اس پروگرام میں قوالوں نے اس 'چھاپ تلک سب چھین لی۔ موسے نینا ملا کر' اور 'کیسر یہ بالم آوٹی پدھاروں مہارے دیس' جیسی ایک سے بڑھ کر ایک قوالیاں پیش کر پروگرام کو کامیاب اور دلکش بنا دیا۔ پروگرام کے اختتام پر کیپٹن شمشیر خان کی اہلیہ شیریں خان نے سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اپریل 2026

شخصیات

رامپور: گوکل داس ہندو گرلز کالج مرادآباد میں پرنسپل چارو مہروترہ کی زیر نگرانی شعبۂ اردو کی لیکچرر ڈاکٹر

زیبا ناز کی کتاب جدید تصنیف 'شخصیات' کی رسم اجرا پروفیسر جہاں گیر احمد گورنمنٹ رضا ڈگری کالج رامپور اور یونیورسٹی کی پرتندھی اربی ڈی کالج بجنور کی پروفیسر

پارل تیاگی کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ اس موقعے پر گوکل داس گرلز پی جی کالج کی وائس پرنسپل پروفیسر کرن ساہو، پروفیسر میناکشی شرما، پروفیسر وندنا پانڈے، پروفیسر سدلیش، پروفیسر پروین سینی، پروفیسر اپرنا جوشی، پروفیسر انورادھا سنگھ وغیرہ پروفیسرس نے شرکت کی اور ڈاکٹر زیبا ناز کو ان کی تیسری تخلیق پر مبارکباد پیش کی۔ زیبا ناز کی پہلی کتاب 'فرہنگ کلیات ذوق'، 'غضنفر کی جہتیں' اور 'شخصیات' منظر عام پر آچکی ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 اپریل 2026

کلیاتِ بلالی

لکھنؤ: مولانا بلالی کی تمام کتابوں کا مجموعہ 'کلیاتِ بلالی' کی رسم اجرا بعد نماز عصر، مہمان خانہ ندوۃ العلما میں عمل

میں آئی۔ اجرا کی یہ تقریب ناظم ندوۃ العلما مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ مولانا بلالی کی شاعری میں روایات کی صحت کا بڑا پاس ولحاظ ہے اور کہیں بھی انھوں نے روایات کی صحت سے تجاوز نہیں کیا ہے نیز انھوں نے کہا کہ ان کے اشعار کی سلاست اور روانی ایک خاص تاثیر پیدا کردیتی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 اپریل 2026

وفیات

ڈاکٹر فیروز دہلوی

نئی دھلی: پرانی دہلی کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایت کے امین ذاکر حسین دہلی کالج کے سابق استاد ڈاکٹر محمد فیروز

دہلوی کا 15 مئی 2026 کو انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اپنی رہائش گاہ کوچہ دکھنی رائے دریا گنج میں آخری سانس لی۔ وہ گذشتہ کئی دنوں سے علیل اور صاحب فراش تھے۔ ان کی نماز جنازہ مولانا شعبان بستوی نے پڑھائی، تدفین دہلی گیٹ قبرستان میں ہوئی۔ ڈاکٹر فیروز دہلوی کی پیدائش 5 نومبر 1942 کو دہلی میں ہوئی تھی۔ ہائر سکنڈری پاس کرنے کے 13 سال بعد دہلی کالج (ایوننگ کلاسیز) میں بی اے اردو آنرز میں داخلہ لیا۔ تعلیم کے دوران کسی استاد نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایوننگ کلاسیز سے ایم اے کرنے کے بعد موصوف کا 1983 میں ذاکر حسین کالج (ایوننگ) میں عارضی طور سے تقرر ہوگیا۔ اس کے بعد اس کالج (مارننگ) میں ان کی ملازمت مستقل ہوگئی۔ یہاں انھوں نے دو دہائیوں تک اردو کے لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر فیروز دہلوی 4 نومبر 2007 کو 65 سال کی عمر میں ذاکر حسین کالج ہی سے بحیثیت سینئر ریڈر سبکدوش ہوئے۔ وہ نہ صرف ایک مخلص اور باوقار استاذ تھے بلکہ تہذیب دہلی کے سچے نمائندہ اور شائستگی و وضع داری کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ مرحوم کی علمی وادبی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے درس وتدریس کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ انجمن تعمیر اردو کی ادبی وفکری پالیسیوں کی تشکیل میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ دہلی کی تاریخ اور زبان وتہذیب پر اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔

مضمون نگاری کا ذوق آٹھویں کلاس ہی سے رہا ہے اور اسی زمانے سے ان کے مضامین رسائل میں چھپنے لگے تھے۔ لیکچرر ہونے سے قبل موصوف نے اردو کے مختلف جرائد میں کلرک، سب ایڈیٹر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ تصنیف وتالیف میں مصروف رہے، نیز ٹی وی اور آل انڈیا ریڈیو دہلی سے دہلی کی تاریخ، تہذیبی زندگی اور اہم شخصیات پر مضامین قلمبند کرتے رہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں میر مہدی مجروح حیات اور تصانیف، اختر الایمان: مقام اور کلام، سجاد ظہیر کے ناولٹ لندن کی ایک رات کا تجزیاتی مطالعہ، مجروح سلطانپوری: مقام اور کلام، سردار جعفری کی نادر تحریریں وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے کچھ کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ انھیں ادبی خدمات کے لیے متعدد ایوارڈز حاصل ہوئے جن میں اردو اکادمی دہلی کا پنڈت دتاتریہ کیفی ایوارڈ قابل ذکر ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مئی 2026، روزنامہ 'صحافت' دہلی 18 مئی 2026 ودیگر ذرائع

ابھے موکاشی

ممبئی: سینئر صحافی ابھے موکاشی کا 69 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ آخری اسٹیج کے پیٹ کے کینسر اور جگر کی

ایک سنگین بیماری میں مبتلا تھے جس سے ایک ماہ تک لڑتے رہے۔ بالآخر ان کی موت ہوگئی۔ بوریولی کے شمشان بھومی میں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ اس موقعے پر ان کے خاندان کے افراد، دوست، ساتھی اور طلبہ موجود تھے۔ ابھے موکاشی نے اپنے کیریئر کا ایک اہم حصہ روزنامہ 'مڈ ڈے' میں گزارا جہاں وہ سٹی ایڈیٹر رہے اور بعد میں انھوں نے پولیٹیکل ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ مڈ ڈے سے قبل انھوں نے انگریزی روزنامہ 'انڈین ایکسپریس' میں کئی تحقیقاتی رپورٹیں کی تھیں۔ ان کے انتقال پر معزز شخصیات نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ ابھے موکاشی نے کئی اداروں میں صحافت کی تعلیم بھی دی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب'، ممبئی

ڈاکٹر محمد موصوف احمد

سہرسہ: ضلع کے بنما اِٹہری بلاک حلقہ کے گھوڑ دوڑ گاؤں کے ڈاکٹر محمد موصوف احمد اشرفی صدر شعبہ اردو بنود بہاری مہتو کوئلانچل یونیورسٹی، دھنباد، جھارکھنڈ کا

انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر موصوف احمد اشرفی کے والد سابق صدر المدرسین مدرسہ اسلامیہ گھوڑ دوڑ مولانا منصور الحق اشرفی مصباحی (مرحوم) تھے۔ ڈاکٹر موصوف اشرفی نے مدرسہ اسلامیہ گھوڑ دوڑ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر اسلامیہ ہائی اسکول سمری بختیار پور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے اور

وہیں سے گریجویشن سے لے کر ڈاکریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ تقریباً دو دہائیوں تک ریاست جھارکھنڈ کے دھنباد کے مختلف کالجوں میں تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیں۔ گزشتہ چند سال سے نبود بہاری مہتو کوئلانچل یونیورسٹی دھنباد جھارکھنڈ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اور دو بار صدر شعبہ اردو بھی رہے۔ ان کی تین کتابیں اور مختلف موضوعات پر درجنوں مقالے ہیں۔ انھوں نے قومی و بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، سہسرسہ، 21 اپریل 2026

زبیر احمد انصاری

امبیڈکر نگر: ضلع کے ہنسور قصبہ سے روزنامہ 'انقلاب' کی نمائندگی کرنے والے سینئر صحافی زبیر احمد انصاری کا 14 اپریل کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 78 برس تھی۔ تدفین 12 اپریل شام کو بھولے پور عیدگاہ کے سامنے واقع قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ مرحوم صحافی زبیر احمد انصاری اپنی سادہ اور ملنسار طبیعت کے لیے جانے جاتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 15 اپریل 2026

خراجِ عقیدت

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر

نئی دھلی: مختلف سیاسی جماعتوں کے سرکردہ لیڈروں نے منگل کو ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کی جینتی پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر ملک کی تعمیر میں ان کی عظیم شراکت اور منصفانہ و ہمہ گیر نظریات کی اہمیت کو یاد کیا گیا۔ نائب صدر جمہوریہ سی پی رادھا کرشنن، وزیر اعظم نریندر مودی اور لوک سبھا کے اسپیکر اوم برلا نے پارلیمنٹ ہاؤس کمپلیکس کے پریرنا استھل پر ڈاکٹر امبیڈکر کے مجسمے پر گلہائے عقیدت پیش کیے۔ اس تقریب میں کئی مرکزی وزرا، راجیہ سبھا میں اپوزیشن لیڈر ملکارجن کھڑگے، راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین ہری ونش نارائن سنگھ، ارکان پارلیمنٹ، سابق ارکان پارلیمنٹ اور دیگر معززین شریک ہوئے۔ اوم برلا نے ڈاکٹر امبیڈکر کی زندگی کو جدوجہد کی ایک دلیرانہ داستان قرار دیا۔ انھوں نے زور دیا کہ قوم کی تعمیر میں ان کے

خیالات اور خدمات ہم سب کے لیے باعث تحریک ہیں۔ دستور ساز اسمبلی کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیئرمین کے طور پر ڈاکٹر امبیڈکر کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے اوم برلا نے کہا کہ آئین میں شامل ترقی پسند دفعات، خاص طور پر مساوات کے حق اور ہمہ گیر بالغ رائے دہی نے ایک مضبوط جمہوریت کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ اصول نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کی جمہوریتوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اپنے پیغام میں برلا نے کہا کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے ناقابل تسخیر ہمت، مسلسل محنت اور تعلیم کے تئیں لگن کے ذریعے کروڑوں محروم اور مظلوم لوگوں کے لیے امید کی ایک نئی کرن روشن کی۔ انھوں نے آئین میں مساوات، آزادی، انصاف اور بھائی چارے کی اقدار کو شامل کر کے قوم کو ایک بصیرت افروز سمت فراہم کی۔ انھوں نے نوجوانوں سے ڈاکٹر امبیڈکر کی وراثت کو آگے بڑھانے کی اپیل کرتے ہوئے انھیں ان کے نظریات کا سچا سفیر قرار دیا۔ لیڈروں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ ان کا فلسفہ ناانصافی اور امتیازی سلوک کے خلاف کھڑے ہونے کی ترغیب دیتا ہے اور سکھاتا ہے کہ تعلیم اور اجتماعی کوششوں سے مثبت سماجی تبدیلی ممکن ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اپریل 2026

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر ..... بتاریخ ..... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .....

.....

پتہ : .....

.....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ مطبوعات

اردو تدریسی قواعد

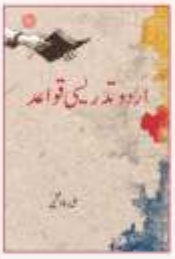

مصنف: علی رفاد فتیحی

دوسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 192

قیمت: 120 روپے

امراض اطفال

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: XIII+566

قیمت: 350 روپے

ادویہ مفردہ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: XX+443

قیمت: 285 روپے

معاشیات (Economics) فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو)

تیسرا ایڈیشن: 2026

صفحات: 371

قیمت: 205 روپے

حیاتِ جاوید

تالیف: الطاف حسین حالی

صفحات: XXXI+844

قیمت: 455 روپے

عصری لغت برائے فنون لطیفہ

روپ نرائن باتھم

مترجم: محمد سجاد عثمانی

پہلی اشاعت: 2026، صفحات: 606

قیمت: 685 روپے

کلیاتِ ادویہ

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: VIII+217

قیمت: 160 روپے

آؤ جانوروں سے ملیں

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2026

صفحات: XV+131

قیمت: 190 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जून–2026,वर्ष:28, अंक:06
URDU DUNIYA Monthly, June-2026, Vol.28, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/05/2026**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025